الاصلاح

دائرۂ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبۂ

امین احسن اصلاحی

باہتمام عبدالاحد اصلاحی

دفتر دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

قیمت سالانہ للعہ (بیرون ہند کے لئے ۶ے) فی پرچہ ۶ر

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے، ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث تبلاتے ہیں پھر آیات سورۃ کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورۃ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورۃ کے فلسفہ و اسرار غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں، اہل علم انکی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات

اس کتاب میں، مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنفؒ نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدا کی قسموں کا عمود سورۃ (دینونۃ) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے اسی ضمن میں تمام امم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقع عبور اور طریقۂ عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "نطق" سے معاد اور "خلق زوجین" سے معاد و رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں، ان کی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں قیمت ۲ر

(باقی سرورق صفحہ ۲ پر)

۱۳۶۲۱

جلد ۱	ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۶ء	نمبر ۷

فہرست مضامین

فتنۂ تکفیر — امین احسن اصلاحی — ۱ - ۸

باب التفسیر

تفسیر سورۂ فیل — استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ — ۹ - ۱۹

معارف قرآن

نظم قرآن — امین احسن اصلاحی — ۲۰ - ۳۱

تیسیر قرآن — " — ۳۲ - ۳۸

مذاکرہ

سورہ فتح کی ایک آیت کی تاویل — جناب مولوی حافظ عبد الاحد صاحب اصلاحی — ۳۹ - ۴۳

موعظت حسنہ

ایمان بلا عمل — جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی - اے — ۴۴ - ۵۱

ادبیات

غزل — جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل وکیل اعظم گڈھ — ۵۲

تلخیصات

"کفر کے متعلق اللہ والوں کا طریقہ" — حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی — ۵۳ - ۶۲

فتنۂ تکفیر

امین احسن اصلاحی

بیا ورید گر اینجا بود سخن دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

الاصلاح کے ناظرین یہ سنکر ہنسیں گے کہ بعض مولویوں نے حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی (برد اللہ مضجعہا وجعل الجنۃ مثواہما) کی تکفیر کا فتویٰ شائع کیا ہے اور اسی لپیٹ میں مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ، طلبہ، کارکنوں اور ہمدردوں، سب کو کافر بنا ڈالا ہے۔ اس زمانہ میں کفر کے فتویٰ کی وبا پھوٹ پڑی ہے اس لئے یہ چیز چنداں لائق اعتنا نہ تھی، بالخصوص الاصلاح کے صفحات میں تو اس کے ذکر کا کوئی موقع ہی نہ تھا، لیکن چونکہ ہمارے مخالفوں کے اس سب سے زیادہ قیمتی تبرکا اصلی ہدف مدرسۃ الاصلاح کے بعد، غریب الاصلاح ہی ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس واقعہ کی یادگار میں چند حرف لکھدئے جائیں کہ الاصلاح کی تاریخ ہمارے مفتیوں کے اس عظیم الشان کارنامے سے بیخبر نہ رہے۔

اس سلسلہ میں، مولانا شبلیؒ، مولانا حمید الدینؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند)، متعلقین مدرسۃ الاصلاح، اڈیٹر الاصلاح کو جو گالیاں دی گئی ہیں، ہم ان سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ مولانا شبلیؒ و مولانا حمید الدینؒ دنیا سے دنی کی ان آلودگیوں کو چھوڑ کر کب کے، جوار رحمت الٰہی میں پہنچ چکے۔ اب اگر کوئی جماعت ان کو گالیاں دے کر خوش ہونا چاہتی ہے اور خیال کرتی ہے کہ وہ دین و مذہب کا کوئی بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے، تو ہم کو اس کی اس خوشی میں خلل انداز ہونیکا کوئی حق نہیں ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدظلہٗ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی خدمت کے لئے مدت دراز تک زندہ رکھے۔ ان کی

نسبت ہمکو پورا اطمینان ہے کہ اپنے ہم قوموں کی اس قسم کی نادانیوں کو معاف کر دینے کے لئے ان کا دل پوری طرح فیاض ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور کارکنوں اور اڈیٹر الاصلاح کو بھی اس کا کوئی خاص ملال نہیں ہے۔ اگر ان علماء نے، عالمگیریہ اور تتارخانیہ میں اس کے جواز کا کوئی جزئیہ ڈھونڈ نکالا ہے تو ان کی زبانوں کو کون پکڑ سکتا ہے!

علامہ شبلیؒ کی تکفیر الکلام، اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بناء پر گئی ہے اور علامہ فراہیؒ کی تکفیر اس مضمون کے دو فقروں کی بناء پر، جو الاصلاح بابت ماہ فروری میں بعنوان "خیالات اثنائے ترجمۂ قرآن" شائع ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ علامہ شبلیؒ اور علامہ حمید الدینؒ (العیاذ باللہ) کافر ہیں۔ لیکن مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور اس کے تمام متعلقین کیسے کافر ہو گئے؟ الکلام اور علم الکلام کی تصنیف واشاعت سے مدرسۃ الاصلاح والوں کو کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں اور الاصلاح پہلے ہی نمبر میں اعلان کر چکا ہے کہ مدرسۃ سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مدرسہ والے مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدینؒ کے مقلد ہیں کیونکہ وہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ کے استفسارات کے جواب میں لکھ چکے ہیں کہ ہم صرف کتاب وسنت کے پیرو ہیں، زید وعمر کی رایوں کے پابند نہیں ہیں۔

اس سوال کا جو جواب فتویٰ میں دیا گیا ہے، اس کو پڑھکر ہمکو بھیڑیے اور میمنے کی وہ حکایت یاد آگئی، جو بچپن میں مکتب کی کتابوں میں پڑھی تھی۔ اس وقت بچپنے کے تقاضا سے بھیڑیے کی عجیب وغریب منطق سنکر ہنسی آئی تھی، کسے خبر تھی کہ اسی بے پناہ منطق کی شمشیر براں ایک دن اپنی گردن پر بھی چلنے والی ہے ورنہ یقیناً غریب میمنے پر ترس آتا۔

مدرسۃ الاصلاح کے علماء واساتذہ اس لئے کافر ہیں کہ وہ مولانا شبلیؒ اور علامہ فراہیؒ کو بزرگ ومحترم سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ان دونوں "کافروں" سے اپنی نفرت وبیزاری کا اعلان کر دیں تو یہ مفتیان دین، ان لوگوں کو پھر اسلام وایمان کے حلقہ میں لے لیں گے۔ اگرچہ اس بات سے خوشی ہوئی کہ ان بزرگوں نے ہماری نجات کے لئے ایک دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے، لیکن شاید انہیں ہمارے قلب کی وسعتوں کی خبر نہیں۔ مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدینؒ

تو نیز دوسری چیز تھے، ان کو سمجھنے کیلئے ہمارے مفتیوں کو تعلیم و تربیت کی ایک نئی زندگی چاہیئے۔

ایک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق

ہمارے دل میں تو ان مفتیوں کے خلاف بھی نفرت و حقارت کا کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوا، جنھوں نے یہ فتویٰ لکھکر، علم و اخلاق دونوں کو رسوا کیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان میں سے بعضوں نے غلط فہمی کی وجہ سے یہ حرکت کی ہے اور بعضوں نے خواہشات نفس سے بے بس ہو کر۔ اور یہ دونوں حالتیں معذوری کی ہیں۔ اور اپنا حال یہ ہے کہ

دم بدم خمیازۂ عشقم تقاضا می کند

کہ دو گیتی را چو معشوقے کشم اندر کنار (فراہی رح)

یہ فتویٰ پورے ۲۳ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا آغاز علامہ شبلی نعمانی رح کے وجوہ تکفیر سے ہوتا ہے۔ مختلف عنوانات کے ماتحت الکلام اور علم الکلام کے بعض اقتباسات دیے گئے ہیں۔ علامہ شبلی رح کے ادب سے انتہائی شیفتگی اور ان کے علم و تبحر سے انتہائی عقیدت کے باوجود اب تک میں نے ان کی یہ دونوں کتابیں نہیں پڑھیں۔ اسی وجہ سے خیال تھا کہ ممکن ہے مولانا نے کوئی ایسی بات لکھدی ہو، جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی ہو، لیکن فتویٰ کی اشاعت کے بعد، جب ایک عزیز دوست نے فتویٰ کی عبارات کا اصل کتاب سے مقابلہ کیا اور حقیقت حال آشکارا کی تو جو صدمہ دل کو پہنچا وہ ضبط تحریر میں نہیں آسکتا۔ ایک اقتباس بھی صحیح نہیں۔ تمام تر جعلسازی! سراسر فریب کاری! یکسر بد دیانتی! مولانا منکرین خدا کے دلائل نقل کر رہے ہیں وہ ان کے عقائد کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔ مولانا دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، وہ ان کے ذاتی خیالات قرار دیے گئے ہیں۔ بعض جگہ علی سبیل التنزل الطریق فرض، حریف کا کوئی دعویٰ تسلیم کر کے اس کی تردید کر رہے ہیں، اس کو انکا مسلک بتا کر پیش کیا گیا ہے۔ غرض تمام عبارتیں سیاق و سباق سے چھین کر، پوری بیدردی سے مسخ کر کے، مفتیوں کے سامنے رکھدی گئی ہیں کہ وہ کسی طرح اس شخص کو کافر بنا دیں جو الکلام اور علم الکلام ہی کا مصنف

نہیں ہے، الفاروق اور سیرۃ النبی کا بھی مصنف ہے اور ان بے درد مفتیوں نے پوری بے باکی سے، علم و تحقیق کی گردن پر ہمیشہ کے لئے چھری چلا دی ہے۔

لمثل ہٰذا یذوب القلب من کمد

عزیز موصوف نے ایک مفصل مضمون میں اس "دیانت" کا راز آشکارا کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس اشاعت میں کسی طرح اس کے لئے گنجایش نکالنا ممکن نہ ہوا۔ ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ قارئین الاصلاح کے سامنے آئے گا۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی فرد قرار داد جرم کیلئے مصالحہ، مولاناؒ کی اس ناتمام یادداشت سے فراہم کیا گیا ہے، جو فروری کے الاصلاح میں "خیالات اثنائے ترجمۂ قرآن" کے عنوان سے، شائع کی گئی ہے۔ اس پر اڈیٹر نے بغرض انتباہ، ایک نوٹ لکھدیا تھا کہ "یہ ناتمام حالت میں ہے، اسلئے کہیں کہیں، عبارت چھوٹی ہوئی ہے، بعض جگہ سخت ابہام ہے، ناظرین غور سے ملاحظہ فرمائیں"۔ اس انتباہ کا تقاضا تھا کہ لوگ اس کے بیش قیمت مطالب سے استفادہ کرتے، جو بات سمجھ میں نہ آتی، اس کو چھوڑ جاتے کہ یہ تحریر ناتمام ہے۔ اگر الفاظ و عبارت میں کوئی سقم نظر آتا، اس سے درگذر کرتے کہ یہ مصنف کی نظر ثانی اور حک و اصلاح کی محتاج ہے۔ اور بفرض اگر کوئی ایسی ہی بات مل جاتی، جو کفر و زندقہ ہی ہوتی، اور اس کی کوئی کمزور سے کمزور تاویل بھی ممکن نہ ہوتی، جس کی جستجو باتفاق جمیع علمائے اسلام تکفیر سے پہلے ضروری ہے تو سب سے پہلے اس کے شائع کرنیوالے سے اسکی تاویل و تشریح یا اعتراف جرم و تقصیر کا مطالبہ کرتے۔ پھر تکفیر سے پہلے، قلم تحریر ہاتھ میں لیتے، الاصلاح میں نہ سہی، کسی دوسرے ہی رسالہ میں اس کی مدلل تردید چھاپ دیتے!

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!

یہ کیا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئی، اس کو لے اڑے کہ کسی طرح اس پر تکفیر کا فتویٰ حاصل کر کے، خدمت علم و دین کی تمام سعادتیں جلد سے جلد سمیٹ لیں۔

ایک قابل لحاظ چیز قائل کی شخصیت بھی ہے۔ ممکن ہے موجودہ آئین افتاء و استفتاء میں اس چیز کا

لحاظ نہ ہو لیکن انصاف اور سچائی کا عام قانون اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس مضمون کے لکھنے والے مولانا حمید الدینؒ ہیں ۔ مولانا حمید الدینؒ کو عوام نہ جانتے ہوں لیکن اہل علم ان سے بیخبر نہیں ہیں۔ ان کے علم و تبحر کی جامعیتوں کو ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے ہیں کہ اس کے ذکر کا یہ محل نہیں، لیکن کیا آج پورے ہندوستان میں ایک صاحب علم بھی ایسا ہے، جو اس حقیقت سے بیخبر ہو کہ وہ، اس دور آخر میں، علوم قرآن کے امام تھے ۔ ان کی زندگی کے آخری چالیس برسوں کی تمام جستجوؤں اور کاوشوں کا محور صرف قرآن رہا۔ اس آسمان کے نیچے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کی چاہ ان کو قرآن کے فہم و تدبر سے زیادہ عزیز و محبوب رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فیض خاص سے، اپنی کتاب عزیز کے حکم و معارف میں سے، ان کو جو کچھ بخشا، اس کا کچھ حصہ ہزاروں صفحات کی شکل میں اپنی یادگار چھوڑا ہے انہیں سے سیکڑوں صفحات شائع ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں اور وہ بتا سکتے ہیں کہ فہم قرآن میں اس "ہندی نژاد" کا مقام کیا تھا؟ یہ تو علم ہوا۔ رہا عمل تو اس کے رازداں صرف وہی ہو سکتے ہیں جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہو۔ اور الحمدللہ ان کو قریب سے دیکھنے والے کم نہیں ہیں، بہت ہیں۔ ان میں صرف ہم جیسے تماشائی اور بیخبر ہی نہیں ہیں، کتنے اہل دل اور اہل نظر بھی ہیں ان کا کیا حال ہوگا، جب سنیں گے کہ یہ شخص کافر ٹھیرایا گیا اور اس جرم میں کہ اس نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا انکار کیا! یا للعجب!!

تکاد الجبال الصم منہ تصدع

لیکن ان باتوں سے اب کیا حاصل؟ لوگوں کی کمانوں سے تیر نکل چکے اور ہمارا سینہ چھلنی ہو چکا۔ اب گلے اور شکوے کا کہاں موقع باقی رہا! آؤ نفس مضمون کے معاملہ پر غور کرو۔

یہ مضمون مولانا کی نجی یادداشت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشاعت کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لئے نہ تو مکمل تھا نہ اس میں ادب و انشاء اور ترتیب و تہذیب کا وہ اہتمام و التزام تھا جو پبلک تحریروں کے لئے

عموماً ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی ایک ایک سطر، پورا مضمون پڑھ جاؤ، قرآن کی عظمت وجلالت سے لبریز ہے۔ قرآن مجید کے ترجمہ کے وقت اس کی اس عظمت کی وجہ سے، ان کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا، اور جن سے آئندہ مراحل میں وہ ہوشیار رہنا چاہتے تھے، پوری خوبی لیکن اختصار واجمال کے ساتھ اسمیں بیان ہو گئی تھیں۔ اور جہاں تک میری معلومات ہیں، اس سے بہتر مضمون، اس مقصد کے لئے، کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس لئے یہ تحریر یوں ہی تو نہ شائع کر دی گئی کہ اس زمانہ میں جو لوگ قرآن مجید کے ترجمے کر رہے ہیں ممکن ہے، اس سے فائدہ اٹھائیں۔

چنانچہ اہل علم نے اسکو قدر وعزت کی نظر سے دیکھا، بعض موقر علمی رسالوں نے خصوصیت کے ساتھ اس مضمون کی اہمیت کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ ہمارے مخدوم مولانا عبد الماجد صاحب بی۔ اے مدیر "صدق" نے (جو قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں) یہ پورا مضمون "صدق" میں شائع کیا۔ اور اس کی تقریب غالباً یوں پیدا ہوئی تھی کہ ایک شخص نے شیخ الہند؟ کے ترجمۂ قرآن پر اعتراض کئے تھے اور مولانا اس کے سامنے ترجمۂ قرآن کی مشکلات لانا چاہتے تھے۔

ان حالات کے اندر گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس شربت کے اندر زہر بھی ملا ہوا ہے۔ لیکن دفعتہً کانوں میں کفر کے فتوی کی بھنک پڑی اور معلوم ہوا کہ بنائے کفر اسی مضمون کے بعض فقرے ہیں۔ دوبارہ مضمون بار بار غور سے پڑھا۔ دو ہی قسم کی باتیں ملیں، یا تو مولانا کے مجتہدانہ اور حکیمانہ خیالات، جو بالکل واضح اور نہایت وقیع یا اکابر سلف کی رایوں اور خیالات کی ترجمانی، جو بالکل ثابت اور صحیح، کفر تو در کنار کسی ادنی لغزش کا بھی احتمال نہ ہوا۔ خیال ہوا، ممکن ہے اپنی نظر کی کوتاہی ہو، اس لئے بعض اکابر کو لکھا کہ وہ اس مضمون کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ وہ بھی کوئی کفر نہ پا سکے۔ اسی اثناء میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) مدرسہ پر تشریف لائے۔ ان کو الاصلاح کے کفر کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اس لئے دیوبند ہی سے پرچے طلب فرمائے تھے مدرسہ پر انھوں نے فرمایا کہ میں نے دیوبند میں بعض لوگوں سے کہا کہ الاصلاح کی قابل اعتراض عبارتوں پر

نشان لگادیں، انھوں نے نشان لگادیے میں نے تغور پڑھا۔ مجھے کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کا کوئی صحیح محمل نہ ہوسکتا ہو۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا وہ قول فیصل میں موجود ہے۔ ہم کو مولانا کے علم اور عمل دونوں پر اعتماد ہے، اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی رائے کے بعد اضطراب باقی رہتا۔ لیکن طالب العلمانہ کاوش اور اکابر سے مراسلت جاری رہی۔ بالآخر مولانا عبدالماجد صاحب کے ایما سے، جون کے پرچہ میں، دو مضمون دو عنوانوں سے لکھدیے گئے، "قرآن مجید اور سجع" اور "اسمائے سور"۔ ان میں ان دونوں مشتبہ فقروں کی شرح کردی گئی جنکی نسبت بعض ذرائع سے پتہ چلا تھا کہ کفریہ ہیں۔

یہ مضمون محض تعمیل ارشاد میں لکھے گئے۔ طبیعت کو ان میں کوئی خاص حظ نہیں ملا مصنف کے یہ دونوں فقرے ایسے سیاق و سباق اور قرائن سے گھرے ہوئے تھے کہ کسی شخص کو ان کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوسکتی تھی الا آنکہ کوئی شخص خود ٹھوکر کھاکر گرنا چاہے۔ پھر ان دونوں فقروں میں جو بات بتائی گئی تھی وہ مصنف کے اجتہاد سے تعلق نہ رکھتی تھی، فن تفسیر اور فن بلاغت کی ایک عام حکایت تھی، جو کم و بیش اکثر مستند اول کتب فن میں دہرائی گئی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ اولاً تو اس میں کسی شخص کو شبہہ نہ ہوگا اور بفرض کسی کو کچھ اضطراب ہوا تو سیوطیؒ کی اتقان ہر جگہ ملتی ہے، اس میں فواصل اور اسمائے سور کی بحث موجود ہے اور مسئلہ کو سمجھ لینے کیلئے بالکل کافی ہے۔ ایک واضح بات پر صرف وقت کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن جب فتویٰ نکلا، دیکھکر طبیعت دنگ رہ گئی۔ ہماری امید کے بالکل خلاف انہی دونوں فقروں کی بنیاد پر استاذ امامؒ کی تکفیر کی دیواریں چنی گئی ہیں۔ صرف استاذ امام کی تکفیر کی نہیں بلکہ علم و فن کی قبر کی دیواریں چنی گئی ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جی چاہتا ہے کچھ پوچھیں، لیکن کس سے پوچھیں؟ مستفتی چند دیہاتی گنوار ہیں، جو مولانا شبلی نعمانیؒ اور علامہ فراہیؒ کی تحریریں پڑھانے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکتے اور مفتیوں سے کچھ پوچھیں تو وہ یہ کہکر پیچھا چھڑالیں گے کہ ہم صرف تکفیر کے سلطان ہیں، بحث و تحقیق کے ٹھیکہ دار نہیں۔ لیکن خدارا الاصلاح بابت جون کے دونوں مضامین

ملاحظہ فرمانے کے بعد وہ اتنا تو ضرور بتا دیں کہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کے بعد، ابن عباسؓ، امام بخاریؒ، ابن حجرؒ، زرکشیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کے بارہ میں ان کا کیا فتویٰ ہے؟

اس کے بعد ہم ایک اور سوال کرنے والے ہیں۔ یہ شیخ الہندؒ کے جانشین اور دار العلوم دیوبند کے شیخ کو محض اس جرم میں گالیاں دی گئیں (بلکہ تکفیر کی گئی) کہ "اس کو الاصلاح میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی، جس کا صحیح محمل نہ ہو سکتا ہو" لیکن اس جرم کے گنہگاروں کی اب ایک پوری صف نمودار ہو رہی ہے، جس میں مولانا حسین احمد مدظلہ کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے تمام اکابر علم و تحقیق نظر آئیں گے اور سب وہی کہیں گے جو مولانا حسین احمد مدظلہ نے فرمایا ہے۔ پھر اس وقت آپ کا طرز عمل کیا ہوگا:

ہمارے چند عقائد لوگوں نے "قول فصیل" میں پڑھ لئے ہونگے آج چند عقائد اور سن لیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ عفو انتقام سے بہتر ہے اور گالی دینا کسی حال میں جائز نہیں۔ جھوٹ بدترین معصیت ہے اور اتہام اس سے بڑھکر۔ سچائی ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دینگے تو خدا کے فرشتے اس کا علم بلند کریں گے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ کسی کام کو انسانوں کے اعتماد پر نہیں کرنا چاہئے، خدا کے اعتماد پر کرنا چاہئے من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ پھر ہمارا ایک اور عقیدہ ہے جس پر ہم پورا جزم و یقین رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ جو فتوے نیک نیتی سے، خدمت کلمۂ حق کے لئے نہیں لکھے جاتے، وہ بالکل بے حقیقت ہیں، اتنے بے حقیقت کہ دنیا میں ان سے زیادہ بے حقیقت کوئی شے نہیں۔ ہمارے دوست اور دشمن، دونوں ان باتوں کو سن رکھیں اور ہم سے ان کے خلاف توقع نہ رکھیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان عقائد پر راسخ رہنے کی توفیق دے۔

واللہ ولی التوفیق وعلیہ التکلان ونعم المولیٰ ونعم النصیر

باب التفسیر

تفسیر سورۂ فیل

۷

مصنفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مترجمہ

امین احسن اصلاحی

منیٰ میں رمی جمرہ کی حقیقت

۱۴۔ بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمی جمرہ واقعۂ فیل کی یادگار ہے۔ لیکن ضعیف روایات نے اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں "روایت ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیمؑ سے نکل کر بھاگا۔ انھوں نے اس کو سات کنکریاں ماریں اور پھر پکڑ لیا۔ اس کے بعد سے یہ رمی کی سنت قائم ہوگئی"۔

دوسری روایت ہے کہ جس وقت انھوں نے بیٹے کی قربانی کا قصد کیا شیطان نے بہکانا چاہا، انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں اور یہ سنت اس واقعہ کی یادگار ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ مینڈھا نکل بھاگا تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے اس کو جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ کبریٰ کے پاس سات سات کنکریاں ماریں۔

پھر دوسری روایت حضرت علیؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھے کو ثبیر میں ایک ببول کے درخت سے بندھا ہوا پایا۔ اس روایت کی تائید تورات سے بھی ہوتی ہے۔ توراۃ میں ہے:-

"ابراہیم نے آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ مینڈھا سامنے جھاڑی میں دونوں سینگوں سے بندھا ہوا ہے پس وہ گیا اور اسکو پکڑا۔"

بہرحال مینڈھے کے بھاگنے کی روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ نے جمرہ کے پاس ابلیس کو سنگسار کیا تھا۔ لیکن صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کے متعلق کوئی بات صحیح روایات سے ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی تھی۔ لیکن جہاں تک معلوم ہے اس کے متعلق کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سن پائے اس کو بیان کرنے لگے۔ اس لئے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی صحیح و ثابت سے استنباط، اس صریح سے زیادہ بہتر ہے جو ثابت نہ ہو۔ خدا نے جا بجا تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔

اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ — اس میں غور کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اب ہم اپنے وجوہ استنباط کی تفصیل کرتے ہیں۔

۱۔ حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آرہے ہیں۔ عربوں نے تمام مناسک انہی سے سیکھے۔ چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً و تفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ احرام، استلام، طواف، طواف صفا و مروہ، ہدی و نحر، زیارت عرفہ، وقوف منیٰ، ہر چیز کا تذکرہ ہے۔ تفسیر آل عمران میں ہم تمام شواہد نقل کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ کلام جاہلیت میں رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعۂ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے احسان کی یادگار اور اس کی قدرت قاہرہ کی ایک عظیم الشان نشانی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل ہو کر اس نے تکبیر و تہلیل کی ایک مخصوص سنت کی حیثیت حاصل کر لی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے[۵]۔

---

[۵] اخرج الحاکم فی صحیحہ عن عائشۃ انہا قالت افاض رسول اللہ صلعم من آخر یومہ حین صلی الظہر ثم رجع فمکث بمنی لیالی ایام التشریق یرمی الجمرۃ اذا زالت الشمس کل جمرۃ بسبع حصیات یکبر مع کل حصات ویقف عند الاولی وعند الثانیۃ فیطیل القیام ویتضرع ثم یرمی الثالثۃ ولا یقف عندہا۔

آنحضرت صلعم ایام تشریق میں منیٰ میں ٹھہرے، زوال کے بعد آپ رمی جمرہ کرتے۔ ہر جمرہ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر فرماتے۔ جمرہ اولی اور جمرہ ثانیہ کے پاس وقوف کرکے دیر تک دعا و تضرع فرماتے جمرہ ثالثہ کے پاس وقوف نہ فرماتے۔

۲۔ یہ ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری وہیں ہوئی تھی جہاں رمی کی سنت ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رمی محصب کے ایک حصہ میں ہوتی ہے اور محصب منیٰ میں شامل ہے۔ لسان العرب میں اصمعی کا قول ہے کہ محصب وہ جگہ ہے جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ثبوت میں یہ شعر پیش کئے ہیں۔

اقام ثلاثا بالمحصب من منیٰ　　ولما یبن للناعجات طریق

اس نے محصب میں، جو منیٰ میں ہے، تین دن قیام کیا اور اونٹنیوں کی راہیں ابھی رکی ہوئی تھیں۔

راعی کا شعر ہے:-

الم تعلمی یا الأم الناس اننی　　بمکة معروف وعند المحصب

ارذل خلائق! تجھے خبر نہیں کہ میں مکہ اور محصب ہر جگہ معروف ہوں۔

اس نے رمی جمرہ کے مقام کو مراد لیا ہے۔ اس کی مزید تائید عمر بن ربیعہ کے شعر سے ہوتی ہے۔

نظرت الیها بالمحصب من منی　　ولی نظر لولا التحرج عارم

میں نے اسکی طرف محصب میں، جو منی میں ہے، دیکھا۔ اور اگر مجھے اندیشۂ معصیت نہ ہوتا تو میری نگاہ واپس نہ آتی۔

اس مقام کو محصب اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں کنکریاں بہت زیادہ ہیں۔ لسان العرب میں ہے:-

"حصب الموضع کے معنی یہ ہوئے کہ وہاں چھوٹی چھوٹی کنکریاں لاکر بچھادیں"۔ حدیث میں ہے "ان عمرؓ امر بتحصیب المسجد" حضرت عمرؓ نے مسجد میں کنکریاں بچھانے کا حکم دیا۔

الغرض یہ بالتحقیق ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری محصب کے پاس ہوئی نفیل جو شریک واقعہ تھا کہتا ہے۔

ردینة لو رایت ولن تریه　　لدی جنب المحصب ما رأینا

ردینہ کاش تو دیکھ لیتی (اور اب تو ہرگز نہیں دیکھ سکتی) جو محصب کے پہلو میں ہم نے دیکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب فیل کی بربادی کی جگہ رمی کی جگہ سے بالکل قریب تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ واقعہ وادی محسر میں پیش آیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے وادی محسر کی وجہ تسمیہ بھی یہی بیان کی ہے کہ اس مقام پر ان کا ہاتھی تھک کے عاجز آگیا تھا اس لئے اس کا نام محسر ہوا عربی میں "حسرت الدابۃ

جانور تھک گیا "حسر الدابۃ" جانور کو تھکا دیا، استعمال ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ محسّر مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ صحاح میں روایت ہے کہ آنحضرت صلعم مزدلفہ سے نہایت وقار و سکون کے ساتھ چلے۔ اور سب لوگوں کو حکم دیا کہ نہایت سکون کے ساتھ چلیں لیکن جب وادی محسر میں پہونچے، آپ نے رفتار تیز کر دی (دیکھو ترمذی و صحیح مسلم) علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ محسر اصحاب فیل کے عذاب کی جگہ تھی اس لئے آنحضرت صلعم نے وہاں سے جلد نکل جانا چاہا۔ اس کی تائید امام شافعیؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو کتاب الام وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ بطن محسر میں سواری کو تیز کر دیتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے:۔

الیک تعدو قلقا وضینہا مخالفا دین النصاریٰ دینہا

وہ تیری طرف دوڑ رہی ہے اس حالت میں کہ اس کا تنگ ڈھیلا ہو چکا ہے۔ اسکا دین نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے۔

حضرت عمرؓ کا منشاء یہ ہے کہ اے پروردگار جس طرح ایک بندہ اپنے آقا کی طرف مستعدی و سرگرمی سے بڑھتا ہے اسی طرح میں بھی مستعدی اور سرگرمی سے تیرے حضور میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تقاضائے ادب یہ تھا کہ نہایت وقار و سکون کے ساتھ قدم اٹھاتا جیسا کہ تو نے تعلیم فرمایا ہے: فاسعوا الی ذکر اللہ اللہ کے ذکر کی طرف مستعدی سے بڑھو، لیکن میں نے ناقہ کو تیز چلا دیا ہے۔ کہ اس وادی سے جلد نکل جاؤں، جس میں تو نے ان نصاریٰ کو برباد کیا جو تیرا گھر ڈھانے کے قصد سے آئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ناقہ کو تیز چلانے کی دو وجہیں بیان کیں۔

۱۔ یہ عذاب کی جگہ ہے اور ایسی جگہ سے جلد نکل جانا قرین تقویٰ ہے۔

۲۔ اصحاب فیل کو یہاں مجبوراً رکنا پڑا تھا، اس لئے یہاں سے جلد نکل جانے میں گویا ان کی مخالفت ہے۔

ان تمام باتوں کی نسبت ناقہ کی طرف مجازاً ہے۔

وادی محسر میں جلدی کرنا سلف کا مذہب ہے۔ چنانچہ وہاں وقوف جائز نہیں ہے۔ موطا میں ہے "مزدلفہ

وادی محسر کے سوا تمام موقف ہے،، امام شافعیؒ فرماتے ہیں: "حجاج کو صرف منیٰ میں شب بسر کرنی چاہئے۔ اور منیٰ عقبہ کے پاس ہے اور عقبہ بطن محسر تک منیٰ میں نہیں ہے اور نہ بطن محسر منیٰ میں ہے،، صحیح مسلم میں ہے کہ محسر منیٰ میں ہے۔ بہرصورت اتنا ثابت ہے کہ بطن محسر منیٰ سے متصل ہے۔ چونکہ ابرہہ کی فوج محسر میں تھی اور وہ مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی اس لئے لازماً اس کا مقدمۃ الجیش محصب میں رہا ہوگا، جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات بہت اقرب معلوم ہوتی ہے کہ یہ سنت رمی عربوں کی اس سنگباری کی یادگار ہو جو انھوں نے ابرہہ کے مقدمۃ الجیش یا اس کے ہاتھیوں پر کی تھی۔ اور جس کے پردہ میں خدا نے آسمان سے بھی سنگباری کی۔

۳۔ یہ بالاتفاق طے شدہ ہے کہ قربانی کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اس لئے اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھی ہے یعنی شیطان کو سنگسار کرنا، تو قربانی رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہئے تھی، حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے، پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان، دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے جبکہ حضرت ابراہیمؑ اس سے پہلے ہی شیطان کو سنگسار کرکے بیٹے کی قربانی سے فارغ اور دشمن کے فریبوں سے مامون ہو چکے تھے؟ برعکس اس کے اگر اس کو واقعہ فیل کی یادگار مانا جائے تو تمام گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔

ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگباری ہوئی، اس سے ایک حد تک نقصان اٹھا کر وہ آگے بڑھنے سے رک گئی اور حجاج نے منیٰ میں واپس آکر شکرگزاری، قربانی، اور تکبیر و تہلیل کے فرائض ادا کئے۔ لیکن ابھی دم خم باقی تھا، دوسرے دن پھر مکہ پر حملہ کرنا چاہا، حجاج نے آگے بڑھکر پھر پتھراؤ کرکے روک دیا، یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا، یہانتک کہ حجاج کی سنگباری اور دست غیب کی کارفرمائیوں نے پوری فوج کو بری طرح پامال کر دیا۔

۴۔ چوتھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ رمی کے تین دنوں میں سے پہلے دن صرف اس ستون پر کنکریاں مارتے ہیں، جو عقبہ کے پاس اور تینوں ستونوں میں مکہ سے قریب تر ہے۔ اس روز بقیہ دونوں ستونوں کو ہاتھ

نہیں لگاتے۔ غور کرو تو واقعہ کی طبعی ترتیب کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصحاب فیل پہلے جوش میں مکہ کی طرف بڑھے ہوں گے اور مذکورہ حد تک پہونچ گئے ہوں گے۔ لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیئے ہوں گے، ان کا نشۂ جنگ کمزور اور عربوں کا جوش مدافعت مضاعف ہوگیا ہوگا اور دوسرے دن انھوں نے اور آگے بڑھ کر مورچہ قائم کر لیا ہوگا۔

۵۔ جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے وہ تینوں میں سے سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت کچھ گھٹا دی ہوگی۔ اس لئے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کے مقابل میں کم ہو کہ واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے۔ ان باتوں کو شیطان کے حالات سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ جو شیطان حضرت ابراہیمؑ کو بہکانے آیا تھا اس کی یادگار میں یہ ترتیبی تفاوت بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ پہلے اور دوسرے دن رمی کے بعد کعبہ کی طرف رخ کر کے دیر تک دعا کی جاتی ہے لیکن تیسرے دن کی رمی وقوف و دعا سے خالی ہوتی ہے۔ اگر یہ رمی شیطان پر ہوتی تو نہ تو دونوں میں اس درجہ اہتمام دعا کی کوئی وجہ تھی نہ تیسرے دن بکلیم ترک کی۔ حضرت ابراہیمؑ کا ارادۂ قربانی بالکل اٹل تھا۔ وہ اپنے دل میں کوئی شائبہ تذبذب نہیں پا رہے تھے۔ اگر شیطان کو سنگسار کرنے کا واقعہ صحیح بھی ہوتا تو یہ بات محض لعنت اور تحقیر کے لئے ہوتی۔ ورنہ ان کا عزم بالکل غیر متزلزل تھا۔ البتہ اگر یہ رمی ابرہہ کی دل بادل فوج پر مانی جائے تو اس طویل تضرع وزاری اور اہتمام دعا کی حکمت واضح ہو جاتی ہے کہ ابرہہ کی فوج، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ قریباً ساٹھ ہزار تھی۔ ایک ایسے لشکر گراں کے مقابل میں فتح ونصرت کی دعا مانگنا اور نہایت الحاح وزاری کے ساتھ خدا کے سامنے دیر تک گڑگڑانا بالکل قرین عقل ہے اور یہ بات دسویں فصل میں گذر چکی ہے کہ عبدالمطلبؓ نے ابرہہ کے مقابل میں فتح ونصرت کی دعا مانگی تھی۔ واقعات کا سلسلہ

اس حد تک سمجھ جانے کے بعد یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ تیسرے دن جب ابرہہ کی تمام جمعیت پارہ پارہ ہوکر تتر بتر ہوگئی، حجاج ان پر بددعا کرنے سے رک گئے۔

۷۔ لفظ جمرہ کی معنوی خصوصیات اور دلالتیں بھی ہمارے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ عربی زبان تعبیر حقیقت میں تمام زبانوں سے ممتاز ہے، کتابوں میں جمرات کی وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف توجیہات مذکور ہیں۔ موطا کی شرح زرقانی میں ہے:

"جمرات جمرہ کی جمع ہے۔ جمرہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کنکریوں کا انبار ہو۔ چونکہ یہ لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی اس لئے اس کو جمرہ کہنے لگے۔ عربی میں کہتے ہیں "تجمر بنو فلان" فلاں قبیلہ کے لوگ جمع ہوگئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اہل عرب چھوٹی کنکریوں کو جمار کہتے ہیں۔ اس لئے بطریق تسمیہ بالازم ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام یا حضرت ابراہیم کے پاس جب شیطان آیا تو انھوں نے اس کے کنکریاں ماریں اور وہ بھاگا۔ بھاگنے کے لئے عربی میں جمر کا لفظ ہے۔ اس لئے ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ شہاب قرافی کہتے ہیں۔ جمار جگہ کو نہیں بلکہ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ جمرہ کے معنی کنکری کے ہیں، چونکہ ان جگہوں پر کنکریاں زیادہ تھیں اسلئے بلحاظ مظروف جمرات کہنے لگے۔"

زرقانی نے جو توجیہ پہلے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مقدم رکھا ہے۔ لسان العرب میں یہ توجیہات بیان کی گئیں ہیں۔

"جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے قبائل میں منضم نہ ہو۔ بعضوں نے کہا ہے جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں۔ جو دوسرے قبائل کی جمعیت سے نبرد آزما رہے۔ جس میں تین سو کے لگ بھگ شہسوار ہوں۔ جمرہ کا اطلاق ہزار سواروں پر ہوتا ہے۔"

پھر لسان العرب ہی میں ہے:-

"جمرہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایک قبیلہ اپنے تمام حریف قبائل کے مقابل میں اقدام کے لئے مجتمع ہو۔

یہیں سے منیٰ کے ان مقامات کو جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں، جمرات کہنے لگے۔ گویا کنکریوں کا ہر انبار ایک جمرہ ہے۔ یہ جمرات تین ہیں۔ عمر بن بحر کا قول ہے کہ قبیلہ عبس، ضبۃ اور نمیر کو جمرات کہتے ہیں، دلیل میں ابو حیۃ نمیری کے یہ شعر پیش کئے ہیں۔

لنا جمرات لیس فی الارض مثلها　　　کرام وقد جربن کل التجارب

ہمارے پاس جمرات ہیں جن کا ثانی دنیا میں نہیں۔ شریف اور ہر قسم کے حالات آزمائے ہوئے۔

نمیر و عبس یتقی نفیانها　　　وضبة قوم باسهم غیر کاذب

نمیر اور عبس جن کے حملے خوفناک ہیں۔ اور ضبہ جن کا جوش بالکل سچا ہے۔

آگے بڑھکر، مزید تشریح، ان لفظوں میں کی ہے۔

حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے "لالحقن کل قوم بجمرتهم" اس میں انھوں نے جمرہ کا لفظ جماعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اجمروا علی الامیر و تجمروا، تجمعوا علیه وانضموا سب ایک ہی مفہوم کی تعبیر کیلئے استعمال ہوئے ہیں"

ان اقوال میں اگرچہ تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ جمرہ ایسی جمعیت کو کہتے ہیں جس کو اپنی قوت و شوکت پر اس درجہ اعتماد ہو کہ کسی دوسری جماعت سے وابستہ ہونیکی ضرورت نہ محسوس کرے۔ لفظ کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد، تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کا بہترین مصداق صرف ابرہہ کی فوج ہو سکتی ہے، جو تمام قبائل سے بے نیاز ہو کر، صرف اپنی طاقت کے بھروسہ پر عرب پر ٹوٹ پڑی تھی۔ چونکہ منیٰ کے ستون اسی کے یادگار تھے اسلئے انکو جمرات کہا گیا۔

۸۔ ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ ابو رغال، جس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، اسی موقع پر سنگسار کیا گیا تھا اور اس کے بعد اہل عرب اس کی قبر کو سنگسار کرتے رہے۔ معجم البلدان میں مغمس کے ذکر میں ہے:

"یہ مکہ کے قریب، طائف کے راستہ میں ایک جگہ ہے۔ ابو رغال یہیں مرا۔ چونکہ اس نے ابرہہ کو رستہ بتایا تھا اس لئے اس کی قبر سنگسار کیجاتی ہے"

اس کی قبر سنگسار کئے جانے کے اسباب اور بھی بیان کئے گئے ہیں، بہرصورت اگر یہ بیان صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ اصحاب فیل کے رجم کی ایک نظیر ہوگی اور نظائر پر قیاس کرنا زیادہ قرین عقل ہے۔ اسلام میں ابورغال کی قبر کو سنگسار کرنا بند کردیا گیا۔ کسی مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اسلام کی رفعت اور بلند نظری کے منافی ہے، نیز رمی جمرات واقعہ کی یادگار کے لئے کافی تھی، واللہ اعلم۔

اس تاویل سے اثرات و نتائج

۱۵ - رمی جمرہ کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اگر یہ صحیح ہے تو، خواہ یہ رمی چڑیوں کی جانب سے ہوئی ہو یا عربوں کے ہاتھوں، اگر یہ واقعہ اصحاب فیل کی یادگار ہے، جو مکہ اور اس مرکز ابراہیمی کے دشمن تھے جو توحید اور دین حنیفی کا سرچشمہ ہے، تو لازماً اس سنت کی ادائیگی اور دعا کے وقت ہمارے تاثرات و انفعالات اس سے بالکل مختلف ہوں گے جو شیطان یا مینڈھے کی رمی کے تصور کی حالت میں ہوتے، ان دونوں صورتوں کے فرق کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے۔

الف - رمی کے وقت جس شخص کا تصور یہ ہوگا کہ وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے، وہ یقیناً اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ یا کوئی قوی داعیہ نہیں محسوس کریگا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کنکریاں وہ ایک پتھر پر پھینک رہا ہے۔ اس سے نہ تو وہ شیطان کے فریبوں سے ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو مامون خیال کرے گا نہ یہ ہی سمجھے گا کہ کم از کم کچھ دنوں کے لئے اس کے فتنوں کو اس نے مجروح کردیا۔ اس تصور کے اثرات کا دائرہ اس کی نظر میں معوذتین یا لاحول اور اذان کے دائرہ سے زیادہ وسیع نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قدرتی طور پر دوسرے مناسک حج کی ادائیگی کے وقت جس جذبہ و جوش سے وہ اپنے کو معمور پائیگا۔ اس جذبہ و جوش سے اس رسم کی ادائیگی کے وقت اس کا سینہ بالکل خالی ہوگا، خصوصاً مینڈھے کے بھاگنے کا قصہ اور اس رمی کو اس کی یادگار سمجھنا تو جھوٹ ہونے کے علاوہ انتہائی لغویت بھی ہے فصل کے شروع میں ہم اس کی حقیقت بے نقاب کرچکے ہیں۔

ہاں اگر اس رمی کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار سمجھا جائے تو ہمارے تصورات کا رخ بالکل دوسرا ہوگا اور اس وقت قدرتاً ہمارے تاثرات و انفعالات کی کمیت و کیفیت بھی بالکل مختلف ہوگی۔ ہم ایک ستون پر چند کنکریاں مار کر اس عظیم الشان نصرت الٰہیہ کے جوش ذکر سے معمور ہو جائیں گے، جو اللہ کے مقدس گھر کے پاسبانوں کے لئے مخصوص ہوئی۔ ہم یاد کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے دست تصرف نے ہمارے دشمنوں کے تمام داؤ بیکار کر دیے ان کی عظیم الشان جمعیت پارہ پارہ کر دی۔ یہ تصور دنیا کے ایک عظیم ترین واقعہ کا تصور ہوگا، یہ ہماری قوت ارادی کی شیرازہ بندی کریگا۔ ہم سوچیں گے کہ سر و سامان کی قلت ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ اصل سلاح کار خدا کا ہم ہے۔ اس کی غیبی فوجیں، ہماری بے سر و سامانی کے باوجود ہمارے دشمنوں پر ہم کو فتح دلا سکتی ہیں، ہر حال میں اس کے فضل و نصرت کی رجاء ہونی چاہیے۔ پھر اتنی ہی نہیں بلکہ ہم اپنے تئیں مجاہد سمجھیں گے، جو ظاہری اصلحہ کے ذریعہ نہیں بلکہ قوت ارادی کے ہتھیاروں اور اللہ اکبر کی تکبیروں سے دشمن کی فوجوں کو سنگسار کر رہے ہیں۔[۵]

ب۔ پھر جب رمی کے بعد دعا کے لئے کھڑے ہوں گے تو اس حالت سے بالکل نکل نہیں جائیں گے، بلکہ یہ دعا بھی مجاہدین کی دعا ہوگی۔ اس وقت سب کی قوت ارادی کا مرکز ایک ہوگا۔ ایک بڑی جماعت جب اپنے دلوں کے ایک ہی مرکز عبدیت و نیاز کی طرف جھک جاتی ہے۔ اور کسی ایک ہی آرزو کے لئے سب کی دعائیں اور التجائیں متحد ہو جاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ نماز جماعت اور نماز استسقاء میں یہی حقیقت مضمر ہے۔ علاوہ بریں، یہ دعا ان لوگوں کو اس جماعت سے بالکل علیحدہ اور ممتاز کر دیتی ہے جن کا محور نظر صرف قوت ارادی کی جمع و تشکیل ہے۔ مثلاً جادوگر اور بت پرست، گویا جس مقصد کیلئے ہم رمی جمار کرتے ہیں یہ دعا اس کی تصحیح و تکمیل کرتی ہے۔

حج سر تا سر مشق جہاد ہے

ج۔ چوپایہ کا ذبح کرنا ذبح نفس کی علامت ہے۔ یہ قربانی ایک فدیہ ہے۔ گویا ایک چوپایہ کے عوض

---

[۵] رمی کے وقت ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کی شرط اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ مترجم۔

ہم اپنی جان چھڑا لیتے ہیں۔ بعینہ یہی حقیقت جہاد کی ہے۔ یعنی نفس کو ذبح کرکے اس کو جہنم کی آگ سے بچا لینا۔ پھر دیکھو حج کے تمام آداب و مناسک میں بعینہ جہاد کی حقیقت جلوہ گر ہے۔ یہ روز کا کوچ و قیام اور عجلت کی نمازیں کیا ہیں؟ یہ بالکل فوجی مشق اور تمرین ہے ہر حج کرنے والا پورے یقین کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ مرحلے کسی قائد ہی کی قیادت کے مقتضی ہیں۔ منازل پر حجاج کی حالت علانیہ فوجی نظم کی ضرورت کا یقین دلاتی ہے۔ یہ حالات بنی اسرائیل کے خروج مصر کے حالات سے مشابہ ہیں۔ ان کا کوچ و قیام بالکل فوجی نظم کے ماتحت ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سپہ سالار تھے جو ایک طرف جنرل کی طرح فوج کی قیادت کرتے تھے۔ اور دوسری طرف قاضی کی طرح بیٹھ کر فصل مقدمات کرتے تھے۔

مسلمان حج میں اپنے ارادہ جہاد کی تصحیح کرتا ہے اور ان تمرینی مشقتوں کو برداشت کرکے گویا اس امر کا اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے بالکل سربکف آمادہ ہے۔ اگر رمی کو رمی شیطان کی یادگار مانو تو حج کا یہ تمام فلسفہ بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض طبیعتوں میں یہاں خدشہ پیدا ہو کہ یہ رائے بالکل نئی ہے۔ حج کے متعلق یہ بات نہ تو دوسروں سے سنی اور نہ خود اپنے ذہن میں آئی کہ اس کو جہاد سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تو محض ایک سادہ عبادت ہے، جنگ و جہاد سے اس کو کیا واسطہ! اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ لا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ اس خدشہ کے جواب کے لئے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جس کا یہ محل نہیں۔ اپنے مقام پر یہ بحث آئیگی یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں حوالہ قلم ہوئیں۔ والحمد للہ رب العالمین والسلام علی نبیہ محمد والہ و صحبہ اجمعین۔

معارف قرآن

نظم قرآن

از امین احسن اصلاحی

یہ مضمون میں نے عربی میں لکھا تھا اور لکھنؤ کے عربی رسالہ الضیاء میں شائع ہو چکا ہے۔ پھر اسکا اردو ترجمہ میرے ہی قلم سے مجلہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا۔ لیکن یہ ناتمام ہے، اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں اسلئے الاصلاح میں بھی شائع کیا جاتا ہے (اڈیٹر)

قرآن مجید کے اکثر طلبہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے شیفتگی کے باوجود بعض اوقات نظم قرآن کے بارہ میں مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں مولانائے موصوف اس دعویٰ میں بالکل منفرد ہیں۔ علمائے عرب و عجم میں سے جن لوگوں کو معارف قرآن پر غور کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، کوئی شخص بھی ان کا ہمنوا نہیں ہے، اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا تو یہ راز ان لوگوں سے مخفی نہ رہتا، جنکی دیدہ دری اور نکتہ رسی پر تمام امت کا اتفاق ہے، پھر کیونکر باور کیا جا سکتا ہو کہ سلف کی نگاہ کشف و تحقیق جس حقیقت کا سراغ لگانے سے عاجز رہی اس کا دروازہ ایک ایسے شخص نے کھول دیا، جو ان آخری صدیوں میں پیدا ہوا جبکہ علم و تحقیق کی تمام رونقیں گل ہو چکی ہیں اس لئے ائمہ سلف کے خلاف جو شخص نظم قرآن کا دعویٰ کرتا ہے، وہ ایک ایسی بات کا دعویٰ کرتا ہے جس کے خلاف گویا تمام سلف کا اجماع ہے۔

اس باب میں ان لوگوں کی سب سے بڑی عقلی و نقلی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید بالکل کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اپنا نام "کتاب مبین"، "سراج منیر" اور "نور" بتایا ہے۔ اور

خداوند تعالیٰ نے اس کی تعریف ایسے لفظوں میں کی ہے جن سے اس کا سہل اور آسان ہونا نہایت واضح لفظوں میں ثابت ہوتا ہے، مثلاً فرمایا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ — ہم نے قرآن مجید کو یاد دہانی کیلئے آسان بنا یا ہے، کوئی یاد دہانی حاصل کرنیوالا

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں متعدد ہیں۔

پس اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا جیسا کہ علامہ فراہیؒ کا دعویٰ ہے، تو لازماً یہ نظم بھی نہایت سہل الحصول ہوتا اور جس طرح ہر عربی دان بغیر کسی خاص کاوش کے اس کی آیتوں کا ترجمہ سمجھ لیتا ہے، اسی طرح ہر طالب نظم بادنیٰ تامل اس کے نظم کا بھی سراغ لگا لیتا لیکن صورت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ نظم کی راہ نہایت دشوار ہے۔ سلف کی آہنی ہمتیں بھی اس کی مشکلات پر قابو نہ پا سکیں اور دنیائے علم وتحقیق کے تمام فاتحین اس قلعہ کو مسخر کرنے سے عاجز رہے، اس لئے یہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظم کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک مجاز ہے، جس کے پیچھے کسی لطائف پسند اور موشگاف طبیعت نے اپنے تئیں محض زور آزمائی اور جولانی کے شوق میں ڈال دیا ہے اور اس طرح ایک لایعنی سعی میں جو شریعت اسلام میں ممنوع ہے، الجھ کر رہ گئی ہے۔

استاذ مرحوم نے مخصوص اس موضوع پر دلائل النظام کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اسمیں ایک ایک خدشہ سے تعرض کیا ہے، اور تمام دعاوی پر، اپنے اصول کے مطابق، نہایت محکم اور قطعی دلیلیں قائم کی ہیں لیکن اس قسم کے اہم مباحث پر اس مختصر مضمون میں اطمینان بخش تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، البتہ اس موضوع سے متعلق چند باتیں جو استاذ مرحوم کے خطبات درس میں سے حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں، اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

یہ بات اصول کی حیثیت سے پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس باب میں ہمارا اصلی اعتماد نفس قرآن پر ہے وہ بہتر سے بہتر صورت میں منظم ہے۔ یہ نظم بعض مخصوص مقامات کے علاوہ ایک صاحب نظر کے لئے ہر جگہ بالکل واضح ہے۔ جن مقامات پر حجاب ہی، وہاں ہم قرآن کے بجائے اپنی نگاہ کو متہم کرتے ہیں نظم قرآن پر ہمارا عقیدہ خارجی دلائل پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کی بو ہم نے خود قرآن میں سونگھی اور یہی ہمارے پہلے قدم کی محرک ہوئی۔

لیکن ان تفصیلات کی یہاں گنجایش نہیں۔ البتہ قرآن کے علاوہ جو بعض خارجی دلائل ہیں، وہ مضطر طبیعتوں کے اطمینان کے لئے ذیل میں اجمالاً پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ دعوئے نظم میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ علمائے سلف کی ایک جماعت کا پہلے سے یہ مسلک رہا ہے اور اس پر انھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں:۔

"علامہ ابوجعفر بن زبیر شیخ ابوحیان نے نظم پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام البرهان فی مناسبة ترتیب سور القرآن رکھا۔ اور ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین البقاعی کی تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے خود اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے جس میں نظم کے علاوہ وجوہِ اعجاز پر بھی بحث کی ہے پھر لکھتے ہیں:۔

"ترتیب و نظم کا علم ایک اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے اشکال کی وجہ سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔ امام فخرالدین کو اس کے ساتھ سب سے زیادہ اعتنا رہا اور ان کا قول ہے کہ لطائفِ قرآن کا اصلی خزانہ نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ آیت ولو جعلناہ قرآناً اعجمیاً لقالوا الخ (حم السجدہ ۷) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس آیت کے سبب نزول کے بارہ میں لوگ روایت کرتے ہیں کہ کفار نے از راہ شرارت کہا کہ اگر قرآن کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو جواب دیا ہے لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن مجید میں ایسی آیتیں اتری ہیں، جن میں باہمد گر کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید پر سب سے بڑا طعن ہے، ایسی صورت میں قرآن مجید کو معجزنما نا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب و منظم کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ صحیح مسلک میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے آخر تک بالکل مربوط کلام ہے (اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر لکھی ہے)

پھر کہتے ہیں) ہر مصنف، جو انکار حق کا عادی نہیں ہے تسلیم کریگا کہ اگر سورہ کی تفسیر یوں کی جائے جس طرح ہم نے لکھی ہے تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔" (دیباچہ تفسیر نظام القرآن فراہیؒ)

اس سلسلہ کی ایک اہم شخصیت : علامہ مخدوم مہائمی ہیں۔ ان کی تفسیر آیات کی باہمی مناسبت کے بیان میں ہے اور اس چیز کی ان کی نظر میں اس درجہ وقعت تھی کہ اپنی کتاب کا انھوں نے تبصیر الرحمان و تیسیر المنان رکھا۔

اسی عقیدہ کے ایک بزرگ علامہ ولی الدین ملوی ہیں وہ فرماتے ہیں:-

"جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول باقتضائے حالات جستہ جستہ ہوا ہے اس لئے آیات میں باہمی تعلق نہیں تلاش کرنا چاہئے۔ ان کو سخت دھوکا ہوا۔ بلا شبہ قرآن مجید کا نزول حسب حالات جستہ جستہ ہوا لیکن اسکی ترتیب میں نہایت گہری حکمت مضمر ہے۔"

یہ وہ علمائے امت ہیں جنھوں نے نظم کی بو سونگھی ہے۔ ان کے اقوال پیش نظر رکھو۔ بعینہ یہی حال علامہ ابن جریر وغیرہ کا ہے۔ باوجودیکہ ان کا خاص مقصد صرف روایات سلف کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع کردینا ہے لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ تمام اقوال سلف میں سے اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو نظم کلام اور سیاق و سباق سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے۔ اور دوسری روایات جو اس سے مانع ہوتی ہیں ان کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ بالکل یہی طریقہ علامہ زمخشریؒ کا ہے وہ تمام موانع سے بے پروا ہوکر صرف نظم کا تتبع کرتے ہیں۔ اور اگر بعض جگہ حمایت اعتزال کے جوش میں وہ آگے نہ بڑھ جاتے تو میرا خیال ہے کہ ان کی کتاب اس فن کے مبتدیوں کے لئے نہایت مفید ہوتی۔ یہی بات حضرت امام رازیؒ کی تفسیر میں بھی ہے۔ وہ اشعریت کے علمبرداروں میں ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی حمایت کے جوش میں کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔

اوپر جن مفسرین کا تذکرہ ہوا ہے یہی لوگ ائمہ تفسیر ہیں۔ اور انہی کی کتابیں اس فن کی امہات ہیں۔ سب

لوگ نظم کو تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض وجوہ سے جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں، یہ لوگ نظم کو پوری طرح بے نقاب نہ کر سکے۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں نظم کا انکار کیا ہے تو یہ بات بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ ایک ایسے قول کی بنا پر جس کی تاویل اس کے علاوہ بھی آسانی سے ہو سکتی ہے جو باول وہلہ ذہن کے سامنے آتی ہے، میں ایسے بلند رتبہ امام سے بدگمانی نہیں پسند کرتا۔ علماء کی جماعت میں ٹھیک بات قبول کرنے میں وہ سب سے آگے ہیں۔ اپنی تصنیفات خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے جو اسرار و حکم انھوں نے بیان کئے ہیں، وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ معرفت نظم میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ پھر ابن العربی کے ساتھ ان کو جو حسن ظن ہے وہ سب کو معلوم ہے اور نظم کے بارے میں ابن العربی کی رائے اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس بارہ میں ان کے کلام کی ایسی تاویل کی جائے جو ان کی شان اور ان کے رجحانات کے مطابق ہو اور یہ بات آسانی سے ممکن ہے۔ اس باب میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر ایک غیر متعلق بحث میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تفصیل سے دکھاتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

۲- جو علماء نظم کے منکر ہیں وہ بھی بادل ناخواستہ منکر ہیں کیونکہ اس خیال کی بنیاد محض اس بات پر ہے کہ قرآن مجید حالات کے لحاظ سے جستہ جستہ اترا ہے۔ اس بنیاد کا ضعف بالکل ظاہر ہے کیونکہ بعض طوال اور اکثر قصار پوری پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ نیز بعض سورتوں کا نظم بالکل واضح ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب میں آنحضرت صلعم مناسبت کا لحاظ فرماتے تھے انہی وجوہ کی بنا پر امام رازی نے وہ بات کہی ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔ اور سورہ انعام کی تفسیر میں انھوں نے اپنے خدشہ کو بالکل صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نظم قرآن کے منکر علماء کا انکار بھی ان کی دینی غیرت پر مبنی تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ نظم کا دعوی کرنا اور پھر یہ اعتراف کرنا کہ وہ اکثر یا بعض سورتوں میں مخفی ہے، قرآن کے حق میں مضر ہے۔ اس سے معاندین کو اس پاک کتاب پر نکتہ چینی کی جرأت ہوگی۔ اس خیال کی بنا پر وہ ایک ایسی بات کہہ گئے جس کا ضرر اس کے فائدہ سے زیادہ ہے۔

لیکن اعمال کا مدار نیت پر ہے، انشاء اللہ وہ آخرت میں اپنے حسنِ نیت کا اچھا صلہ پائیں گے۔

۳۔ جن لوگوں نے جمع و ترتیب قرآن سے متعلق روایات پر غور کیا ہے، وہ واقف ہیں کہ قرآن اگرچہ جستہ جستہ نازل ہوا ہے لیکن آیات کی ترتیب آنحضرت کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ آپ آیات کی جگہ سورتوں میں متعین فرما دیتے تھے اور کاتبین وحی ان کو ان کی متعینہ جگہوں میں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ترتیب آیات کے توقیفی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ اگر قرآن مجید میں نظم نہ ہوتا، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے تو آنحضرت صلعم اس قسم کا حکم کیوں دیتے؟ اور اگر کوئی عظیم الشان حکمت داعی نہ ہوتی تو نزولی ترتیب کو چھوڑ کر جو سب سے زیادہ قابلِ لحاظ تھی، ایک نئی ترتیب کیوں اختیار فرماتے؟ بہر حال جب ہر آیت کے لئے ایک مخصوص جگہ متعین ہوئی تو لازماً اس تعین کے سبب پر غور کرنا پڑیگا۔ اور ظاہر ہے کہ بجز رعایت نظم کے اس کا کوئی اور سبب نہیں بتایا جاسکتا۔ اس لئے جو لوگ ایک سورۃ کے مضامین میں بھی ربط و نظام کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال صحت پر مبنی نہیں۔ علامہ ملوی رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا قول اوپر گذر چکا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ہمارے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جن آیات میں کسی سابق حکم کی تخفیف وارد ہوئی ہے، ان کو ہمیشہ ماسبق حکم کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً آیت الآن خفف اللہ عنکم وعلم الخ ماسبق آیت کے بہت بعد نازل ہوئی ہے لیکن چونکہ اس میں اسی ماسبق حکم کی تخفیف تھی اس لئے اس کو اسی کے بعد رکھا گیا۔ اسی طرح سورہ مزمل کی آخری آیت ایک مدت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس کو بھی پہلے حکم کے بعد ہی رکھا گیا۔ یہی حال آیت والذین یتوفون منکم الخ اور آیت احل لکم لیلۃ الصیام الخ کا ہے۔ بعض جگہ جہاں اس قاعدہ کے خلاف ہوا ہے، اس کے اسباب دوسرے ہیں، ایسے مواقع پر زیادہ تر عمود یا بعض دوسرے مصالح کی رعایت کی گئی ہے جو اس قسم کی تبدیلی کے مقتضی ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک کوئی شخص ان تغیرات کو سمجھ لینے کا عادی نہ ہو جائے وہ جزئیات سے اصول تک نہیں پہنچ سکتا۔

۴۔ علیحدہ علیحدہ سورتوں کا قائم کرنا اور ان کا چھوٹا بڑا ہونا بھی نظم کی دلیل ہے۔ اگر قرآن مجید غیر منظم ہے

تو الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ سورتوں کی تحدید وحی الٰہی سے ہوئی ہے، کوئی عقلی یا نقلی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے، ان کے پاس قرآن مجید یا حدیث صحیح کی کوئی سند نہیں ہے، اس لئے ان کا دعوی بے بنیاد ہے۔ ہر صاحب عقل محسوس کرتا ہے کہ الگ الگ سورتیں قائم کرنا اور ان کا مختلف المقدار ہونا اس امر کا صاف ثبوت ہے کہ سورتوں کے مضامین الگ الگ ہیں، نیز ہر سورہ کسی مخصوص وحدانیت کی حامل ہے جو اس کو دوسری سورتوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی، جامعین قرآن آیتوں کے مجموعے لیتے اور برابر برابر سورتوں میں رکھتے چلے جاتے تسہیل تلاوت، حفظ قرآن اور دوسرے مقاصد کے لئے یہ ترتیب اور بھی آسان ہوتی۔

۵۔ سورتوں کی موجودہ ترتیب، جو بالاتفاق تمام مصاحف میں پائی جاتی ہے، وجود نظم کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ہے، وہ بلا سبب نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے سورتوں کی مقدار سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز تھی لیکن اس کا لحاظ، ہر شخص کو معلوم ہے، قرآن مجید میں بالکل نہیں ہے کیونکہ ترتیب میں سورہ فاتحہ کو بقرہ سے پہلے جگہ دی گئی ہے اور سورہ کوثر جو قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ ہے متعدد اس سے بڑی سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ ترتیب نزولی نہیں ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس تقدیم و تاخیر کا کوئی اور سبب تلاش کیا جائے۔ ہمارے نزدیک رعایت نظم کے سوا اس کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی ہے، پیغمبر صلعم کے حکم سے نہیں ہوئی ہے لیکن یہ بات قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بالکل خلاف ہے استاذ امامؒ نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں اس کی مدلل تردید کی ہے۔ یہاں اس پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں ہے لیکن تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلو کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی، اس سے یہ کیونکر ثابت ہوگیا کہ انھوں نے نظم کی کوئی پروا نہیں کی اور بلا لحاظ ربط و تعلق سورتوں کو جمع کر دیا؛ ہر شخص کو معلوم ہے کہ سورہ براۃ کے بارہ میں، جب صحابہ میں اختلاف ہوا کہ اس کو کس جگہ رکھا جائے تو یہ گتھی نظم ہی کی مدد سے

سطحی اور معنوی مناسبت کی رعایت سے اس کو انفال کے بعد جگہ دی گئی یہ بات عام خیال کے لحاظ سے کہی گئی ہے ورنہ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے اور قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر حجت ہے۔

سورہ قیامہ میں ہے:۔

اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ	بے شک	بیشک ہمارے اوپر ہے اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھنا پس جب ہم پڑھ چکیں تو اس پڑھے ہوئے کی پیروی کرو پھر ہمارے اوپر ہے

استاد امام مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید عہد نبوت ہی میں جمع ہو کر آنحضرت صلعم کو ایک خاص ترتیب سے سنا دیا جائیگا کیونکہ یہ وعدہ اگر آپ کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس جمع و ترتیب کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔ دوسری یہ کہ اس قرأت ثانیہ کے مطابق، جو جمع کے بعد ہوئی، آپ کو قرآن مجید سنانے کا حکم ہوا اور عقلاً و نقلاً ناممکن ہے کہ پیغمبر کے پاس کوئی حکم آئے اور وہ اس کو امت تک نہ پہنچائے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتک اس حکم عام کا مقتضیٰ ہے کہ پیغمبر صلعم نے اس قرأتِ آخیرہ کے مطابق، جو لوح محفوظ میں ہے، امت کو قرآن مجید کی تعلیم کی ہو اور آخری قرأت کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو تعمیم و تخصیص اور تکمیل و تخفیف چاہی، وہ بھی فرمادی۔ قرآن مجید ان تینوں مراحل سے عہد نبوت ہی میں گذر گیا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے۔ اور یہ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ قرآن مجید ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کو سنایا گیا ہو۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہؓ نے آپ سے قرآن مجید سیکھا۔ آپ آیات کو مناسب جگہوں میں رکھنے کا حکم دیتے تھے اور اس حکم کی تعمیل کیجاتی تھی اگر کوئی تشریحی آیت اترتی، وہ مناسب جگہ میں شامل کردیجاتی۔ اس طرح جب پورا قرآن مجید

مکمل ہوگیا تو حضرت جبریل نے جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، آخری مرتبہ پورا قرآن مجید سنایا ۔ ۔ ۔ اس حقیقت کے معلوم ہوجانے کے بعد نظم کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہوجاتی ہیں۔"

(تفسیر سورہ قیمہ مصنفہ فراہی)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی جو ترتیب ہمارے زمانہ میں موجود ہے، یہ وحی الٰہی کے مطابق عہد نبوت ہی میں مکمل ہوچکی تھی لیکن چونکہ اس عہد کی دنیا لوازم تمدن سے محروم تھی، پڑھنا لکھنا شاذ و نادر اور کاغذ وغیرہ ناپید تھا اس لیے ایک عرصہ تک قرآن مجید کھجور کے پتوں، ہڈیوں، تختیوں اور حفاظ کے سینوں ہی میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے منتشر آیات کو ایک مصحف میں محفوظ کیا۔ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی متعدد نقلیں کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔

۶۔ چھٹا پہلو یہ ہے کہ کسی کلام کی اصلی روح نظم ہے۔ اس کے الگ کر دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ کلام اپنی بعض خوبیوں سے محروم ہوجائیگا بلکہ پورا کلام، بالکل مہمل اور بے معنی ہوجائیگا۔ جو کلام نظم سے خالی ہو وہ از قسم خرافات ہے کوئی عاقل اپنا ایک لمحہ بھی اس پر ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا۔ قرآن مجید کی نسبت تمام دنیا کو معلوم ہے کہ اس نے عربوں کو تحدی کی اور عرب باوجودیکہ ان کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اس کے جواب میں ایک چھوٹی سی چھوٹی سورہ بھی نہ پیش کر سکے۔ قرآن کی اس جلالت کے لحاظ سے اس میں سب سے پہلے جو چیز ہونی چاہیے وہ نظم ہے کیونکہ ایک ایسی کتاب جو سب سے زیادہ منتشر اور بے نظم خیال کی جاتی ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تحدی نہیں ہوسکتی۔ یہیں سے ایک اور نکتہ کی طرف رہبری ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں تحدی کی ہے اپنے مثل ایک کتاب، یا دس سورت یا بحدیث من مثلہ یا کم از کم ایک سورہ کا مطالبہ کیا ہے، ایک آیت سے تحدی نہیں کی ہے، کیونکہ ایک مفرد آیت کتنی ہی عظیم الشان علم و حکمت کی حامل کیوں نہ ہو، تحدی کے قابل نہیں ہوسکتی۔ متفرق آیات کی مثال موتیوں یا شیریں الفاظ کی ہے جنکو کسی صفحہ پر تم نے بکھیر دیا ہو، ان کے آب و رنگ سے تم محظوظ ہوسکتے ہو لیکن ان کو ایسے شخص کے سامنے مقابلہ کے لیے نہیں پیش کر سکتے جس نے اپنے قیمتی موتیوں کو کسی رشتہ

میں اور اپنے شیریں الفاظ کو کسی عمدہ نظم و نثر میں پرو دیا ہو کیونکہ اس نے ان کے ذاتی آب و رنگ پر نظم و ترتیب کا اضافہ کر کے ان کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ اسی وجہ سے عرب و عجم کے تمام علمائے بلاغت کا اتفاق ہے کہ کلام کی اصلی روح نظم ہے، اسی سے اس کی تمام خوبیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو اس کے باور کرنے میں تامل ہو وہ کسی بلیغ سے بلیغ خطیب کا کوئی کلام لے اور اس کو اس کے نظم کے شیرازہ سے الگ کر دے، وہ دیکھے گا کہ کلام کا تمام حسن و جمال دفعۃً برباد ہو گیا۔ پس ایک پوری سورہ جو ایک مخصوص وحدانیت کی حامل ہے، اپنے اندر دو حسن رکھتی ہے ایک اس کے اجزا کا حسن ہے دوسرا نظم کا نور علی نور ویھدی اللہ لنورہ من یشاء۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کو شعر و شاعری سے منزہ قرار دیا ہے۔

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ — اور ہم نے اسکو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ یہ چیز اس کے لئے زیبا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وما ھو بقول شاعر — اور یہ قرآن مجید کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

اور شاعروں کا ایک بہت بڑا عیب یہ بتایا ہے کہ انھم فی کل واد یھیمون، اور وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، یعنی جو خیال سامنے آگیا، بے سوچے سمجھے اسی میں مشغول ہو گئے۔ اس قسم کی بے تکی ہرزہ سرائی شعرا کی خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کو اس عیب سے منزہ قرار دیا ہے، اس لئے قرآن مجید کو غیر منظم خیال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو "ہیمان" تعبیر کیا ہے اقتضاب یعنی بے نظمی اسی کی ایک شاخ ہے یہیں سے ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو قرآن مجید کو اس بنا پر بے نظم خیال کرتے ہیں کہ وہ شعرائے عرب کے کلام کے انداز پر ہے کیونکہ قرآن مجید نے ان کے کلام کی صرف خوبیاں لی ہیں اسکے معائب سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اہل عرب کا کلام صرف شاعری ہی نہیں تھا یہ ان کے کلام کی صرف ایک قسم ہے۔ اور شرفائے عرب عموماً اس کو وقار کے منافی سمجھکر اس سے احتراز کرتے تھے۔ ان کے شوق و رغبت کی اصلی چیز خطبات ہوتے تھے۔ اور جو لوگ ان کے کلام کی اس صنف سے

واقف ہیں وہ اعتراف کریں گے کہ خطبات عرب جملہ محاسنِ کلام کے حامل ہوتے تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان کا بیشتر حصہ مٹ گیا اور بہت تھوڑا حصہ آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

۸۔ قرآن کی بعض سورتوں میں ترجیعات ہیں۔ مثلاً سورہ رحمان میں فبای آلاء الایۃ والی آیت بار بار دھرائی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ مرسلات میں ویل یومئذ للمکذبین، اور سورہ شعراء میں ان فی ذالک لآیۃ الایۃ کی تکرار ہے اسی طرح بعض سورتوں میں ہر چند آیات کے بعد کوئی آیت مطلع یا مقطع کی حیثیت سے بار بار آتی ہے۔ مثلاً سورہ نور میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ وانزلنا فیہا آیات بینات لعلکم تذکرون تین مرتبہ وارد ہے تعجب ہے کہ ان سورتوں کے اجزا کو کیونکر بے نظم کہا جا سکتا ہے، جبکہ باعتبار ترجیع یہ بالکل متحد معلوم ہوتے ہیں۔ اس باب کا ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورہ میں کلام بار بار عمود یا مرکز کی طرف لوٹتا ہے لیکن مقام کی رعایت سے الفاظ میں ایسی تبدیلی یا کمی بیشی ہو جاتی ہے کہ مبتدی جو قرآن کی ان اداؤں سے ناآشنا ہے، سررشتہ نظم کو نہیں سنبھال سکتا بلکہ اگر مجھ پر غلو کا الزام نہ لگایا جائے تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترجیعات تمام قرآن میں پائی جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں لفظی اور معنوی۔ لفظی کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ معنوی ترجیعات کے متعلق یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ معرفت نظم کا زیادہ تر مدار انہی پر ہے، لیکن بغیر ممارست ان کا تتبع مشکل ہے۔ یہاں یہ بات بھی ظاہر کردینی چاہیے کہ مجھکو نظم کا یقین سب سے زیادہ ترجیعات ہی کی رہنمائی سے ہوا۔ جب میں ترجیعات والی سورتوں کی تلاوت کرتا ہوں، ظاہری اقتضاب کے باوجود مجھکو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی تیر انداز نے اپنے ترکش کے تمام تیر اپنے سامنے پھیلا دیئے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک مخصوص نشانہ کی طرف ان میں سے ایک تیر اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔

۹۔ قرآن مجید میں قوافی کی رعایت کی گئی ہے۔ اس سے بھی نظم کا ثبوت ملتا ہے۔ جن لوگوں نے کبھی اس پہلو سے قرآن مجید پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی مدد سے نظم کے کن نکتوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہاں مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنیکا موقع نہیں ہے البتہ اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کے ٹکڑے

ے ہوکر نازل ہونے کے باوجود اس میں قافیہ کی رعایت اقتضاکے بالکل منافی ہے کیونکہ قافیہ کا ظاہری اقتضا
طاو تعلق ہے اور کوئی عقلمند انسان ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید کے جستہ جستہ نازل ہونکی
سے اس کے اجزا میں کوئی نظم نہ پیدا ہو سکا لیکن اللہ تعالیٰ یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نغمہ یا سجع کی حفاظت
خیال سے اس کے قوافی کی رعایت باقی رکھی۔ سجع و قافیہ کلام میں مقصود بالذات چیزیں نہیں ہیں کہ ان کیلئے
درجہ اہتمام کیا جائے۔ اس لئے اگر قرآن مجید کا جستہ جستہ نازل ہونا فساد نظم کا باعث ہوتا جیسا کہ خیال کیا
ہے تو اس کا سب سے زیادہ اثر قوافی پر پڑتا حالانکہ وہ تمام سورتوں میں بالکل محفوظ ہیں۔

تفسیر قرآن

(۴)

امین احسن اصلاحی

تعلیم حکمت | تیسری چیز تعلیم حکمت ہے۔ یہ سوال نہایت اہم ہے کہ حکمت کیا ہے؟ یہ محل اس کی تفصیلات میں پڑنے کا نہیں ہے۔ استاذ مرحوم نے اس پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ اصحاب ذوق اس کا انتظار کریں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ کتاب الٰہی جس طرح آیات اللہ اور شرائع پر مشتمل ہے اسی طرح حکمت پر بھی مشتمل ہے۔ لیکن ہمارا یہ دعویٰ ان لوگوں کے خلاف پڑے گا جو حکمت سے حدیث یا بعض دوسرے علوم مراد لیتے ہیں اور چونکہ یہ مذہب بعض اکابر امت مثلاً امام شافعیؒ وغیرہ کا بھی ہے اس لئے اس سے اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ پس دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی دلیل کیا ہے؟ ان کی دلیل یہ ہے کہ حکمت کا لفظ یہاں کتاب کے ساتھ آیا ہے۔ کتاب سے یہ لوگ قرآن مجید باعتبار مجموع مراد لیتے ہیں اس لئے ضروری ہوا کہ حکمت سے کوئی اور چیز مراد لیں اور قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ حدیث کے سوا کوئی دوسری چیز اس لفظ کا مدلول نہیں ہوسکتی۔

لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ وجہ استدلال کچھ محکم نہیں۔ آیت مذکورہ میں بوجوہ کتاب سے مراد شرائع ہیں اس لئے حکمت کے لئے خود قرآن میں کافی گنجائش ہے۔ اس سے حدیث مراد لینا کچھ ضروری نہیں یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ حدیث میں بھی حکمت ہے۔ بلاشبہ حدیث کا رتبہ بہت بالا ہے۔ وہ امت کے لئے قرآن کے بعد دوسری چیز ہے۔ اس میں خود حکمت قرآن کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ پھر اگر حدیث میں حکمت نہ ہوگی تو کہاں ہوگی؟ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہوسکتی کہ اس آیت میں حکمت سے مراد حدیث ہے۔ مختلف وجوہ و قرائن اس کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔

(۱) متعدد آیات میں حکمت کے لئے "یتلی" "انزل" اور "اوحی" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جنکا استعمال حدیث کے لئے قرآن میں معلوم نہیں۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ — اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور وہ باتیں سکھائیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ — تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت پڑھی جاتی ہے ان کو یاد رکھو۔

دوسرے مقام پر دین کی اصولی باتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ — تمہارے رب نے تمہارے پاس جو حکمت وحی کی ہے یہ اس میں سے ہے

۲۔ مختلف مواقع پر قرآن مجید کے دلائل و حجج کو حکمت بالغہ اور خود قرآن کو قرآن حکیم اور کتاب حکیم کہا گیا ہے (۱) حکمۃ بالغۃ فما تغن النذر۔ (۲) یس والقرآن الحکیم۔

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

واذ علمتك الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل — یاد کرو جب ہم نے تم کو کتاب و حکمت توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

اس آیت میں توراۃ و انجیل کے الفاظ تشریحی ہیں۔ لفظ کتاب کی تشریح توراۃ ہے اور حکمت کی تشریح انجیل سے کی گئی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ توراۃ زیادہ تر احکام و شرائع پر مشتمل ہے اور انجیل بیشتر دلائل و مواعظ پر۔ مقدم الذکر میں دلائل و مواعظ کا حصہ بہت کم ہے اور موخر الذکر میں احکام و شرائع برائے نام ہیں۔ اس باب میں انجیل، توراۃ کی تصدیق کرکے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہ سے توراۃ کو کتاب کہا گیا اور انجیل کو حکمت۔ بعض دوسری آیات سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

ولما جاء عيسى بالبينات قال قد جئتكم — جب عیسیٰ کھلے ہوئے معجزے لیکر آیا دعوت دی اے لوگو

بالحکمۃ ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیہ — میں تمہارے پاس حکمت لیکر آیا ہوں اور تاکہ بعض ان باتوں کو جن میں تم جھگڑ رہے ہو کھول دوں۔

ان وجوہ کی بنا پر حکمت سے حدیث مراد لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ یہ غلط فہمی کتاب و حکمت کے اجتماع نے پیدا کی تھی لیکن ہم نے جن وجوہ کا تذکرہ کیا ہے ان کی روشنی میں دونوں کے حدود الگ الگ ہو جاتے ہیں جس کے بعد یہ غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔

لفظ حکمت کی لغوی تحقیق | اب اجمالاً لفظ حکمت کو لغت اور اس کے استعمالات و مشتقات کی روشنی میں بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ مولانا نے مفردات القرآن میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ ذیل میں اس کا ضروری خلاصہ نقل کیا جاتا ہے۔

الحکم فعل للقضاء المطلق حقاً او باطلاً قال تعالیٰ "ما لکم کیف تحکمون" "افحکم الجاهلیة یبغون" ویطلق علی القوة التی هی منشأ القضاء وحینئذ یراد به الفهم وسیاتیک شواهده واما الحکمة فهی اسم للقوة التی منها ینشأ القضاء بالحق قال تعالیٰ فی نعت داؤد "وآتیناه الحکمة وفصل الخطاب" فذکر الاثر بعد القوة التی هی مصدر تلك الاثر وکما ان القول الفصل من آثار الحکمة فکذلك طهارة الخلق وحسن الادب من آثارها ولذلك کانت العرب تطلق اسم الحکمة

لغت میں حکم کے معنیٰ فیصلہ کرنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ حق ہو یا باطل۔ قرآن میں ہے ما لکم الخ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسا فیصلہ کرتے ہو نیز فرمایا افحکم الخ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ پھر اس قوت کیلئے بولا جاتا ہے جس کی روشنی سے یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے اسوقت اس سے فہم مراد ہوتی ہے اس کے شواہد آگے آئیں گے۔ یہ لفظ حکمت اس قوت کے لئے بولا جاتا ہے جو صحیح فیصلہ کا سرچشمہ ہے حضرت داؤد کی تعریف میں فرمایا گیا آتیناہ الخ ہم نے اس کو حکمت دی اور فصل خطاب یہاں اثر کو اس قوت کے بعد بیان کیا ہے جو اس اثر کا سرچشمہ ہے۔ اور جسطرح فیصلہ معاملات حکمت کے آثار میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب

لى قوة جامعة لرزانة العقل والرأى و
شرافة الخلق الناشئة منها فسموا الرجل
العاقل المهذب حكيما وكذلك يطلقون
اسم الحكمة على فصل الخطاب وهو القول
الحق الواضح عند العقل والقلب وكل
هذه الوجوه من معانى الحكمة جاء فى
كلام العرب واستعملها القرآن والنبى
اعرفوه قال النبى ان من الشعر لحكمة
اى ليس كل شعر غواية بل منه ما يتضمن
الى الحق والحث على الخير هذا. ثم
استعملها الله تعالى فى اكمل افرادها
فسمى الوحى حكمة كما سماه نورا وبرهانا
وذكرا ورحمة ومن هذه الجهة سمى القرآن
حكيما اى ذا حكمة كما سمى نفسه حكيما و
عليما فهذه الوجوه.........

بھی اس کے آثار میں سے ہے۔ اسی لئے اہل عرب اس لفظ کو اس قوت کے لئے استعمال کرتے تھے جو عقل ورائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہو اور عاقل و مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ اسی طرح لفظ حکمت کو فصل خطاب کے لئے بولتے تھے جس سے مقصود ایسی پکی بات ہے جو عقل اور دل دونوں کے نزدیک واضح ہو۔ حکمت ان تمام معانی کے لئے کلام عرب میں مستعمل ہے اور چونکہ اہل عرب لفظ کے ان تمام وجوہ سے پورے طور پر باخبر تھے اس لئے قرآن اور پیغمبرؐ نے اس کو استعمال کیا آنحضرت نے فرمایا شعروں میں سے بعض حکمت ہیں یعنی ہر شعر گمراہی نہیں ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جو حق پر مشتمل ہیں اور ان میں بھلائی پر ابھارا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے اعلیٰ ترین مفہوم کے لئے استعمال کیا یعنی وحی کو جس طرح نور، برہان، ذکر، رحمت وغیرہ کے لفظوں سے تعبیر کیا اسی طرح اس کے لئے حکمت کا لفظ استعمال کیا اور اس اعتبار سے قرآن مجید کا نام حکیم رکھا جس طرح اپنی ذات کیلئے

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ حکمت، کلام اور متکلم دونوں میں ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت استحکام ورسوخ ہے۔ اور جس طرح آگ حرارت سے معلوم کی جاتی ہے اسی طرح یہ اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی سینہ کو اپنا نشیمن بنا لیتی ہے۔ اس کے اندر ایک ملکہ راسخ متمکن ہوجاتا ہے اسکی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق ہوتی ہے۔ اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں لقمان کے قصہ میں

اس حقیقت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کے احوال تفصیل سے مذکور ہیں۔ یہی خدا کی آنکھ اور خدا کا ہاتھ ہے۔ جو اس سے دیکھتا ہے اس کی راہ نیلا کنہار رہا ہے۔ وہ تنگ و تاریک راہوں میں دن کی روشنی کی طرح دوڑ کر چلتا ہے۔ وہ قطروں میں سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے شریعت کی رائی کو بھی پربت سمجھتا ہے۔ خلیفۂ اول جب اہل ردہ سے جہاد کے لئے نکلے یہی روشنی ان کے یمین و یسار تھی۔ یہ داستان طویل ہے۔ ہم نے بقصد اختصار صرف چند حرفوں میں اشارہ کر دیا ہے۔

ان اشارات سے کلام کے اندر اس کی نوعیت سمجھنے میں مدد ملے گی یعنی حکیمانہ کلام وہ ہوگا جو عقل کی راہ سے دل میں اتر جائے۔ ہر وسوسہ کو مٹا دے، ہر شبہہ کو دھو دے، ہر دعوی کو باطل کر دے، ہر منطق اور فلسفہ کو منہدم کر دے۔

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا — حق آگیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل نابود ہے۔

ایک ضروری نکتہ اس موقعہ پر حکمت کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک ضروری نکتہ سمجھ لو جس سے ضمناً توراۃ اور قرآن مجید کا باہمی فرق بھی نمایاں ہو جائیگا۔

قرآن مجید میں توراۃ کی جو صفات و خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں کہیں حکمت کا ذکر نہیں آیا ہے۔ بلکہ بعض مواقع میں، صاف تصریح ہے کہ توراۃ قانون ہے اور انجیل حکمت۔ البتہ کہیں کہیں اس کا موعظت پر مشتمل ہونا بیان کیا گیا ہے۔

وکتبنا لہ فی الالواح من کل شئ موعظۃ وتفصیلا لکل شئی (۱۴۴ - الاعراف) — ہم نے اس کے لئے تختیوں میں ہر چیز لکھدی، موعظۃ اور تفصیل ہر چیز کی۔

موعظت، حکمت کی ایک فرع ہے، حکمت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے ذہنی بلوغ کے اعتبار سے عہد طفولیت میں

ہوتی ہے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کو حکمت سے نہیں سرفراز فرماتا۔ صرف زندگی کو ٹھیک طور پر برتنے کیلیئے ایک ضابطہ عنایت فرماتا ہے اور فکر و نظر کی عام لغزشوں سے بچنے کے لئے بقدر فہم و استعداد موعظت۔

سورہ اعراف میں، اس حقیقت کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پہاڑ پر پہنچے، انھوں نے خدا کو دیکھنا چاہا، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میرے جلوہ کی تاب پہاڑ بھی نہیں لا سکتا، انسانی قلب کی کیا حقیقت ہے۔ چنانچہ ایک ہی تجلی میں پہاڑ لرزہ براندام ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش ہو گئے جب ہوش میں آئے، فوراً توبہ کی۔ قال سبحٰنک تبت الیک وانا اول المسلمین۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

یموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسٰلتی	اے موسیٰ میں نے اپنے پیغام اور اپنے کلام سے تمکو لوگوں پر برگزیدہ
وبکلامی فخذ ما اتیتک وکن من الشاکرین	کیا، بس جو کچھ دیا ہے اس کو لو اور شکر کرو۔

یہ "فخذ ما اتیتک وکن من الشاکرین" کے زور پر غور کرو، سیاق کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمال عرفان کی تمنا کی تھی لیکن اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ تمنا نہ کرو۔ کمال عرفان کی تاب کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے۔ تم کیسے لا سکو گے؟ جتنا ملا ہے اس پر قناعت کرو اور شکر گذار رہو۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کامل حکمت کی مستحق نہیں ٹھہری اس کو صرف قانون اور موعظت دی گئی اس لئے کہ اس کی ذہنی اور قلبی استعداد صرف اتنے ہی کا تحمل کر سکتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے انھوں نے آہستہ آہستہ ان کو کسی قدر حکمت سے آشنا کرنا چاہا لیکن انھوں نے قدر نہیں کی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے جنکو اللہ تعالیٰ نے صحیفہ حکمت عنایت فرمایا تھا لیکن جیسا کہ خود ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے اس وقت تک انکی ذہنی استعداد بھی کامل حکمت کے تحمل کے لایق نہ تھی چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ، مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی تھیں لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کر سکو گے۔ اور کامل حکمت کی تعلیم کا معاملہ اپنے بعد آنیوالے پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ بعد میں آنیوالا جب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک ایسی کتاب سے سرفراز فرمایا جو توراۃ کی طرح صرف قانون ہی نہیں ہے بلکہ انجیل کی طرح اس میں حکمت و موعظت بھی ہے۔ اور حکمت کا وہ حصہ جس کی تعلیم حضرت مسیحؑ نے قوم کی عدم صلاحیت کی وجہ سے ملتوی کر دی تھی، وہ بھی اس کے حصہ میں آئی۔ کتاب اور حکمت کا یہی مجموعہ ہے جس کو ہم قرآن کے نام سے جانتے ہیں۔ چونکہ یہ کامل حکمت سے معمور ہے اس لئے اس میں کمال عرفان کی وہ تمام تجلیاں بھی بند ہیں جنکی ایک ادنیٰ نمود نے طور میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش کر دیا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی اس نے ایک ایسے انسان کو پیدا کر دیا جس نے وہ بوجھ اٹھا لیا جو طور نہ برداشت کر سکا تھا۔ قرآن مجید کی اس حقیقت کی طرف سورہ حشر کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ	اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو پاتے کہ وہ
خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ	پست ہوجاتا اور خدا کی خشیت سے پارہ پارہ ہوجاتا۔

یہی راز ہے کہ توراۃ کا یک دفعہ نازل ہونا ممکن ہوا لیکن قرآن حکیم یک دفعہ نہیں بلکہ نجاً نجاً نازل ہوا کہ قلب انسانی تدریجی تربیت کے ذریعہ آہستہ آہستہ ان تجلیوں کو برداشت کرنے کے قابل ہوجائے۔ اور ان کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ کفار و مشرکین، یہود کے ایما سے آنحضرتؐ پر اعتراض کرتے تھے کہ قرآن مجید توراۃ کی طرح جملۃً واحدۃً کیوں نہیں نازل ہوجاتا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لنثبت [illegible] اس لئے ہے کہ اس کے تحمل کے لئے ہم تمہارے قلب کو مضبوط کردیں۔ غور کرو! جو مقدس سینہ الم نشرح لک صدرک کے انوار سے معمور تھا اس کے لئے بھی قرآن کا تحمل کچھ آسان نہ تھا۔ پھر عام قلوب و اذہان کا کیا حال ہوتا جو اس کوچہ کے احوال و مقامات سے بالکل ہی بیخبر تھے۔

یہ ایک طویل داستان تھی جسکی طرف چند لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ حکمت کی عظمت و اہمیت کا کیا حال ہے؟ قرآن مجید میں اسکا مقام کیا ہے؟ اور اس کیلئے فکر و نظر اور قلب و دماغ کی کیا کیا صلاحیتیں درکار ہیں!! (باقی)

مذاکرہ

سورۂ فتح کی ایک آیت کی تاویل

(از جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی)

قرآن مجید کے ایک طالب علم دریافت کرتے ہیں۔

"آیات اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ الخ میں باہمد گر کیا تعلق ہے؟

فتح وجہ مغفرت کیوں کر ہو سکتی ہے؟ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ سے کیا مراد ہے؟"

آیت کے نظم کو بحث کی روشنی میں لانے سے پہلے سوال کا آخری حصہ یعنی مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ مَا تَأَخَّرَ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ اسکی صحیح تاویل سلسلۂ نظم کی ایک نہایت اہم کڑی ہے۔ یہ ہے کہ اسکے بعد نظم کے سمجھنے میں سہولت ہو گی۔ سب سے پہلے یہ سوال ہے کہ "مِن ذَنبِكَ" میں ضمیر خطاب د نبی صلعم کی ذات اقدس ہے یا خطاب نبی صلعم سے ہے گر مراد اس سے امت ہے؟۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نبی خدا کی بارگاہ میں اپنی امت کا وکیل ہوتا ہے۔ اسلئے کُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَن رَّعِيَّتِهِ" کے بموجب اپنی محبوب امت کی لغزشوں اور گناہوں کا اپنے اوپر بار محسوس کرتا ہے اور برخدا کے حضور امت کے لئے شفاعت اور استغفار کرتا رہتا ہے۔

سورہ محمد میں ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ — اے پیغمبر اپنی یعنی ایمان والے مردوں اور عورتوں کی گناہوں کی معافی مانگتے رہو۔

ایک شبہ کا ازالہ: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیت زیر بحث اور آیت مذکورہ بالا میں لفظ ذنب کی نسبت نبی صلعم کی طرف فاعلی ہے اس سے خود آنحضور صلعم کی اگلی پچھلی فروگذاشتیں مقصود ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ ان آیات میں ذنب کی نسبت آنحضور کی طرف اضافی ہے۔ سورہ محمدؐ کی جو آیت اوپر مذکور ہے اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ اس آیت میں "لِذَنبِكَ" کے بعد مُؤمِنِينَ اور مؤمنات کے الفاظ آئے ہیں جو درا صل اس کا بیان واقع ہیں۔ مراد مومنین اور مومنات کے ذنوب اور خطائیں ہیں۔ صاحب تفسیر نیشا پوری لکھتے ہیں

"فَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ" ای فَاسْتَغْفِرْ لِذُنُوبِ الْمُؤْمِنِينَ یعنی اے نبی مومن مردوں اور عورتوں کی گناہوں اور لغزشوں کے لیے توبہ واستغفار کرتے رہو۔ موصوف کی اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ ذنب کی اضافت گرچہ لفظاً نبی صلعم کی طرف ہے لیکن یہ نسبت فاعلی نہیں ہے۔ اضافی ہے۔ اس سے مراد امت کے ذنوب ہیں۔

پس آیت زیر بحث "من ذنبک" میں بھی ذنب کی نسبت نبی صلعم کی طرف اضافی ہے۔ اس لئے ضمیر خطاب جو نبی صلعم کیلئے ہے اس سے مراد امت ہو گی۔ اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں خطاب آنحضور سے ہے مگر مقصد امت ہے۔ مثلاً

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ	اے نبی (یعنی مسلمانو) جب تم اپنی بیبیوں کو طلاق
فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (سورۃ الطلاق آیت ۱)	دینی چاہو تو ان کو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو۔

اس آیت میں خطاب "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ" سے شروع ہوا لیکن پھر طَلَّقْتُمُ اور فَطَلِّقُوهُنَّ میں جمع کی ضمیریں آئیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب آنحضور ہیں لیکن مراد امت ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ الخ
اے نبی (یعنی مسلمانو) خدا سے ڈرتے رہو کافروں اور منافقوں کے کہے میں نہ آجانا۔

اس آیت میں بھی وہی اسلوب خطاب مرعی ہے۔

مفسرین اس خطاب کے متعلق لکھتے ہیں

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ الخ۔ قِيْلَ هُوَ خِطَابٌ لَهٗ لَفْظًا وَهُوَ لِأُمَّتِهٖ یعنی خطاب آنحضورؐ سے ہے مگر مراد اس سے امت ہے (البحر المحیط لابن حیان)

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ الخ۔ الخطاب مع النبی والمراد بہ امتہ۔ مخاطب نبی کریم ہیں لیکن مراد اس سے امت ہے۔ (الدر المنثور للعلامہ سیوطی)

اس اسلوب کلام کے مطابق آیت زیر بحث میں خطاب بظاہر آنحضورصلعم سے ہے لیکن معناً مراد مومنین ہیں۔ سورۃ الفتح کی آیت ۸ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا سے آیت ۱۰ تک غور کیجئے صاف معلوم ہوگا کہ گو آغاز سورہ میں خطاب لفظاً نبی صلعم سے ہے لیکن حقیقتاً مراد امت ہے۔

ماتقدم وماتاخر کا مفہوم | ماتقدم وماتاخر کا اسلوب بغرض احاطہ اختیار کیا گیا ہے جس کا مدعا عموم و وسعت ہے۔

عرب کہتے ہیں۔

اعطی من رای ومن لم یرہ جس کو دیکھا دیا جس کو نہیں دیکھا اس کو بھی دیا۔ یعنی ہر کس و ناکس کو دیا اس کا فیض عام ہے۔

ایک حماسی شاعر کہتا ہے۔

فیا عجبا للناس یستشرفوننی کان لم یروا بعدی محبا ولا قبلی

تعجب ہے مجھ پر لوگوں کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ گویا انھوں نے کبھی کسی عاشق کو دیکھا ہی نہیں

خاص طور سے محض وسعت و عموم پیدا کرنے کے لئے کان لم یرو بعدی حیا و لا قبلی کا اسلوب اختیار کیا ہے پچھلے اور اگلے زمانہ میں کسی کو دیکھنا مقصود نہیں ہے۔

آیت کی تاویل | اس تفصیل کی روشنی میں آیت کی تاویل یہ ہو گی۔

ہم نے تم کو فتح مبین سے سرفراز کیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ تمھارے لئے حج کی راہ باز ہو تا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اگلے اور پچھلے گناہ اس کی برکت سے بخش دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ خداوند قدوس نے فتح مکہ کو متقدمین اور متاخرین دونوں کے لئے ذریعہ مغفرت ٹھرایا اسلئے کہ اس فتح سے مسلمانوں کو حج کا موقع حاصل ہوا اور تقرب الی اللہ کی راہ باز ہوئی نیز خداوند تعالیٰ نے اسے اتمام نعمت کی آخری منزل قرار دیا جیسا کہ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلعم کی زبان مبارک سے اعلان فرمایا۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ	آج دین الہٰی کی تکمیل ہو گئی، اور تم پر میری نعمتیں
اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ	پوری ہوئیں تمھارے لئے میں نے اسلام
رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا	کو پسندیدہ ٹھرایا

آیت کا نظم | اب آیت کے نظم پر غور کیجئے سورۃ الفتح صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی چونکہ یہی صلح فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی اس لئے اسے فتح مبین سے تعبیر کیا کیونکہ فتح مکہ ہی حقیقت میں مسلمانوں کی قوت و شوکت اور روحانی برکات کے ظہور کا دیباچہ تھی۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ	(اے پیغمبر) جب خدا کی مدد آپہنچی اور (مکہ)
النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ	فتح (ہو گیا) اور تم نے لوگوں کو (بچشم خود)
اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	دیکھ لیا کہ دین خدا میں (اسلام میں) جوق جوق
وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا	داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی حمد و ثنا ... کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاؤ

. . . .

ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کا جتماعی وجود تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور نہ انھیں حج جیسے اہم فریضہ کے ادا کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ مکہ فتح ہو جانے کے بعد اُن کے لئے حصول سعادت اور تجدید عہد ایمان کی راہ کھل گئی۔ کیونکہ اب انھیں خانۂ کعبہ کی زیارت نصیب ہوگی جو دین الٰہی کی اصل و بنیاد ہے اور پہلا گھر ہے جو توحید اور غربا پروری کا مرکز ہوا چونکہ حج حصول سکینت اور روح ایمان کی تازگی کا ذریعہ ہے، اسلئے وہ مغفرت کا سبب ہے۔

مغفرت کے تمام وجوہ معلوم کرنے کے لئے مناسک حج پر تفصیلی بحث و نظر کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ اسکے لئے استاذ امام علامہ فراہیؒ کی تفسیر سورۂ کوثر دیکھنی چاہئے۔

احادیث میں حج کی یہ خصوصیت نہایت صاف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تابعوا بین الحج والعمرۃ فانھما ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید والذھب والفضۃ (ترمذی باب الحج)	آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ حج وعمرہ سے انسان کی گناہیں اور ناداریاں اس طرح دور ہوجاتی ہیں جس طرح بھٹی لوہے، چاندی اور سونے کی میل دور کر دیتی ہے۔
قال رسول اللہ "خرج کیوم ولدتہ امہ"	آنحضرت صلعم نے فرمایا جس نے حج کیا وہ گناہوں سے اتنا صاف ہوجاتا ہے جتنا اس دن تھا جس دن پیدا ہوا تھا

تفسیر سورۂ اخلاص (اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ قیمت ۵۔ منیجر

موعظۃ حسنۃ

ایمان بلا عمل

چودھری غلام احمد پرویز بی۔ اے ہوم ڈیپارٹمنٹ شملہ

دو تین برس ادھر، مجلہ معارف میں ایمان و عمل کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ترجمان القرآن میں ایمان بالرسالت کے عنوان سے ایک مضمون چند اقساط میں شائع ہوا۔ اس وقت میرے مخاطب وہ تجدد پسند، روشن خیال حضرات تھے جو مذہبی رواداری کے غلط، لیکن بزعم خویش دلفریب و خوش آئند جذبے کے ماتحت یہ سمجھتے ہیں کہ نجات و سعادت کے لئے محض عمل جوارح کافی ہے۔ ایمان، یعنی اعمال قلب، کی ضرورت نہیں۔ لیکن آج میرا تخاطب جدت پسند طبقہ سے نہیں بلکہ اس قدامت پسند طبقہ سے ہے جو حسن عقیدت کی بنا پر یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ چند مخصوص کلمات کا زبان سے ادا کر دینا، کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں، دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود کی کافی ضمانت ہے۔ ان کے نزدیک من قال لا اله الا الله، فدخل الجنۃ کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ زبان سے ان الفاظ کو دھرا دینے والا یقیناً نعمار جنت کا وارث ہوگا۔ پہلے طبقے (یعنی روشن خیال حضرات کا) دائرہ بہت محدود ہے۔ اور اپنے پیش کردہ نظریہ سے ان کا مقصد زیادہ تر اپنی وسعت نظر اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن موخر الذکر طبقہ میں آج کم و بیش تمام ملت اسلامیہ داخل ہے۔ جمہور کا بالعموم یہی عقیدہ ہے۔ ہر مسلمان کچھ اسی قسم کی خوش فہمی میں مگن ہے۔ اور جسقدر نقصان اس غلط عقیدے نے پہنچایا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔ آج مسلمانوں پر جسقدر غربت و افلاس، محتاجی و بیکسی طاری ہے۔ ذلت اور رسوائیوں کے جن عمیق گڑھوں میں یہ قوم گرتی جا رہی ہے۔ نکبت و فلاکت کی جو ہولناک گھٹائیں

ان پر چھائی جا رہی ہیں۔ ہلاکت و بربادی کے جو بے پناہ سیلاب ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں ذلّ و مسکنت کی جو شرر بار بجلیاں ان کے خرمنِ حمیت و غیرت، عزت و ناموس کو جلائے جا رہی ہیں۔ اگر ذرا بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو ان سب کا ذمہ دار یہی غلط عقیدہ ہے، جو گھن کی طرح ان کی جڑوں کو کھوکھلا کر گیا ہے اور ان کو دین و دنیا میں کہیں کا نہیں رکھا۔ بنی اسرائیل کی طرح ان کا بھی ایمان ہے کہ ہم خدا کے چہیتے بیٹے ہیں۔ یہ بھی ان کی طرح یہی سمجھتے ہیں کہ جنت ہمارے ہی لئے بنائی گئی ہے، خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کی اس مغضوب و معتوب قوم کی طرح یہ قوم بھی ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے عذاب الیم میں گرفتار ہے، پر نہیں سمجھتی۔ عاد و ثمود کی طرح بتدریج بربادیوں اور تباہیوں کے جہنم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے لیکن نہیں محسوس کرتی۔ قوم لوط اور اصحاب ایکہ کی طرح ان کی شوکت و عظمت کے تختے الٹ چکے ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن، فلک بوس عمارتیں کھنڈرات بن چکی ہیں۔ جو ہر صاحب بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فریب خوردہ قوم دل رکھتی ہے اور نہیں سمجھتی۔ آنکھیں رکھتی ہے اور نہیں دیکھتی۔ کان رکھتی ہے اور نہیں سنتی۔ زمانہ کے تھپیڑے اسے جھنجھوڑتے ہیں لیکن یہ انھیں خواب آور لوریاں سمجھ کر اور گہری نیند میں چلی جا رہی ہے دنیا علم و عمل میں ترقی کرتے کرتے آسمانوں کو چھو آنیکی ٹھانے بیٹھی ہے لیکن یہ کبھی کبھی چشم نیم باز سے انکی طرف دیکھتے ہیں۔ اور ایک حقارت آمیز تبسم سے اتنا کہکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں! اس چند روزہ متاع حیات سے فائدہ اٹھا لو۔ اس کے بعد دنیا میں بھی ہمیں غالب رہنے والے ہیں اور آخرت تو بالکل ہے ہی ہماری اپنی۔ پھر قیامت یہ ہے کہ یہ عقیدہ کچھ جہلا تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ان کے واعظ اور عالم روز بروز اس عقیدہ کو پختہ تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک جید "مولوی" صاحب اکثر وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانو! کون کہتا ہے کہ گناہ نہ کرو، خوب کرو۔ جی بھر کر کرو۔ لیکن ایک درود شریف اول، ایک درود شریف آخر پڑھ لو مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ۔ رحمت کے دو سمندر موجیں مارتے ہوئے

ان کو بہا کرلے جائیں گے۔ یہ اس قوم کے احبار و رہبان ہیں کے مواعظ حسنہ ہیں جن کے خدا کا فیصلہ ہے کہ

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ — جو ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کریگا۔ وہ اسکی جزا پائیگا

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ — اور جو ایک ذرہ کے برابر بھی برائی کریگا وہ اسکی سزا پائیگا

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالئے۔ نجات و سعادت، فلاح و بہبود کے لئے جہاں اٰمَنُوْا آیا ہے اسکے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے يُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَيَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ قرآن کے ایک حصے پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے کے جرم کے مرتکب قرار دئے جاتے ہیں تو دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے کہ:-

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ — کیا لوگ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہدینے سے

يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۔ — کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دئے جائینگے اور ان پر کوئی آزمائش

. . . . — نہیں ڈالی جائے گی۔

پھر دوسری جگہ ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا — کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے

يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ — حالانکہ اللہ نے ابھی تک ان لوگوں کو نہیں آزمایا کہ تم میں سے

وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ — کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے۔

کیا آپ نے سورہ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے تھے تو ان کے ایمان کی شناخت کے لئے کونسا معیار مقرر کیا گیا تھا۔ اگر آپ نے نہیں دیکھا تو اب دیکھ لیجئے۔ فرمایا۔

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ — ان سے کہدیجئے کہ ہاں کچھ کرکے دکھاؤ۔ تمہارے

وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔(۹:۱۰۵) اعمال کو خدا، اس کا رسول اور مومنین (خود) دیکھیں گے

اس سے بھی آگے بڑھئے۔سورۂ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اس شخص کو کچھ نفع پہنچے گا جو اس وقت عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اس شخص کو، اَوْ كَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا۔(۶:۱۵۹) جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہوگا۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ اور کن واضح الفاظ میں اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کیا جاسکتا تھا۔یاد رکھو جب ایمان کے ساتھ نیک اعمال شامل نہ ہوں گے، وہ ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا۔آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں اسواسطے کہ ہم ایمان واسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو علانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ ہم تو ایک مسلم کے اس کے اعمال کی وجہ سے دوست ہیں نہ کہ اسکے زبانی دعوؤں کی بنا پر۔

وَهُوَ وَلِیُّهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔(۶:۱۲۸) اللہ ان کا دوست ہے بوجہ ان کے اعمال کے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں برے اعمال کی سزائیں تجویز فرمائی ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم مومن و کافر میں کوئی تمیز، کوئی تفریق بھی کی ہے؟ اس نے صاف صاف کہدیا کہ جہنم سے بچنا۔

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا۔نہ اہل کتاب کی۔ جو بھی برا کام کریگا اس کی سزا پائے گا۔

کسے باشد ''جو بھی برائی کرے گا اور اس کے جرم اسے گھیر لیں گے، وہ جہنم میں جائے گا اور وہیں رہے گا۔''(۲:۸۱)، مثلاً حکم دیا جاتا ہے کہ اے ایمان والو۔سود نہ کھانا۔اللہ سے ڈرتے رہنا تاکہ تم تقویٰ کا شعار بن سکو۔لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو تو:۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ اس آگ سے ڈرو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ کے ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالئے۔خطاب یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے تھا۔ظاہر ہے

کہ ایک سود خوار ایمان کا مدعی ہے۔ اس کے دعویٰ اسلام میں کوئی کلام نہیں لیکن اس کے جرم کی سزا میں جب اسے جہنم رسید کیا جاتا ہے، تو وہ جہنم کوئی الگ نہیں وہی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے فرمائیے اس شخص کے دعویٰ ایمان نے اس میں کیا امتیاز پیدا کر دیا! اس سے بھی آگے بڑھئے! بدر کا میدان ہے مسلمانوں کی کل کائنات تین سو تیرہ نفوس۔ کچھ مہاجرین، کچھ انصار، گھربار، بیوی بچے، عزیز و اقارب، مال و دولت، سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پر سر لئے، خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ مسلمان ہیں کہ جن کی امداد کے لئے فرشتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں کہ جن کی مغفرت کی بشارتیں اس دنیا میں دی گئی ہیں۔ یہ وہ ایمان والے ہیں جنھیں اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہا گیا ہے۔ وہ ہیں جن کے ایمان، آنے والوں کے لئے بطور نمونہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ ہیں جن کے متعلق رسول خدا نے ابھی ابھی دعا میں فرمایا ہے کہ "اے اللہ یہ مٹھی بھر جماعت تیری نام لیوا، تیرے نام کی حفاظت کے لئے زمین پہ جان قربان کرنے کو آن کھڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔" فرمائیے! ان کے ایمان میں شبہ کرنے والے کا خود ٹھکانا کہاں ہے۔ لیکن اسی مقام پر ان کا خدا انسے کہتا ہے کہ میری مدد برحق۔ لیکن

"جو آج کے دن میدان جنگ سے منہ موڑ لے گا، سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے۔ یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر پہلو بدلے، تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور بری جگہ ہے رہنے کی۔" (۸:۱۱۶)

زبانی اقرار پر جنت میں جانے کے متمنی، ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشاد مقدسہ کو دیکھیں۔ جہاد تو عمل کی آخری منزل ہے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے، لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تھی، ان کے متعلق سنئے کہ کیا فیصلہ

"اور جو لوگ کہ ایمان لائے، لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی، تو جب تک یہ لوگ ہجرت نہ کر آئیں، ان کے ساتھ تمہارا (مسلمانوں کا) کوئی دوستانہ واسطہ نہیں ہوگا......" (۸:۷۲)

دیکھئے۔ ان لوگوں کے ایمان کی شہادت تو خود خدا دے رہا ہے کہ انھیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہکر پکارا ہے لیکن یہ صرف مدعی ایمان ہیں۔ اصلی مومن، سچے ایماندار، مُؤْمِنُوْنَ حَقًّا، تو صرف وہ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا	میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی۔ یہ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ	لوگ اصلی مومن ہیں۔ انہی کے لئے مغفرت اور
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸ : ۷۴)	انہی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

اور جو لوگ میدان عمل میں آنے سے ہچکچاتے ہیں، اللہ کا ارشاد ہے کہ ان کے دلوں پر مُہر کر دی گئی ہے (۹ : ۸۷)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ	لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے
جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	(اور) جہاد کیا اپنے اموال اور جانوں سے۔ یہی لوگ
وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ	ہیں جن کے لئے (سب) خوبیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ	جو کامیاب ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے ایسی جنات تیار کی ہیں
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ	جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں رہیں گے
فِيْهَا ۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۸۸-۸۹)	اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دیکھئے۔ سب خوبیاں، کامیابی و کامرانی کی تمام نعمتیں، دنیا کی سرخروئی اور عاقبت کے انعام، سب انہی کے لئے ہیں، جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اترتے ہیں۔

پھر یہی نہیں کہ آخرت کی فلاح و بہبود ہی عمل کے ساتھ متعلق ہو۔ اس دنیا کی عزت و وقار کی زندگی، خوشحالی و خوش بختی کی زندگی، سرفرازی و سربلندی کی زندگی، یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی زندگی ایک مسلم کی زندگی ہونی چاہئے۔ وہ بھی عمل ہی کے ساتھ مشروط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو مسلمانوں کو دنیا میں جگہ ہی اس لئے دی تھی کہ ان کے کام دیکھے، نہ زبانی دعوے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ — پھر ہم نے تمھیں دنیا میں حکومت دی، پہلی قوموں
مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰:۱۴) — کے بعد تا، ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اور اگر تم عمل کی دنیا میں پورے نہیں اترتے تو اسے تمھارے ایمان کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ تمھاری جگہ دوسری قوم کو تمھارا جانشین مقرر کر دے گا۔ وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا۔ (۹:۳۹) اس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ:۔

وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا — اُن سے پکار کر کہدیا جائے گا کہ یہ جنت ہے جس کے تم
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳:۷) — اپنے اعمال کے باعث، وارث قرار دئے جاتے ہو۔

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا ایسا ہی فیصلہ ہے کہ:۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ — اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو تم میں سے ایمان لائیں
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴:۵۵) — اور عمل صالح کریں تو اللہ انکو زمین کی بادشاہت عطا فرمائیگا

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں آپ کی ہستی قائم رہے تو ایمان محکم کے ساتھ عمل پیہم بھی پیدا کیجئے کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ — یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان
وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا — لائے۔ اور پھر اس سے (ایمان میں) ذرا جنبش نہ ہوئی
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ — اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے
أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ — انھوں نے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

ورنہ یاد رکھئے کہ خدا کے فیصلے۔ فطرت کی تعزیریں اٹل ہیں۔ غیر جانبدار ہیں۔ ہر چیز کی بقا عمل سے ہے۔ انسان کا تمامتر سرمایہ عمل ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ خدا ہی کا فیصلہ ہے۔ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور۔۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی،
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وہ قول، وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی، جس کی تصدیق آپکے قلوب اور جوارح نہیں کرتے، قرآن کی میزان میں ایک پرِ کاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ نہیں بلکہ ایسا زبانی دعویٰ ایک جرم عظیم ہے، گناہ کبیر ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کرکے نہ دکھاؤ

اور اگر خدا کی ان کھلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ یہی خیال کرتے جائیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوگئے ہیں۔ صبح اٹھتے وقت چہرے پر ہاتھ پھیرتے وقت زبان سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی نکل جاتا ہے۔ اسلئے آپ جنت کے وارث ضرور بن جائیں گے۔ اور ساری دنیا پر غلبہ بھی آپ ہی کا ہو جائیگا۔ اور محض اسلئے ہو جائیگا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں۔ تو یاد رکھئے کہ یہ سراسر دھوکا ہے فریب ہے اور یہ فریب خدا کے ساتھ نہیں، لوگوں کے ساتھ نہیں۔ بلکہ خود اپنے ساتھ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ۔ لیکن آپ اس کو سمجھتے نہیں ہیں یاد رکھو! دنیا میں آج جہد للبقاء (زندہ رہنے کی کشمکش) بڑی سخت ہوگئی ہے۔ قوموں میں باہمی منافست ہے، مقابلہ کی دوڑ ہے، جو قوم، جو ملک، جو شخص اس دوڑ میں کہیں پاؤں سے کانٹا نکالنے کیلئے بھی ٹھہر گیا، فنا ہو گیا۔ ہلاک ہوگیا، پیچھے سے آنیوالی قومیں اسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی نکل جائیں گی۔ اسی لئے قرآن حکیم نے فرمایا کہ قاعدین (بیٹھنے والے) اور مجاہدین (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون آپ پر نافذ نہیں ہوگا۔ اربابِ قضا و قدر آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری فلاح کے لئے کافی ہے۔ فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں ہے۔ اس نے اگر پہلی قوموں کو فنا کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی تھی، نہ اس لئے کہ انسے اسے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تو وہ آپکو اسلئے نہیں چھوڑ دیگی کہ آپ کی کوئی رعایت مقصود ہے۔ اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو قوم اس دنیا میں خدا کی غضب و عتاب سے ہلاک ہو جائے وہ آخرت میں جنت کی مالک ہو جائیگی۔ یہ خدا اور اسکی جنت کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔

ادبیات

غزل

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ

حسن فطرت کی آبرو مجھ سے ۔۔۔ آب و گل میں یہ رنگ و بو مجھ سے
میرے دم سے بنائے مینا نہ ۔۔۔ ہستی شیشہ و سبو مجھ سے
مجھ سے آتشکدوں میں سوز و گداز ۔۔۔ خانقاہوں میں ہائے و ہو مجھ سے
شبنم ناتواں سہی لیکن ۔۔۔ اس گلستاں میں ہے نمو مجھ سے
سیکھے اس نے بھی آپ کے انداز ۔۔۔ کھنچ رہی ہے رگ گلو مجھ سے
اک تگاپوئے دائمی ہے حیات ۔۔۔ کہہ رہی ہے یہ آبجو مجھ سے
طاقت بینش نظر بھی نہیں ۔۔۔ اب ہو کیا شرح آرزو مجھ سے
لن ترانی سنیں جناب کلیم ۔۔۔ کیجئے اور گفتگو مجھ سے

نہ رہا ذوق رنگ و بو مجھکو ۔۔۔ اب نہ چھیڑ اے بہار تو مجھکو
آپ اگر ہیں کہیں تو دیں آواز ۔۔۔ کیوں پھراتے ہیں کو بکو مجھکو
اب کسی اور کی تلاش نہیں ۔۔۔ ہے خود اپنی ہی جستجو مجھکو

نہ رہا کوئی تار دامن میں
اب نہیں حاجت رفو مجھکو

تلخیصات

"تکفیر کے متعلق اللہ والوں کا طریقہ"

از حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ

مولانا شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مدرسۃ الاصلاح اور متعلقین مدرسۃ الاصلاح کی تکفیر کا جو فتویٰ شائع ہوا ہے اس پر حکیم الامت مولانا تھانوی کے بھی دستخط ہیں۔ کاش اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے پہلے مولانا نے اپنا یہ مضمون ملاحظہ فرما لیا ہوتا۔ لیکن کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ اب بھی اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ (اڈیٹر)

....یہاں سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ یہ جو بعض لوگ تشدد کرتے ہیں کہ مسلمان کو کافر اور منافق کہدیتے ہیں یہ بڑی غلطی اور جرأت ہے۔ جب وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتا ہو اور آجکل کوئی وجہ اس بات کی رہی نہیں کہ نفاق کا وتیرہ اختیار کیا جاوے تو پھر کسی کو کافر اور منافق کہنے کے کیا معنی۔ کافر بڑا سخت لفظ ہے، بڑی احتیاط چاہئے۔ کافر کسی کو اس وقت کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ کوئی فعل ایسا کرتا ہو جو محتمل تاویل کو بھی نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص بت پرستی بلا اکراہ کھلم کھلا کرتا ہو تو اس وقت اس کو کافر کہہ سکتے ہیں اور جب ایک شخص بت پرستی سے نفرت رکھتا ہے زبان سے کلمہ پڑھتا ہے تو اس کی تکذیب کرنا اور کافر کہنا کیا معنی ظاہر بات ہے کہ کافر اصل میں تو اس کو کہتے ہیں جو دل سے منکر ہو حق تعالیٰ کا اور جو شخص زبان سے انکار کرتا ہے اس کو کافر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک وہ دل سے منکر ہے کیونکہ اس کی زبان سے انکار سنا گیا اور زبان ترجمان دل ہے تو کفر کا حکم اسواسطے لگایا گیا ہے کہ زبان کے ذریعہ سے اس کا انکار قلبی معلوم ہو گیا۔ غرض کسی کو کفر لسانی کی وجہ سے کافر کہنا بھی اصل کفر قلبی ہی کی وجہ سے ہے مگر چونکہ ہم کو انکار قلب کا علم ظاہر سے ہوتا ہے یعنی زبان سے اس واسطے زبان سے انکار

کرنے والے کو کافر کہتے ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ ہم حکم اسی بات پر لگا سکتے ہیں جو ظاہر ہو اور زبان سے کہی جائے
پس جب ایک شخص اسلام ظاہر کرتا ہے اس کو ہم کافر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ گو یہ اسلام
ظاہر کرتا ہے مگر ہم کو کسی اور ذریعہ سے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں کفر ہے سو وہ کونسا ذریعہ ہے؟
ہمارے پاس کوئی نہیں آتی جس سے دل کا حال معلوم ہو جائے اور نہ کسی صاحب وحی نے ہم کو تبلایا جیسا کہ حضرت
حذیفہؓ کو بتا دیا تھا۔ پھر دل پر حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ سخت غلطی ہے اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے
ہم نے آجکل یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے بس وہی اسلام ہے اور وہی ایمان ہے
جو اس کے خلاف ہو وہ کافر ہے یہ بہت سخت بات ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کو دیکھئے۔ صاحب مذہب تھے مجتہد تھے ان کا
یہ منصب تھا کہ ایک مسلک قرار دے لیتے ہم تو اس کے بھی اہل نہیں مگر ان کی احتیاط دیکھیے ان کے زمانہ
میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ لا
یدخل النار کافر یعنی کوئی کافر دوزخ میں نہیں جائیگا۔ آپ نے شاگردوں سے پوچھا سب نے اس شخص پر
کفر کا فتویٰ لگا دیا کیونکہ یہ لفظ صراحۃً خدا تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے قرآن شریف میں صاف آیا ہے
کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور یہ شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر دوزخ میں نہ جائیگا تو اس نے تکذیب کی
حق تعالیٰ کے قول کی اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر معنی تو یہی ہیں مگر اس میں کوئی
تاویل بھی ہو سکتی ہے یا نہیں لوگوں نے کہا ایسے صریح لفظ میں کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ فرمایا نہیں میرے نزدیک
ایک تاویل ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ دوزخ میں کوئی کافر نہیں جائیگا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دوزخ
میں جاتے وقت کوئی کافر نہ رہے گا کیونکہ قیامت میں کفار کو حق ظاہر ہو جائیگا اور یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہم غلطی پر تھے
جب اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی تو اس وقت انبیاء کی بھی تصدیق کریں گے اور جنت کی بھی اور نار کی بھی تو وہ
منکر نہ رہے تو اب یہ کہنا ٹھیک ہو گیا کہ دوزخ میں جو کوئی جائے گا وہ منکر اور کافر نہ ہوگا یعنی اس وقت تو اس
شخص نے کیا جھوٹ کہا پھر کفر کا فتویٰ کیوں لگایا جاوے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کا ایمان نفع نہ دیگا۔

کیونکہ قیامت دارالجزاء ہے دارالعمل نہیں ہے دارالعمل تو دنیا ہے دنیا کا کیا ہوا عمل کام دے سکتا ہو نہ کہ آخرت کا۔ علاوہ ازیں آخرت تو علم الیقین کا گھر ہے وہاں ہر شخص کو انکشاف حقائق ہو جائیگا۔ اور ایمان وہ کارآمد ہے جو بالغیب ہو۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لئے تو بھیجا ہے کہ بلا دیکھے ہوئے ان کی خبر پر اور ان کی کتاب پر یقین کر کے ایمان لایا جاوے۔ یہ ایمان مقبول ہے اور اگر تصدیق بالغیب مدار قبول ایمان نہ ہوتی تو حق تعالیٰ انبیاء کو کیوں بھیجتے یہیں انکشاف حقائق فرما دیتے تاکہ سب ایمان لے آتے تو جو شخص آخرت میں ایمان لایا اس نے انبیاء ؑ کی اور قرآن کی تصدیق نہیں کی بلکہ دیکھ کر ایمان لایا یہ ایمان بالغیب نہیں ہوا لہٰذا مقبول نہیں تو گو اس شخص کا ایمان کارآمد تو بے شک نہیں ہے لیکن ایمان تو ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص گو شرعاً کافر ہے مگر لغتہً کافر نہیں پس یہ جملہ تو صادق ہو گیا کہ وہ نار میں داخل ہوتے وقت بمعنی لغوی کافر اور منکر نہ ہو گا۔ سو لا یدخل النار کافر کہنے والے کو کیسے کافر کہتے ہو جبکہ اس کے قول میں یہ تاویل ہو سکتی ہے۔ دیکھئے امام صاحب نے کسقدر احتیاط کی حالانکہ ایسا صریح کلمہ کفر تھا مگر سلف نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ یہی حالت ہمارے اساتذہ اور مشائخ اور بزرگوں کی تھی کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ میں نے ایک حکایت ایک کتاب میں دیکھی اور اس کو دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور اس کا حکم فوراً ہی ذہن میں آیا کہ یہ شخص کافر ہو گیا اور فوراً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس گیا کہ دیکھئے حضرت اس شخص کے کفر میں کیا کلام ہے وہ حکایت یہ تھی کہ ایک شیخ نے اپنے ایک مرید سے پوچھا کہ تو خدا کو جانتا ہے اس نے کہا جی میں کیا جانوں خدا کو میں تو آپ کو جانتا ہوں یہ کسقدر بیہودہ کلمہ ہے یہ شخص خدا کا انکار کرتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیر کو سمجھتا ہے تو اس کے کفر میں کیا کلام ہے مولانا ہنسے اور کہا کیا اس لفظ کے کوئی صحیح معنی نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا حضرت اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں جب ایک شخص خدا ہی کے جاننے کا منکر ہے تو اس کا ایمان کہاں فرمانے لگے اچھا تم جانتے ہو خدا کو؟ بس اب تو ہوش درست ہوئے۔ کہنے لگے بھائی خدا کو جاننا تو بڑا مشکل ہے وہ کون شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ میں خدا کو جانتا ہوں۔ یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں تمام فلاسفہ گمراہ ہوئے اور یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں ہزاروں اب بھی

گمراہ موجود ہیں جو حق پر ہیں وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ کو اجمالاً کچھ پہچانتے ہیں باقی جس کا
اور جاننا اور پہچاننا ہے اس کی توخیر صلاح ہے یہی بات تو وہ شخص بھی کہتا ہے کہ میں خدا کو کیا جانوں
تم کو جانوں یعنی خدا کا راستہ بتلانے والے کو۔ تو وہ کیا بیچا کہتا ہے پھر بیچارے کو کافر کیوں بناتے
مولانا نے ایک تاویل بعید کر کے اس کو بچا لیا۔ اہل حق کا طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان جب تک کوئی بھی
بن سکے کسی کو کافر نہ بنا دیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی تاویل کو بھی رد کرے تو مجبوری ہے کہ اب مدعی سست
اور گواہ چست کا قصہ ہے باقی اپنی طرف سے کبھی کسی کو کافر نہیں بناتے اور جہاں کہیں بضرورت
انھوں نے کسی کو کافر کہدیا ہے بعض جہلا اس پر بھی طعن کرتے ہیں کہ لوگوں کو کافر بناتے ہیں میں اس
متعلق بطور لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ انھوں نے کافر بنایا نہیں بلکہ کافر بتا دیا ہے (دونوں میں ایک نقطہ کا فرق
اس شخص نے واقعی ایسا ہی کام کیا ہے جس پر کفر عائد ہوتا ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں بن سکتی تو وہ کافر تو خود بن
انھوں نے صرف بتا دیا ہے کہ اس پر کفر عائد ہوتا ہے اور اس بتانے میں بھی اتنی احتیاط کی ہے کہ بعید سے بعید
تاویل بھی اٹھا نہیں رکھی۔ جب کوئی تاویل بھی نہ بن سکی تب انھوں نے یہ لفظ منہ سے نکالا اور ان کی کوئی
ذاتی غرض یا غیظ و غضب یا بات کی پچ اس میں شامل نہیں ہوتی بلکہ خوف خدا اور ترحم شامل ہوتا ہے کافر
کے لفظ سے وہ کانپتے ہیں اور کسی کے لئے بھی اس کے استعمال کو حتی الامکان گوارا نہیں کرتے۔ اور واقعی یہ
لفظ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کے معنی ہیں ابدالآباد کے لئے رحمت خدا سے بالکل ناامید و محروم ہو جانے والا
سو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ارحم الراحمین کی رحمت سے کسی کو ایسا ناامید کر دیا جاوے۔ ان کی نظر میں دنیا کوئی
چیز نہیں۔ ان کی نظر تو آخرت پر رہتی ہے۔ چنانچہ جس وقت وہ کسی گنہگار کو دیکھتے ہیں اور یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص
ایک گناہ میں مبتلا ہے اور آخرت میں اس کے لئے بڑی مصیبت ہوگی تو ان کو رحم آجاتا ہے خواہ ان کا دشمن
ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے کتنی ہی تکلیفیں ان کو کیوں نہ پہنچی ہوں ان کے پیش نظر ہر وقت آخرت
رہتی ہے وہاں کی راحت کو راحت اور وہاں کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں۔ دنیا کی راحت ہوئی تو کیا اور

تکلیف ہوئی تو کیا مگر وہاں کی تکلیف کسی کیلئے گوارا نہیں کرتے اور وہاں کی تکلیف گناہوں پر مبنی ہیں اسوجہ سے ادنیٰ سا گناہ بھی کسی کے ذمہ لگانا پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ کفر، کیونکہ کفر کسی کے لئے ثابت کر دینے کے تو یہی معنی ہیں کہ اس کو ابدالآباد کے لئے رحمت خداوندی سے مایوس اور محروم بنا دیا جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کی تکالیف اور عذاب اس کے لئے ثابت ہو جائیں۔ یہ ان سے کب ہو سکتا ہے۔ ان کا تو اگر اختیار ہو تو مسلمان کو تو کافر کہنا درکنار کافر کو بھی کافر نہ رہنے دیں۔ غرض کفر بہت بڑا حکم ہے اس کا نام بھی ان کی زبان پر آنا مشکل ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی خود ہی کافر بننا اور رحمت الٰہی سے خارج ہونا چاہے یہ اسوقت بھی دل سے چاہتے ہیں کہ یہ کافر نہ بنے مگر جب وہ خود ہی بننا چاہتا ہے تو کسی کا کیا بس ہے حکم شرعی کو یہ بدل نہیں سکتے بدرجہ مجبوری فتویٰ دیدیں گے تو اسوقت انھوں نے کافر نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی کافر بنا انھوں نے صرف بتلا دیا ہے کہ یہ کفر ہو گیا انھوں نے بالکل ہی مضطر ہو کر یہ فتویٰ دیا اگر بعید سے بعید بھی تاویل ان کو مل جاوے تو اس حکم کفر سے بچا دیتے ہیں الحمد للہ ہمارا بھی طریقہ رہا ہے۔ میرے پاس بہت فتوے آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کلمہ کہا اس سے کفر عائد ہوا یا نہیں میں اکثر یہ جواب دے دیتا ہوں کہ یہ کلمہ گستاخی کا ہے یہ شخص بہت بے ادب ہے اس نے بڑا گناہ کیا مگر کفر نہیں کفر کا نام لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی کو کافر کہنا حق تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نکال دینا ہے اور رحمت حق تعالیٰ کی اسقدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا پتہ اس حدیث سے چلتا ہے بڑی عبرت کی حدیث ہے اور وہ مشہور حدیث شفاعت کی ہے اس سے ہم لوگوں کو سبق لینا چاہئے اور ذرا زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا چاہئے وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت کی اجازت ہو گی تو سب علیٰ قدر مراتب شفاعت کریں گے، انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور امتی بھی۔ جب سب کی شفاعت ختم ہو جاوے گی تو حق تعالیٰ فرماویں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے اب ارحم الراحمین باقی ہیں۔ یہ فرما کر دو ہتڑ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کر دیں گے۔

(اللہ میاں کی دو ہتڑ خدا جانے کتنی ہو گی اس سے یہاں بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ متشابہات میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ مراد ہو حق ہے۔) یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے ان دوزخیوں کو جہنم

ست نکالیں گئے جنکو نہ شفاعت والوں کی پہنچی نہ ملائکہ کی نہ انبیاء علیہم السلام کی اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے
اخرجوا من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان یعنی انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کو یہ حکم ہوگا
کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکال لو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو۔ ان دونوں کے ملانے سے صاف
یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے
کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر۔ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسی ہوگی کیونکہ کافر کی مغفرت
ممتنع ہے اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنے والے نے مومنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت
نہیں کی جبکہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے ان کو بھی نکال لیا جاوے اس اشکال
کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہوسکتی بلکہ وہ مومن ہی ہوں گے لیکن
ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اسقدر مخفی ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہیں آئیگا حالانکہ حق تعالیٰ نے
ان کو علم کامل عطا فرمایا ہے خصوصاً آخرت میں کہ وہ تو مقام ہی ہے انکشاف وحقائق کا مگر اس پر بھی ان حضرات
کو پتہ نہ چلا اتنا ذرا سا ایمان تھا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو علم نہ ہوگا۔ غرض یہ لوگ حقیقت میں ہوں گے مومن
ہی لیکن ان کا ایمان اسقدر دھندلا ہوگا کہ انتہا درجہ کی تیز چشم بصیرت کے بھی ادراک میں نہ آئیگا اس سے ثابت
ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا پتہ چلنا مشکل ہے پھر مولویوں کو تو کیسے
پتہ چل جاویگا اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں اس لئے بات بات میں کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہو سکتا
ہے۔ یہ تو حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ کرنا ہے اس موقع پر اس اعرابی کا قصہ یاد کیجئے جس نے یہ دعا کی تھی اللھم
ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدا قصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک اعرابی
مسجد نبوی میں آیا اور نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا کی۔ کیا مزے کی دعا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے اللہ میرے اوپر
رحم کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کرنا اور ہم دونوں کے سوا کسی اور پر رحم مت کرنا یہ بھی خوشامد تھی حضور کی کہ

آپ کو شامل کر لیا ورنہ شاید وہ یہی چاہتا ہو کہ ساری رحمت حق تعالیٰ کی مجھ ہی کو مل جاوے۔ خیر جس طرح بھی ہو اس نے آپ کو تو دعا میں شریک کر لیا۔ حضور نے اس کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا لقد تحجرت واسعًا یعنی تو نے ایک بہت بڑی چیز کو تنگ کر دیا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت میں کچھ کمی تھوڑا ہی تھی جو تو نے دو ہی آدمیوں پر منحصر کر دیا اللہ تعالیٰ کی رحمت تو وہ ہے کہ تمام دنیا کو محیط ہو جاوے اور پھر بھی ختم نہ ہو۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ اس قصہ کو سنکر تعجب کریں گے کہ وہ شخص کیسا گنوار تھا کہ ایسی دعا کی کہ بس ساری رحمت دو ہی شخصوں کے حصہ میں آجاوے۔ میں کہتا ہوں اس کو تو گنوار کہا جاتا ہے لیکن اپنی اس حالت پر تو نظر ڈالئے جو آجکل تعلیم یافتہ جماعت اور اہل علم کی ہو رہی ہے ان کا طرز عمل دیکھئے کہ انھوں نے بس اپنا ایک مسلک قرار دے لیا ہے اور جو اس سے ذرا خلاف ہوا اسی کو رحمت حق سے خارج کر دیا کیا یہ وہی اعرابی والی حالت نہیں ہے مگر اپنا عیب نظر نہیں آتا ورنہ حالت تو ان تعلیم یافتوں کی بھی اس اعرابی کی سی ہے جس نے رحمت کو تنگ کیا تھا ویسے ہی انھوں نے تنگ کر رکھا ہے آخر کیا فرق ہے دونوں میں اس نے دو ہی پر منحصر کیا تھا اور یہ دس بیس سو پچاس یا ہزار دو ہزار پر منحصر کرتے ہیں اس میں تو دونوں شریک ہیں کہ یہ واسع کو تنگ کرتے ہیں تو اس کو گنوار کہنا اور اپنے اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے بلکہ اس کی حالت اہون تھی کہ دلائل کا علم نہ ہونے سے اس نے ایسا خیال کیا تھا اور یہاں بینات کے بعد یہ طرز ہے بہرحال حضرت، حق تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی چیز ہے کسی کو اپنے تخصیص رحمت کا زعم و دعویٰ نہیں چاہئے ابوداؤد کی حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد اور ایک فاسق تھا۔ عابد تو دن رات عبادت میں رہتا اور یہ دن رات گناہ اور فسق وفجور میں رہتا تھا وہ عابد اس کو نصیحت کیا کرتا تھا کہ تو یہ حرکتیں چھوڑ دے اس نے کہا کہ میاں تم اپنے کام میں لگو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں جانوں میرا خدا جانے۔ غرض ایسا فاسق تھا کہ نصیحت سے بھی باز نہ آتا تھا ایک روز عابد نے اس کو کسی بدعمل میں دیکھا تو غصہ میں آکر کہا کہ تجھے خدا تعالیٰ ہرگز نہیں بخشے گا۔ یہ دعویٰ کا لفظ تھا اس کے بعد دونوں کی موت آگئی حکم ہوا کہ عابد کو دوزخ میں لیجاؤ

اور فاسق کو جنت میں لیجاؤ اور عابد سے کہا گیا کہ کیا میری رحمت تیرے اختیار میں تھی جو تو نے میرے بندہ پر قطعی حکم
لگا دیا کہ تجھکو خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشیگا اب ہم تجھکو دوزخ میں لیجاتے ہیں اور اس کو جنت میں اگر تجھ سے ہو سکے
تو روک لے۔ یاد رکھو جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہو یعنی زبان سے مسلمان ہونیکا اقرار کرتا ہو وہ اسوقت تک
کافر نہیں ہوتا جب تک کسی ایسی بات کا انکار نہ کرے جو ضروریات دین میں سے ہے مثلاً نماز کے فرض
ہونیکا انکار کرے یا روزہ کی فرضیت کا انکار کرے یا اور جو چیزیں ضروریات دین سے ہیں ان میں کسی کا انکار
کرے تب تو البتہ اسلام سے خروج ہوتا ہے اور جو ضروریات کا انکار نہ کرے ہاں عمل میں سستی کرتا ہو تو وہ
گنہگار ہے۔ اس پر ایسا سخت حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ بالکل اسلام سے خارج ہوگیا اور ابدالآباد کے لئے حق تعالےٰ
کی رحمت سے مایوس ہوگیا۔ آخر کفر سے پہلے گناہ کا مرتبہ بھی تو ہے اور اس میں دو درجے ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ اہل
حق کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے بھی خروج عن الاسلام نہیں ہوتا اور اس پر خلود فی النار نہوگا اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ
شفاعت اہل کبائر کو پہونچیگی بڑے سے بڑا کبیرہ بھی اگر کوئی کرے اور ساری عمر کرتا رہے اور کبھی اسپر نادم بھی نہ ہو
نہ توبہ کرے اور مرتے وقت بھی توبہ نصیب نہ ہو تب بھی اہل حق کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کو خلود فی النار نہوگا چاہے
اس کو ہزار برس تک دوزخ میں رہنا پڑے اور گناہوں کی سزا میں چاہے کیسا ہی سخت سے سخت عذاب
بھگتنا پڑے مگر کبھی نہ کبھی دوزخ میں سے ضرور نکال لیا جاویگا۔ یہ بھی اس صورت میں ہے جبکہ فرض کرلیا
جاوے کہ اس کو کسی کی شفاعت بھی نہ پہنچے گی اور کوئی ذریعہ مغفرت کا شفاعت کے علاوہ بھی اس کو نصیب نہوگا
حالانکہ ایسا ہوگا نہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے شفاعتی لاھل الکبائر من امتی یعنی فرماتے ہیں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ والوں کو بھی پہنچے گی اور اس کے سوا اور بھی ذرائع
مغفرت کے ہیں مثلاً کسی نے اس کے مرنے کے بعد دنیا میں اس کے لئے دعا کی ہو اور وہ دعا قبول ہوگئی
ہو۔ یہ ایسی چیز ہے کہ گو ساری عمر وہ شخص کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا رہا ہو لیکن ایک اللہ کے بندہ کی دعا
اس کو پہنچ گئی تو حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے اگر خدا تعالیٰ اس دعا سے اس شخص کے گناہ معاف کردیں

تو خدا تعالیٰ کو کون روک سکتا ہے۔ غرض ایسے ذرائع بہت ہیں جن سے بڑے سے بڑے گناہ معاف ہو سکتے ہیں ایک کفر و شرک تو ایسی چیز ہے کہ اس کے معاف ہونیکا کوئی ذریعہ نہیں اور اس کے سوا چاہے کسی شخص میں دنیا بھر کے گناہ مجتمع ہوں مگر سب ایک لمحہ میں معاف ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے اور قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشاء یعنی حق تعالیٰ نہیں بخشیں گے اس کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جاوے اور اس کے سوا جو بھی گناہ ہو بخشدینگے جس کے واسطے چاہیں گے اور اس مضمون میں بہت سی احادیث بالکل صریح موجود ہیں۔ غرض بڑے سے بڑے کبیرہ کا کرنیوالا بھی حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کو اتنا وسیع کیا ہے تو کسی دوسرے کو اس کے تنگ کرنیکا کیا مجاز ہے۔

پھر اول تو گناہوں کے معاف ہونے کے بہت سے ذرائع ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی ذریعہ بھی ایک شخص کو حاصل نہ ہوا اور وہ گناہ اس کے ذمہ رہ گیا تب بھی خلود فی النار نہ ہوگا۔ یہ بھی ان گناہوں میں ہے جو یقیناً گناہ ہیں جن کے گناہ ہونے میں کسی کو کلام ہی نہیں اور جن کے گناہ ہونے میں کلام ہے اس پر تو اس سزا کو بھی یقینی نہیں کہہ سکتے جو اس پر موعود ہے اس صورت میں گنہگار ہونیکا فتویٰ بھی نہیں لگ سکتا چہ جائیکہ کفر کا۔ چنانچہ آجکل جن مسائل میں اختلاف ہے ان میں اکثر جانبین میں گنجائش ہے تو کوئی فریق اپنے مقابل پر کوئی حکم قطعی کیسے لگا سکتا ہے اور حکم بھی کونسا کفر کا۔ لطف یہ ہے کہ ان مسائل میں اختلاف کفر اور عدم کفر کا ہے ہی نہیں بس جو کچھ اختلاف ہے وہ سنت اور بدعت ہونیکا ہے کہ ایک فریق ایک فعل کو سنت اور باعث تقرب کہتا ہے اور دوسرا اس کو بدعت اور معصیت کہتا ہے تو ابھی تو خود معصیت اور عدم معصیت ہی میں اختلاف ہے کفر اور عدم کفر کا کیا ذکر اگر سنت کہنے والوں نے بہت زور مارا اور اس فعل کو سنت اور اس کے خلاف کو بدعت ثابت کر ہی دیا تب بھی سنت کے تارک پر اس سے زیادہ کیا حکم لگ سکتا ہے کہ وہ ایک سنت کا تارک ہے اور سنت کے ترک پر خلود فی النار کی وعید کہاں آئی ہے اگر سنت کے ترک پر بھی خلود فی النار

کی وعید ہے تو کفر اور شرک پر اس سے زیادہ کونسی وعید ہوگی تارک سنت اور کافر کو برابر کر دینا معلوم کہاں تک صحیح ہے۔ آخر اعمال میں باہم فرق مراتب بھی ہے یا نہیں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کے ترک پر وہی حکم مرتب ہوتا ہے جو اعلیٰ گناہ پر ہوتا ہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ نیک عمل کرنے پر بھی وہی حکم مرتب ہونا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نیک عمل کرنے پر ہوتا ہے سب سے اعلیٰ عمل اسلام ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں تو اگر یہ بات تسلیم ہے کہ ادنیٰ اور اعلیٰ میں کچھ فرق مراتب نہیں تو ایک ادنیٰ عمل کسی میں فرض کیا جائے مثلاً نرمی سے بولنا کہ یہ بھی کسی درجہ میں نیک عمل ضرور ہے اسکو سب جانتے ہیں تو فرض کیجئے کہ ایک کافر یہ عمل کرتا ہے یعنی وہ ہمیشہ نرمی سے بولتا ہے تو چاہیئے کہ وہ مسلمان کے برابر ہو جائے۔ اس قاعدہ کی رو سے تو اسلام کی بھی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ ادنیٰ عمل والا اور یہ اعلیٰ عمل والا دونوں حکماً برابر ہیں اس سے تو سارا دین کا کارخانہ ہی بگڑا جاتا ہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اعمال میں فرق مراتب ہے پھر تارک سنت کو اور کافر کو برابر کیسے کیا جا سکتا ہے اور دونوں کے واسطے خلود فی النار کا حکم کیسے لگا دیا جاتا ہے۔ ضرور ہے کہ دونوں میں فرق کیا جائے انشاء اللہ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہر بات پہ کفر کا حکم لگا دینا عقل و شریعت کی رو سے کہاں تک صحیح ہے اور یہ بھی اسوقت ہے جبکہ کسی فعل کی نسبت سنیت کا دعویٰ کرنیوالا اپنے دعوے کو ثابت کر دے اور ثابت کر دینے کے بعد بھی اس کے تارک پر وہ ترک سنت کا حکم جاری کر سکتا ہے نہ کہ کفر اور شرک کا جیسا کہ آجکل لوگوں نے عادت کر لی ہے ذرا اس غلطی کو غور سے دیکھئے۔ سلف نے اس میں بڑی احتیاط کی ہے خصوصاً امام ابوحنیفہؒ نے کہ انھوں نے کسی اسلامی فرقہ کو جب تک وہ ضروریات دین کا منکر نہ ہو کافر نہیں کہا اور قاعدہ مقرر کر دیا ہے لا نکفر اهل القبلة حالانکہ اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات اسقدر ہیں کہ ان کے سننے سے وحشت ہوتی ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ مسلمانوں میں ۷۳ فرقے ہیں اور ایک کو ان میں سے ناجی کہتے ہیں اور ۷۲ کو ناری اور یہ کچھ لوگوں کا اختراع نہیں ہے بلکہ حدیث کا مضمون ہے مگر لوگ یاد رکھیں (طالب علموں کی کام کی بات ہے) کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے آیا اس سے کفار اور مسلمانوں کو ملا کر مجموعہ کے فرقے مراد ہیں یا کیا۔ ظاہر ہے کہ مجموعہ اہل اسلام اور کفار کے فرقے تو مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ تو اس سے بہت زیادہ ہیں ہر مذہب میں اس سے زیادہ فرقے موجود ہیں ہندوؤں میں ۷۳ سے بہت زیادہ فرقے ہیں عیسائیوں میں بھی زیادہ ہیں

توسب ملاکر تو بہت ہی زیادہ ہوں گے۔ بلکہ حدیث میں اسلامی فرقے مراد ہیں تو یہ سب ۷۲ فرقے وہ ہوئے جنکو اسلام سے خارج نہیں کہہ سکتے تو ان کے لئے خلود فی النار کے قائل بھی نہیں ہو سکتے۔ اور ایک مضمون یہ بھی ذہن میں حاضر رکھئے کہ قرآن اور حدیث سب میں یہ مضمون موجود ہے کہ گناہوں پر سزا ہوگی اور دخول فی النار ہوگا مثلاً چور کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور زانی کو بھی اور قاتل کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور تارک صلوٰۃ اور تارک زکوٰۃ کو بھی وغیرہ وغیرہ تو جو ایک فرقہ ناجی ہے اس کے افراد بھی اگر ان اعمال معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ دوزخ میں جائیں گے یا نہیں ظاہر ہے ان اعمال کی سزا میں ان کی دوزخ میں جائینگے گو خلود فی النار نہو اور اوپر یہ بھی ثابت ہو چکا کہ فرقہ ناجیہ کے علاوہ جو ۷۲ فرقے ہیں وہ سب اسلامی فرقے ہیں۔ خلود فی النار ان کے لئے بھی نہیں ہے تو یہ بھی دوزخ میں جائیں گے اور وہ ایک فرقہ بھی جائےگا جسکو ناجی کہا گیا تھا، تو پھر حدیث کے اس جزء کے کیا معنی ہوئے کلھم فی النار الا واحدۃ جب دوزخ میں جانے میں دونوں برابر ہوئے تو ایک کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کے کیا معنی۔ اس شبہہ کا حل یہ ہے کہ ۷۲ فرقوں کو جو ناری کہا گیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فساد عقائد کی وجہ سے بھی دوزخ میں جائینگے اور فساد اعمال کی وجہ سے بھی اور وہ ایک فرقہ جس کو ناجی کہا گیا ہے وہ صرف خرابی اعمال کیوجہ سے دوزخ میں جائیگا خرابی عقائد کیوجہ سے نہ جائیگا اور دونوں کے دخول نار میں تو اعدی اتنا فرق ہوگا کہ عقائد کی غلطی اشد ہے اعمال کی غلطی سے لہذا عقائد کی غلطی پر عذاب بھی سخت ہوگا اور اس کی مدت بھی زیادہ ہوگی بخلاف اس ایک فرقہ کے جو خرابی اعمال کی وجہ سے دوزخ میں جائیگا ان کی غلطی اتنی سخت نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کی تھی لہذا عذاب بھی اتنا سخت نہوگا اور نہ اتنا ممتد ہوگا۔ حاصل یہ کہ ۷۲ فرقوں سے مراد مسلمانوں ہی کے فرقے مراد ہیں ان میں سے ایک فرقہ اہل حق ہے وہ خرابی عقائد کی وجہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ ہاں خرابی اعمال کیوجہ سے جائیں گے۔ جیسے چوری، نظر بد وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ان اعمال پر بھی عذاب موعود ہے آخر وہ کس کے واسطے ہے۔ پس جو کوئی انکا ارتکاب کریگا اسی کو عذاب بھگتنا پڑے گا اور گو بمقتضائے قواعد یہ عذاب بہ نسبت اہل باطل کے خفیف ہے اور ممتد بھی کم ہے۔ مگر خدا بچاوے وہاں کا تو ایک دن بھی دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے پھر بلحاظ کیفیت کے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ اسکی نظیر ہی کہیں موجود نہیں۔ ایک

منٹ کیلئے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ دنیا کا عذاب سو برس کا بھی اسکے برابر نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی یہ صحیح ہے کہ اہل باطل کے عذاب سے یہ عذاب ہلکا ہے اور اہل باطل کو عذاب بہت زیادہ ہوگا لیکن خلود ان کو بھی نہوگا آخر میں کبھی کبھی سزا پاکر نجات پاجائیں گے کیونکہ مومن تو وہ بھی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا اور دیکھئے قرآن میں یہ حکم ہے فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ یعنی جو کوئی ایک ذرہ کے برابر بھی عمل خیر کریگا تو اسکو قیامت کے دن دیکھے گا یعنی اسکا نتیجہ پائیگا اور سب جانتے ہیں کہ ایمان عمل خیر ہے (خیر کیا راس الخیرات ہے) تو آیت کے بموجب ضرور ہوا کہ اس خیر کا نتیجہ ان کو ملے اور اس کے ساتھ بہت سے اعمال شر بھی یعنی عقائد باطلہ بھی موجود ہیں تو ان کا نتیجہ پانا بھی ضروری ہے۔ تو دونوں کے نتیجے ان کو دیکھنا ہیں عذاب بھی اور ثواب بھی۔ تو اب دو احتمال ہیں ایک یہ کہ پہلے ان کو ثواب دیا جائے یعنی جنت میں داخل کئے جائیں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے عذاب دیا جائے مگر یہ صورت نص کے خلاف ہے یہ کسی کیواسطے نہیں ہوگا کہ جنت میں جانے کے بعد نکالا جائے تو اب دوسرا ہی احتمال متعین ہوگیا وہ یہ کہ ان کو اول عذاب دیا جائیگا اور جو وقت سزا کے لئے خدا تعالیٰ کے علم میں مناسب ہو چکا ہے وہ ہزاروں برس کیوں نہوں اس کے گذرنے کے بعد ثواب دیا جائے اور جنت میں داخل کئے جائیں پھر جنت میں خلود ہوگا۔

اس تمام تقریر سے آپنے اندازہ کرلیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کسقدر وسیع ہے کہ جس میں ذرا سا بھی ایمان ہے اس کے لئے خلود نہیں ہے پھر کسی کی نسبت بات بات پر کفر کا حکم لگا دینا جس کے واسطے خلود لازم ہو کیسے درست ہوگا کیا جو لوگ آپ کے مشرب پر نہیں ہیں ان میں ذرا سا بھی ایمان نہیں ہے۔ کچھ تو انصاف کیجئے ایسا جوش نہیں چاہئے اس کی بنا سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ آپ نے اپنا ایک مسلک قرار دے لیا اور سمجھ لیا کہ بس ہم ہی ہیں مومن اور جو کوئی اس کے ذرا بھی خلاف ہو وہ ایمان سے خارج ہے اور جنت اس کے حصہ میں نہیں آسکتی بس گویا جنت ان کی ملک ہے کہ جسکو یہ دیں اسی کو ملیگی جسکو نہ دیں اس کو نہ ملے گی یہ طریقہ غلط ہے۔

(ماخوذ از الاسلام الحقیقی مندرجہ رسالہ المبلغ بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ)

جلد ۱ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۶ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

مدرسۃ الاصلاح اور علامہ شبلیؒ و علامہ حمید الدین فراہیؒ	امین احسن اصلاحی	۱-۸

باب التفسیر

تفسیر سورۃ الکافرون	مصنفہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۹-۱۸

معارف قرآن

تیسیر قرآن (۲)	امین احسن اصلاحی	۱۹-۲۴

مقالات

مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم پر غوغائے تکفیر	حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی	۲۵-۲۸
علامہ شبلیؒ نعمانی پر فتوائے تکفیر	جناب مولوی بدر الدین صاحب اصلاحی	۲۹-۵۴

ادبیات

غزل	جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے	۵۵
فتنۂ تکفیر	. . . .	۵۶-۶۱
تقریظ و تبصرہ	ا ۔ ل	۶۲-۶۴

مدرسۃ الاصلاح

اور

علامہ شبلی نعمانی و علامہ فراہی رحمہما اللہ

از امین احسن اصلاحی

مدرسۃ الاصلاح کے متعلق، مخالفوں نے لوگوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ اور چونکہ مدرسہ کی طرف سے کبھی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی، اسلئے بعض طبیعتیں ان سے متاثر ہو گئی ہیں۔ آج ہم بغیر کسی تمہید اور آرائش بیان کے چند ضروری باتیں لکھتے ہیں، امید ہے۔ لوگ مدرسہ کی نسبت رائے قائم کرنے میں، ان باتوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔

مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی (رحمہما اللہ) کی تصنیفات میں سے کسی ایک تصنیف کا حق طبع و اشاعت بھی مدرسہ کو حاصل نہیں ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ کی تمام تصنیفات دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے اہتمام سے چھپتی اور شائع ہوتی ہیں اور مولانا حمید الدینؒ کی کتابوں کا حق طبع و اشاعت دائرہ حمیدیہ کو حاصل ہے جو مدرسہ سے بالکل علیحدہ شعبہ ہے۔ الاصلاح دائرہ کا ارگن ہے۔ مدرسہ کا ارگن نہیں ہے۔ مدرسہ کا صرف خادم ہے۔ اس امر کا اعلان، نہایت واضح لفظوں میں، الاصلاح کے پہلے پرچہ میں کر دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ دار المصنفین، دائرہ حمیدیہ، اور مدرسۃ الاصلاح کو بالکل ایک چیز سمجھ لیا جائے اور ایک کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جائے لیکن تعجب ہے کہ ہمارے مخالفین نے اس واضح بات کا لحاظ کبھی نہیں رکھا۔ آج ۲۲ برس سے وہ الکلام اور علم الکلام بغلوں میں دبائے ہوئے گاؤں گاؤں پھر رہے تھے اور انکے مسائل بالکل مسخ کر کے، جس طرح انھوں نے استفتاء میں مسخ کیا ہے، سادہ لوح عوام میں

مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور کارکنوں کے خلاف نہ جانے کیا کیا بدگمانیاں پھیلاتے رہے۔ گویا الکلام اور علم الکلام کی تصنیف واشاعت کی تمام ذمہ داری مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ اور کارکنوں ہی کے سر ہے اور وہ انہی دونوں کتابوں کو قرآن مجید کی جگہ اپنا صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں۔

ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کوئی کتاب حمایت کفر میں نہیں لکھی۔ جو کچھ لکھا ہے یا تو علم کی خدمت کے لئے لکھا ہے یا مذہب کی خدمت کے لئے۔ وہ نہایت صحیح العقیدہ اور قابل مصنف تھے لیکن صرف مصنف تھے، معصوم نہ تھے۔ ان کی رایوں میں بہت سی کمزوریاں ہوسکتی ہیں، ان کی تحقیقات غلط ہوسکتی ہیں، ان کے نظریات باطل ہوسکتے ہیں۔ اسلئے ہم ان کی کتابوں کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے دنیا کے تمام محققین کی کتابوں کو دیکھتے ہیں، جو باتیں ٹھیک معلوم ہوتی ہیں، قبول کر لیتے ہیں جو کمزور نظر آتی ہیں رد کر دیتے ہیں۔ تقلید اعمیٰ اور شخصیت پرستی ہمارے یہاں نہیں ہے۔ ہم نے پیروی کے لئے صرف ایک ہی اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھا ہے اور وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہے۔ جو شخص اسکے خلاف بیان کرتا ہے وہ ہم پر تہمت لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے۔

ہمارا یہی معاملہ مولانا حمید الدین فراہی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تصنیفات کے ساتھ ہے۔ ان کا علم و تبحر مسلم، ان کا درجۂ اجتہاد اور رتبۂ امامت مسلم، ان کا زہد و تقویٰ بھی مسلم۔ لیکن ان کے معصوم ہونے کے ہم قائل نہیں ہیں۔ انکی تصنیفات میں وہ تمام کمزوریاں ہوسکتی ہیں جو مصنفوں کی کتابوں میں ہوتی ہیں اسلئے کہ وہ ایک محقق اور مجتہد تھے معصوم نہیں تھے۔ ہم لوگوں کی نظر میں ان کی بڑی عزت ہے اسلئے کہ وہ علم و عمل کی جامعیت کے اس دور میں بہترین نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنی ایک ذات کے اندر علوم و فنون کی اتنی شاخیں جمع کر لی تھیں جس کی کوئی دوسری مثال ان کے ہمعصروں میں نہیں تھی۔ پھر علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عمل سے نوازا تھا اور یہ چیز ان کے ہر قول و فعل میں اسقدر نمایاں تھی کہ ایک صاحب نظر صرف ایک مرتبہ دیکھ کر اس کا اندازہ کر لے سکتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن ہم نے کبھی ان کو "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" کی حیثیت دے کر ان کے ہر قول

وفعل کو اپنے لئے "اسوہ" بنانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ زندہ تھے ان کی مجلسوں میں ان کی تحقیقات پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے (اگر گنجائش دیکھتے تھے) اور اب، ان کی وفات کے بعد، ان کی تحقیقات پر اسی طرح بحث و نظر کرتے ہیں جس طرح تمام محققین کی تحقیقات پر۔ انھوں نے کبھی "لب بہ بند و گوش بند" کی تلقین نہیں کی۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ غور و فکر کرو اور اپنے درس میں اسی چیز کا طریقہ بتاتے۔ وہ جب اس چیز میں کوئی کمزوری محسوس کرتے، ان کو بڑی مایوسی ہوتی۔ مگر انھوں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ سب میرے مقلد بنجائیں اور اگر وہ یہ بات چاہتے تو یقیناً مدرسۃ الاصلاح میں ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوتی۔ پس اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہم مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ کی ہر رائے کو حق اور ہر بات کو صواب اور ہر تصنیف کو الہامی سمجھتے ہیں تو ہم اس کی نسبت صرف یہی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے حال سے بیخبر ہے اور اگر وہ مولانا کو کافر کہتا ہے تو ہم اس کی ہدایت کے لئے دعا کرتے ہیں اور اگر ان کی محبت واحترام کے جرم میں ہماری بھی تکفیر کرتا ہے اور گالیاں دیتا ہے تو اللہ تعالی سے صبر واستقامت کے طلبگار ہوتے ہیں کہ ہمارے زبان وقلم کو شیطان کے قابو سے بچائے۔ لوگوں کو چاہئے کہ مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدینؒ کی علمی تحقیقات کی تردید میں قلم اور تحقیق کا زور دکھائیں۔ خواہ مخواہ ان کو گالیاں دے کر اور ان کی تکفیر کرکے اپنے علم وتقوی کی پردہ دری کیوں کرتے ہیں؟ اگر ان باتوں سے لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ ایک غریب مدرسہ کو نقصان پہنچائیں اور ایک غریب جماعت کو دق کریں تو لَن یُّصِیبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا اور اگر ان بزرگوں کی تحقیر کرنا چاہتے ہیں تو تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ۔ پھر ایسی فضول باتوں سے کیا حاصل!

اور یہ جو کسی اشتہار میں لکھا گیا کہ "مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے اس مشترکہ مشن کی مدد کیجئے" تو یہ کوئی کفر و بدعت نہیں ہے۔ ایک واقعہ کا بیان ہے۔ ان دونوں بزرگوں کو اس مدرسہ سے، ابتدائے قیام ہی سے نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔ اس قالب میں تخیل اور نصب العین کی روح انہی دونوں بزرگوں نے پھونکی۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کی علمی و اصلاحی کوششوں اور ان کی عمر کا بالکل آخری دور تھا، جب اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ دور اُن کی عظیم الشان زندگی کا بہترین دور تھا۔ ان کا پرزور قلم عرب و عجم کی مدح سرائیوں سے تھک کر صرف ایک ہی وجود قدسیؐ کے ثنا و منقبت کیلئے وقف ہوجانا چاہتا تھا اور دل ملت مرحومہ کے مصائب کیلئے کسی ایسے درمان درد کی تلاش میں بیقرار تھا جو آخری علاج ہو۔ دوسروں نے جو نسخے لکھے تھے۔ وہ ان کے نتائج دیکھ کر بالکل مایوس ہوچکے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی خدمت و اصلاح کی کوئی ایسی سیدھی اور صاف راہ کھل جائے جو کجی سے مامون ہو۔ وہ پڑوسی قوموں کی انقلاب انگیز اصلاحی تحریکات سے نہ صرف متاثر بلکہ مرعوب تھے۔ وہ گروکل کی تحریک اور اس کے ایثار و اخلاص کے افسانے سن کر نہایت دردمند ہوتے تھے اور مسلمانوں کی بے حسی اور علماء کے مشغلۂ تکفیر و تفسیق پر نہایت متالم تھے کہ وہ سامنے کے ان خطرات سے بالکل غافل ہیں۔ بالآخران کا دل آستانۂ نبوت پر جھک گیا اور نگاہیں ایک ایسی جماعت کے سراغ میں نکلیں جو وقت کے تقاضہ اور ان کی دلی آرزو کا صحیح جواب ہو۔ یہ وقت ہے کہ مدرسۃ الاصلاح کی طرف پہلی مرتبہ ان کی نظر اٹھتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب میں مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھتے ہیں۔

> "کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو۔ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے۔ اس کو "گروکل" کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔" (مکاتیب حصہ دوم ص ۳۳)

یہ سنہ ۱۹۱۰ء کا قصہ ہے۔ اسی دھن میں مولانا نے سنہ ۱۹۱۲ء میں ندوہ میں خدام الدین کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کی نسبت حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ لکھتے ہیں "مولانا کی خواہش تھی کہ طلبہ کی ایک جماعت مخصوص خدمت دین کے لئے ندوہ میں قائم کی جائے جس کو متقشف زندگی بسر کرنے کی عادت دلائی جائے کہ تحمل مصائب و شدائد کے ساتھ وہ گاؤں اور دیہاتوں میں تلقین اسلام کر سکیں" اسی جماعت کے قیام کی نسبت مولانا شبلیؒ، مولانا حمید الدینؒ کو لکھتے ہیں۔

"میں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کر دی۔ الگ ایک مکان لے دیا ہے۔ اور الگ تربیت ہے۔ قریباً ایک مہینہ ہوا، اب تک اُمیدا فزا آثار ہیں۔ احکام اسلام کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے۔ ابھی تک سات لڑکے عہد و پیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں۔ یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی آئیں گے اور جو کام ان کو بتایا جائے گا۔" (مکاتیب جلد ۲ ص ۳۷)

کچھ دنوں کے بعد جب مولانا ندوہ سے بددل ہوئے تو چاہا کہ مدرسۃ الاصلاح ہی کو اس جماعت کا مرکز بنائیں چنانچہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ایک نامہ میں لکھتے ہیں۔

"ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین، دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنا جائے یہیں خدام الدین بھی تیار ہوں۔ مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے۔ گویا گروکل ہو۔ تم اپنی رائے لکھو۔ . . . . پرنسپلی اور میش قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔" (مکاتیب جلد ۲ ص ۴۷)

اس واقعہ کے ٹھیک ایک برس بعد مولانا کا انتقال ہوا۔ اس ایک سال میں شاید وہ اس مدرسہ کے ایک آدھ جلسوں میں شریک ہو سکے۔ بعض ثقات راوی ہیں کہ ان کو یہاں کی غربت اور سادگی سب سے زیادہ پسند تھی اور انھوں نے اس کو قائم رکھنے کی تاکید فرمائی اور اپنی دوسری آمد میں جب کوئی بات اس کے خلاف پائی تو اس پر سختی سے ٹوکا۔

مولانا شبلیؒ کی وفات کے کچھ دنوں بعد علامہ فراہی نے دار العلوم حیدر آباد کی "پرنسپلی اور میش قرار تنخواہ" کو خیر باد کہا اور مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر ایک "ابدی خدمت" میں مشغول ہوئے۔ "بوریائے فقر" کوئی مجاز و استعارہ نہیں ہے۔ واقعہ ہے۔ ایک پھٹے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھتے تھے۔ طالب العلمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ غریبوں کا کھانا دال روٹی ہے۔ دال روٹی گھر سے باندھ کر لاتے تھے اور غریبوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اساتذہ کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ خود روتے تھے دوسروں کو رُلاتے تھے۔ ان کی مجالس میں نکات قرآن، علمی تحقیقات، ملی مصائب کے سوا کسی عنوان پر گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ فرائض و سنن تو خیر یہی اپنی ذات کے لئے تو جزئیات تک میں نہایت

متشدد تھے۔ طلبہ اور تلامذہ میں کوئی بے پروائی دیکھتے تو منتظمین کو توجہ دلاتے۔ اگر تنبیہ کا کوئی اثر نہ دیکھتے ناخوش ہو جاتے۔ شب کا پچھلا حصہ، پابندی کے ساتھ، نماز اور تدبر قرآن پر صرف فرماتے اور خاص مجالس میں فرمایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا علاج نماز بالخصوص شب کی نماز ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ عملی زندگی کا یہی رنگ تمام مدرسہ پر چھا جائے۔ یہ الگ سوال ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی یا نہیں؟ مگر تھی ان کی آرزو یہی۔ اس مدرسہ کیلئے وہ جو کچھ چاہتے تھے اس کو خود اپنے قلم سے انھوں نے مدرسہ کے دستور العمل میں ان لفظوں میں لکھ دیا ہے۔

"(الف) قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتنا۔

(ب) اصلی علم وقابلیت کو مطمح نظر رکھنا۔ نہ کسی محدود نصاب کتب کو، الا قرآن مجید ومتون حدیث

(ج) درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع ورروحانیت اسلام

(د) آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

(ہ) کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ

(شرح) خصوصیات الف وب بنیادی ہیں۔ ج ان کا عملی ثمرہ ہے اور د۔ ہ ان کے ذرائع ہیں اور ان کی اہمیت میں باہمی فرق مراتب ان کی ترتیب سے سمجھنا چاہئے۔"

اس مدرسہ کے متعلق جو باتیں، اصول کی حیثیت سے، ان کے سامنے تھیں، وہ بار بار چھپکر شائع ہو چکی ہیں مدرسہ کے مطبوعہ کاغذات سے ذیل میں ان کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

(۱) مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں۔ اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں۔ کفاف پر قناعت کریں۔ چنانچہ یہاں صدر مدرس ومہتمم ۳۵ روپئے ماہوار پر زندگی بسر کرتے ہیں اور بقیہ اساتذہ بیس ۲۰ بیس ۲۰ پچیس ۲۵ پچیس ۲۵ روپئے ماہوار پاتے ہیں۔ یہ بھی اس طرح کہ بعض مرتبہ سال سال بھر انکی تنخواہوں کی ادائیگی کا سامان نہیں ہوتا۔

(۲) اس مدرسہ کو غربا مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے۔ سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔ چنانچہ چند چھوٹے

چھوٹے اوقاف کے علاوہ اس مدرسہ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے حالانکہ اس حالت سے نکل جانا بآسانی ممکن تھا مگر مولانا کا خیال تھا کہ آزادی اور دینی روح کا تحفظ اصل الاصول ہے۔

(۳) قرآن کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو۔ اسکے بعد حدیث و فقہ پر زور دیا جائے۔ منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دیجائیں۔ ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دیجائے۔ حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو۔ فقہ میں، فقہ اسلامی کی تعلیم دیجائے تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو۔ تکفیر و تفسیق کا ولولہ نہ ابھرے۔ صرف و نحو کی تعلیم عملی ہو۔ فنون کی تعلیم میں امہات فن پیش نظر رہیں اور لکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دیجائے۔ (بشرطیکہ صدقات و خیرات کی رقمیں اس پر صرف نہ کی جائیں) حصول معاش کیلئے صنعت کی تعلیم دیجائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو، اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

(۴) یہ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو۔ یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں۔ ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر و شکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹادیں۔

یہی باتیں ہیں جو اس مدرسہ کے متعلق مولانا شبلیؒ اور مولانا حمیدالدینؒ کے پیش نظر تھیں اور اسی وجہ سے اسکو ان بزرگوں کا مشن کہا گیا۔ یہ ان کے عقائد و تصنیفات کا مشن نہیں ہے۔ عقائد و اعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کیا کم ہے کہ ہم "زید و عمر" کے ممنون احسان ہوں۔ مدرسۃ الاصلاح کے نصاب تعلیم میں مولانا شبلیؒ کی ایک کتاب بھی داخل نہیں۔ مولانا حمیدالدینؒ کے دو چھوٹے چھوٹے رسالے صرف و نحو کے داخل ہیں، جن کو یقیناً عقائد و ایمانیات سے کوئی تعلق نہیں۔

باب التفسیر

تفسیر سورۃ الکافرون

۱

مصنفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

مترجمہ

امین احسن اصلاحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ	(۱)	کہہ، اے کافرو!
لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ	(۲)	نہیں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو۔
وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ	(۳)	اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں۔
وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ	(۴)	اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے
وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ	(۵)	اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں۔
لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ	(۶)	تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین۔

سورہ کا تعلق ماقبل سے

(۱) سورہ کوثر میں مسلمانوں کو فتح و غلبہ کی بشارت اور اس امر کی خوشخبری دی گئی ہے کہ ان کے دشمن اسلام کے

شجرہ مبارکہ سے یکقلم کاٹ دیے گئے۔ اس کے بعد یہ سورہ اتری جس میں کفار سے قطع تعلق کا اعلان ہے۔ جیسا کہ سورہ کی تفسیر واضح ہوگا۔

یہ جنگ اور براءت کی سورہ ہے

(۲) یہ سورہ کفار سے علیحدگی اور قطع تعلق کی سورہ ہے۔ اس لئے اس کو سورہ براءت کی طرح ہجرت اور جنگ کی سورہ سمجھنا چاہئے۔ سورہ براءت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ سورہ براءت کی ابتداء اعلان براءت ہے اور یہ یکسر اعلان براءت ہے۔ سلف نے بھی اس سورہ کی حقیقت یہی سمجھی ہے۔ چنانچہ اس کے ناموں سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

اس سورہ کا نام منابذہ، اخلاص اور مقشقشہ ہے۔ لسان العرب میں ہے" احادیث میں وارد ہے کہ سورہ قل ہو اللہ اور قل یا ایہا الکٰفرون کا نام "مقشقشتان" تھا"۔ مختصراً ان ناموں کی تشریح سن لینی چاہئے اس سے سورہ کی صحیح تاویل کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

منابذہ کا مطلب ہے کسی سے تمام علائق کو قطع کر دینا۔ قرآن میں ہے: فانبذ الیھم علیٰ سواء۔

اخلاص کے معنی ہیں مومنین کو مشرکین سے علیحدہ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ — اور تاکہ اللہ مومنین کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔

انبیاء کی بعثت کا یہی اصلی مقصود ہے تفصیل آگے آئیگی۔

اخلاص کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اخلاص باطن، اخلاص ظاہر کا سبب ہے۔ اخلاص باطن کی جڑ توحید ہے اس لئے توحید مشرکین سے علیحدگی کی گویا اصلی علت ہوگی۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مقشقشہ، وہ سورہ جو قرب صحت اور نجاست شرک سے علیحدگی کی خبر دے رہی ہے۔ قشقشہ کے معنی ہیں ظہور صحت کے چیچک اور زخم وغیرہ کے بعد جب جلد سوکھ جاتی ہے تو اس کی تعبیر کے لئے یہی لفظ ہے۔ غور کرو کہ یہ لفظ حقیقت کی تعبیر کے لئے کس قدر موزوں ہے۔ ہجرت، براءت اور جنگ بظاہر نہایت گھناؤنی اور مکروہ چیزیں ہیں لیکن

انہی پردوں کے اندر سعادت وکامرانی کا مقدس چہرہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نام سورہ کے اصلی مفہوم سے کس قدر لگتے ہوئے ہیں؟

قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو ابتدائے نبوت ہی میں برأت کا حکم دیدیا تھا۔ سورہ شعراء میں ہے۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (سورہ شعراء ع ۱۱)

اپنے قرابتداروں کو ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو پس اگر وہ (کفار) تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے کہدو کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں اور خدائے

سورہ یونس میں فرمایا۔

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (یونس ع ۵)

اگر وہ تمہیں جھٹلادیں تو ان سے کہدو کہ میرے لئے میرا عمل ہو اور تمہارے لئے تمہارا عمل تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمہارے

یہ آیت بالکل "لکم دینکم ولی دین" کے ہم معنی ہے۔

سورہ انبیاء میں فرمایا ہے۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ (انبیاء ع ۷)

اگر وہ اعراض کریں تو کہدیجئے تمہیں عام طور پر خبردار کر دیا اور میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ قریب ہے

پس جب مکہ اور اس کے اطراف کے کفار نے آنحضرت صلعم کی دعوت سے انکار کر دیا اور نفرت و عداوت کے جوش میں آپ کے قتل اور اخراج پر کمربستہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو برأت، ہجرت اور جنگ کا حکم دیدیا۔

انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کے معاملہ میں قانون الٰہی ہمیشہ سے یونہی رہا ہے۔ ایک مدت تک ان کو صبر و تحمل اور انتظار فتح و نصرت کا حکم دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے سرکش طبیعتیں تسلیم و قبول کی طرف مائل ہوں لیکن جب ان کی طرف سے برابر سرکشی کا اظہار ہوتا ہے اور سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کے ارادہ قتل و اخراج تک متعدی ہونے لگتی ہے تو خدا

کا آخری حکم برات، ہجرت اور جنگ کے اعلان اور انتقام کے تازیانہ کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوں۔ ظالم ہلاک ہوں اور ان کی جگہ اہل ایمان خدا کی زمین میں متمکن ہوں۔ یہی بعثت کی اصلی غرض ہے۔ اپنی کتاب ملکوت اللہ میں اس بحث کو ہم پوری تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ بعض شواہد اس کتاب میں بھی ملیں گے۔

بعثت کے مراحل:۔ برات، ہجرت اور غلبہ

۴۔ کسی قوم میں کسی رسول کی بعثت کا زمانہ اس قوم کے بحران کا زمانہ ہوتا ہے اور اس وقت تین حالتوں پر سے کوئی نہ کوئی حالت ظہور میں آجاتی ہے۔

(۱) پوری قوم اپنی شرارتوں کے پاداش میں ہلاک کردی جاتی ہے۔ صرف ایک مختصر جماعت نیکوکاروں کی بچ رہتی ہے اور یہی جماعت ہلاک ہونیوالوں کی جگہ زمین کی وارث ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور اکثر انبیاء کی امم کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

۲۔ تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچکر، یک بیک قوم پیغمبر کی دعوت سے چوکنی ہو جاتی ہے اور خدا کی رحمت اس کو اپنے سایہ میں لےلیتی ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت داؤد، حضرت یوسف اور پیغمبر عالم علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی امتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

۳۔ ایک امت تباہ کردیجاتی ہے اور دوسری زندہ کی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹادی گئیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات میں ان حقائق کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے۔

اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ	یا تو جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ تم کو دکھادیں گے یا یہ ہوگا کہ ہم تم کو وفات دیں گے اور ان کا پلٹنا ہماری طرف ہوگا۔ پھر اللہ ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر ا

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ

ایک رسول ہے جب ان کا رسول آجاتا ہے۔ عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پوری ہوگی۔ کہدو میں تو اپنی جان کیلئے بھی کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کیلئے ایک اجل معین ہے جب انکی اجل آجائیگی۔ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے۔ نہ ایک

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جو امت صالح اور نیکوکار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے اور جو قوم راہ حق و ہدایت سے ہٹکر گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے۔ اور یہ بات بالکل آپ سے آپ ظہور میں آتی ہے۔ سرکش اور نافرمان قوموں کا ہمیشہ یہ چلن رہا ہے۔ کہ جب ان کے پاس انبیاء آئے انہوں نے ان کی تکذیب کی۔ قرآن مجید نے ان کی اس حالت کی طرف جا بجا اشارات کئے ہیں۔ مثلاً

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

افسوس ہے بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے اس کے ساتھ استہزاء کیا۔

دوسری جگہ ہے۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ

جب کسی امت کے پاس اسکا رسول آیا اس نے اسکی تکذیب کی پس ہم نے ایک کے پیچھے دوسری کو لگا دیا اور سب کو مٹا کر افسانہ کر دیا۔

پھر صرف تکذیب اور استہزاء ہی پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ جسارت کا ایک قدم اور آگے بڑھا کر پیغمبر کے اخراج یا قتل کا ارادہ کر لیتی ہیں۔ اور یہ اس معاملہ کی آخری حد ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا انبیاء کی سرگذشتوں کے ذیل میں اس صورت حال کی طرف اشارات کئے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ

ان سے پہلے نوح کی قوم نے تکذیب کی اور اس کے بعد جماعتوں نے

بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ

اور ہر امت نے اپنے رسول کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اس کو پکڑ لے اور باطل کو لیکر مجادلہ کیا کہ اس کے ذریعہ حق کو شکست دیدے پس میں نے ان کو پکڑ لیا پھر دیکھو میرا عذاب کیسا دردناک ہوا اور ایسی ہی تیرے رب کا کلمہ کافروں پر صادق ہو چکا ہے کہ وہ جہنم میں پڑیں گے۔

یعنی قانون الٰہی کے بموجب تباہ ہوں گے۔ جب وہ نبی پر حملہ کرنا چاہیں گے، نصرت الٰہیہ اپنے تمام نتائج و آثار کے ساتھ نمودار ہو جائیگی۔

لیکن نصرت الٰہیہ کے ظہور کا بھی ایک قانون ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب پیغمبر برأت کا اعلان کر کے کفار کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتا ہے۔ نصرت الٰہیہ کے ظہور سے پہلے پیغمبر کے لئے ان مراحل سے گذرنا ناگزیر ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا اس قانون الٰہی کی طرف اشارات کئے ہیں، مثلاً

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا

بے شک جو لوگ اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی لوگ ذلیل ہونیوالوں میں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے لکھدیا ہے کہ البتہ میں غالب رہوں گا اور میرے انبیاء۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے، تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو پھر ان لوگوں سے یارانہ رکھتی ہو جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں۔ اگرچہ ان کے باپ ہوں، یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا کنبہ و خاندان کے ہوں، یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھدیا ہے اور اپنی جانب سے روح سے ان کی تائید فرمائی ہے اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا۔

إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ...... (مجادلہ ع ۳) جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ انہیں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں اور یقیناً اللہ ہی کی جماعت

انبیاء کے غلبہ کے لئے جو قانون الٰہی ہے، آیت میں، پہلے اس کی طرف اشارہ فرمایا پھر اس سنت براءت کا ذکر فرمایا جو مومنین کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے بعد اپنے قانون کا حوالہ دیا کہ وہ مومنین کو بخشیگا اور ان کو اپنی جماعت میں داخل کریگا اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ اگلی فصلوں میں، اس کے شواہد تمہارے سامنے آئیں گے۔ "انا ورسلی" میں "و" بیان کے لئے ہے۔ ان آیات میں بیان کیا ہے کہ غلبہ اللہ کی جماعت کے لئے ہے اور اس جماعت ہی کا غلبہ اللہ اور اس کے رسول کا غلبہ ہے کیونکہ بعض انبیاء کو ان کی زندگی میں غلبہ نہیں حاصل ہوا۔ بلکہ ان کی موت ہجرت کی قائم مقام ہوئی۔ موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے متبعین کو فروغ دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہی ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو بھی، ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومنین کا غلبہ درحقیقت رسول ہی کے غلبہ کا ثمرہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ — ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے دنیا کی زندگی میں غالب کرینگے اور اس دن جس دن گواہ کھڑے ہونگے

یہاں بھی "و" بیان کے لئے ہے، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مومنین کا غلبہ رسول کا غلبہ ہے اور رسول کا غلبہ اللہ کا غلبہ ہے یہی "لاغلبن انا ورسلی" کی صحیح تاویل ہے۔ اور بعینہ یہی حقیقت اس آیت میں مضمر ہے۔

فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ (مومن ع ۸) — یا تو یہ ہوگا کہ جس چیز کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ ہم تم کو دکھا دیں گے یا تم کو وفات دیدیں گے۔ پس وہ ہماری

دوسری جگہ فرمایا۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ — یاد کرو، جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں تمہاری مدت پوری کردونگا

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ....

اور اپنی طرف اٹھانیوالا ہوں اور تم کو کافروں سے پاک کرنیوالا ہوں اور ان لوگوں کو جنھوں نے تمہاری پیروی کی ان لوگوں کے اوپر غلبہ دینے والا ہوں جنھوں نے کفر کیا، قیامت کے دن تک۔

اسی قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ اور جن کو غلبہ و نصرت سے سرفراز فرماتا ہے، وہ حزب اللہ کے لقب سے ممتاز ہوتے ہیں۔

نصرت الٰہیہ کا ظہور ہجرت کے بعد ہوتا ہے

۴۔ کاروبار نبوت کی پہلی منزل نصح و دعوت اور صبر ہے، اس کے بعد برات و ہجرت کی منزل آتی ہے اور سب سے آخر میں فتح و کامرانی کی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ صرف آنحضرت صلعم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا۔ بلکہ ایک عام قانون ہے جو تمام انبیاء بلکہ تمام خلق کے لئے یکساں ظاہر ہوا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کی طرف اشارات ہیں۔ بعض سورتوں میں، یہ چیز عمود کی حیثیت رکھتی ہے اور بعض میں اس کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ سورۂ اعراف، ہود، یوسف اور نحل میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ ہم صرف بعض جامع آیات کے ذکر پر اکتفا کریں گے سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا

قریب تھا کہ تجھکو اس زمین سے گھبرا دیں تاکہ تجھکو اس سے نکال دیں اور اس وقت تیرے بعد وہ بھی اس میں بہت کم ہی رہتے۔ یہ ہمارا قانون رہا ہے ان تمام انبیاء کے ساتھ جو تم سے پہلے ہم نے بھیجے اور تم ہمارے قانون میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

دوسری جگہ فرمایا

حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا

یہانتک کہ جب انبیا مایوس ہو گئے اور کفار نے گمان کر لیا کہ انکو جو دھمکیاں دی گئی ہیں، جھوٹ ہیں، ہماری مدد انکے پاس آگئی

اس سے معلوم ہوا کہ جب پیغمبر ہجرت کرتا ہے، احتساب کی گھڑی آن پہنچتی ہے۔ اس وقت اسلام غالب ہوتا ہے اور کفر ہزیمت اٹھاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ سورہ ابراہیم میں فرمایا ہے

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ	کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں
نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۝ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ	قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور وہ قومیں جو ان کے بعد
لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ ؕ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ	گذریں۔ اور جن کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ان کے پاس
بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَ	ان کے رسول روشن دلیلیں لیکر آئے لیکن انھوں نے اپنے
قَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي	منہ پر ہاتھ رکھے اور کہا جو بات تم لیکر آئے ہو ہمیں اس سے انکار
شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝ قَالَتْ	ہے۔ اور جس بات کی طرف تم بلاتے ہو ہمیں اس میں شک ہے
رُسُلُهُمْ أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	ان کے رسولوں نے کہا، کیا تمہیں اللہ کے بارہ میں شک ہے؟
يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ	وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا بنانیوالا ہے۔ وہ تمہیں بلا رہا ہے کہ تمہارے
إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى ؕ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ	گناہ بخشدے اور ایک مقررہ مدت تک مہلت دے۔ انھوں نے
مِثْلُنَا ؕ تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ	کہا، تم تو بس ہماری ہی طرح کے آدمی ہو۔ چاہتے ہو کہ جن معبودوں
يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطٰنٍ مُبِينٍ ۝ قَالَتْ	کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ان کی پوجا کرنے سے ہمیں روک دو
لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ	اگر ایسا ہی ہے تو کوئی واضح دلیل پیش کرو۔ ان کے رسولوں نے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ؕ	جواب دیا۔ ہم تمہاری ہی طرح آدمی ہیں۔ لیکن اللہ جس بندہ پر چاہتا ہے
وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا بِإِذْنِ	اپنا فضل و احسان کرتا ہے اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں ہے
اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝	کہ نہیں کوئی معجزہ لا دکھائیں مگر اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ ہی ہے
وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا	جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے۔ اور ہمیں کیا ہو گیا ہے
سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَا آذَيْتُمُونَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝	کہ اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ اس نے ہماری راہوں میں ہماری

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ۝ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ ۝

(ابراہیم ۱۳ تا ۱۶)

رہنمائی کی ہے اور ہم ان ایذاؤں پر صبر کریں گے جو تم ہمیں دے رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنیوالوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمہیں اپنے ملک سے ضرور نکال باہر کریں گے یا تم کو ہمارے مذہب میں لوٹنا ہوگا۔ تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ البتہ ہم ظالموں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور انکے بعد تمہیں زمین میں جگہ دیں گے۔ یہ ہے نتیجہ اس کے لئے جو ہمارے حضور کھڑے ہونے اور ہماری وعید سے ڈرا۔ پیغمبروں نے فتح کی دعا مانگی اور سرکش نامراد ہوئے۔ ان کے آگے جہنم ہے وہاں خون

انبیاء کے ساتھ جو معاملات پیش آتے ہیں، ان آیات میں ان کی تفصیل کردی گئی ہے۔ اس خاص معاملہ میں، جو سنت الہیہ جاری و نافذ ہے اس کو سمجھنے کے لئے ان آیات کو پیش نظر رکھو۔ انبیاء کا دستور یہ ہے کہ وہ توحید کی دعوت دیتے ہیں، توبہ کی منادی کرتے ہیں، مغفرت کا اعلان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بندگی اور بیچارگی کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ کے بھروسہ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جس پر ان کا اعتماد ہو۔ کفار اس کے جواب میں ان کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں۔ توحید کا انکار کرتے ہیں، وعدۂ قیامت کا مذاق اڑاتے ہیں اور بالآخر پیغمبر کو ملک سے نکال دینے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہے، پیغمبر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے، اس وقت اللہ کی مدد ظہور میں آتی ہے ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور اہل ایمان ان کی جگہ زمین کے وارث ہوتے ہیں۔

(باقی)

معارف قرآن

تدبر قرآن

۵

امین احسن اصلاحی

قرآن مجید محل تدبر ہے اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام وقوانین کا مجموعہ ہے اور کلام کی اس صنف میں داخل ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہنی کاوش اور فکر و تدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص جو عربی عبارتوں کا الٹا سیدھا ترجمہ کر سکتا ہے، قرآن مجید کی تاویل وتفسیر بھی کر سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ عام تعلیم کے اعتبار سے نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے۔ ہر شخص بقدر استعداد اس سے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کو جس روش پر گذرنا چاہئے اس کی طرف پہلی ہی نظر میں اشارہ کر دیتا ہے، کرنے کی تمام باتیں اور بچنے کی تمام چیزیں بغیر کسی ایچ پیچ کے نہایت واضح لفظوں میں پکار دیتا ہے۔ حرام وحلال کے تمام حدود بالکل متعین الفاظ اور نپے تلے جملوں میں مقرر کر دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے جس کا گہراؤ اتھاہ اور جس کی وسعت ناپید اکنار ہے۔ اس کے لئے صرف عربی زبان دانی کافی نہیں بلکہ تدبر کی ضرورت ہے۔ صرف پیرنا کافی نہیں بلکہ ڈوبنا چاہئے۔ راہ چلتوں کی طرح صرف گذر نہیں جانا چاہئے بلکہ ہر لفظ پر رک رک کر ایک ایک گوشہ کی تفتیش کرنی چاہئے۔ پھر ایسا صرف ایک بار نہیں بلکہ جیسا کہ احادیث میں وارد ہے بار بار کرنا چاہئے۔ یہ پیہم مطالعہ اور غیر منقطع مزاولت کی چیز ہے۔ تعاهدوا هذا القرآن فوالذي نفس محمد بيده لهو اشد تفلتا من الابل في عقلها

(للشیخین)

یہی وجہ تھی کہ اس کے اسرار وحقائق پر غور کرنے کے لئے اذکیائے خیر القرون کے حلقے قائم ہوتے تھے اور آنحضرت صلعم

ایسے حلقوں کے قیام پر، موثر الفاظ میں حث و تحریض فرماتے تھے۔ ابو داؤد میں روایت ہے:-

ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون	جو لوگ کسی جگہ مجتمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و
کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم الا نزلت	مذاکرہ کی مجلسیں قائم کرتے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے سکینت
علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ وحفتھم	اور رحمت کی بارش ہوتی ہے، اور ملائکہ ان کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے
الملئکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ	رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔

اس حدیث میں صرف ایسی مجالس کے قیام و انعقاد کی دعوت ہی نہیں ہے بلکہ یہ مجالس خیر القرون کی تصو(یر) ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں قرآن مجید کے مذاکرہ و مطالعہ کی یہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ صحابہ ان میں یکجا ہوتے تھے۔ آیات الٰہیہ پر تدبر کرتے تھے۔ مشکلات میں، ایک دوسرے کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خود آنحضرت صلعم کبھی کبھی ان مجالس میں شرکت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بحث و نظر کی ان مجلسوں کو ذکر و عبادت کی مجلسوں پر ترجیح دی اور فرمایا کہ میں معلم ہوں۔

غور کرو، صحابہ کس چیز پر غور و تدبر کرتے تھے۔ زبان ان کی تھی، اس کے اسالیب و قواعد ان کے غور و بحث کی چیز نہ تھے؟ قرآن جن حالات پر اترتا تھا وہ تمام تر ان کے ہوتے تھے، ان کے جاننے کے لئے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی تھی؟ تلمیحات و اشارات ایسی باتوں سے متعلق ہوتی تھیں جن کی تفصیلات پر وہ روزانہ گفتگوئیں کرتے تھے؟ خیالات و عقائد، اعمال و افعال، معروف و منکر، جن پر قرآن بحث کرتا تھا، وہ سرتاسر خود ان کی سرگذشت تھے؟ اقوام سابقہ کے احوال جو قرآن مجید میں بیان ہوئے وہ ان کے روزانہ کے چرچے تھے؟ یہود و نصاریٰ کے خیالات و عقائد یا حالات و واقعات جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی وجہ سے بخوبی باخبر تھے؟ پھر ایسی کیا چیز تھی جس پر ان کو غور کرنا تھا؟ تاہم واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غور و تدبر کرتے تھے۔ پھر معمولی غور و تدبر نہیں، ایسا غور و تدبر جس کی مثالیں تحقیق و تفحص کے اس روشن عہد میں بھی زیادہ نہ مل سکیں گی۔

موطا میں ایک روایت ہے ان عبد اللہ بن عمر مکث علی سورۃ البقرۃ ثمانی سنین یتعلمھا

ضرت عبد اللہ بن عمر مسلسل آٹھ برس تک سورہ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے۔ غور کرو
ت عبداللہ بن عمر کو ان تمام وادیوں سے گذرنا نہیں تھا جن سے اب قرآن مجید کے ہر طالب العلم کو گذرنا پڑتا
۔ ان کی راہ نہایت سیدھی اور صاف تھی۔ آج قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے جن مقدمات و تمہیدات کے ہم محتاج
اور جن کے باوجود بھی کوئی قدم جادہ پر استوار نہیں پڑتا، ان سے وہ یکقلم مستغنی تھے۔ ان کے فکر و نظر کی چیز صرف
کے اسرار و حکم تھے پھر ان کے اردگرد یہ ہمارے صناعی علوم و فنون کی تمام حصار بندیاں بھی نہ تھیں۔ اس آسمان
نیچے صرف ایک کتاب تھی جس کا علم و عمل اور درس و مطالعہ ان کی تمام زندگی اور زندگی کے تمام ولولوں اور
وں کا مرکز تھا۔ تاہم وہ قرآن مجید کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے۔ ان کو نہ تو قرآن مجید کی زبان
ن تھی نہ اس کے شان نزول اور ناسخ و منسوخ کے جھگڑوں میں الجھنا تھا۔ زبان ان کی تھی، مذاق ان کا تھا،
ت ان کے تھے۔ احوال و ایام اور عقائد و اعمال سب ان کے تھے۔ تاہم ایک ایک سورہ آٹھ آٹھ سال تدبر کرنے
د بھی آسودہ نہیں ہوتے تھے۔ پھر ہمارے لئے کہ قرآن کی ہر چیز سے بیگانہ ہیں اور اس سے مانوس ہونے کیلئے
چیزوں سے آشنا اور مانوس ہونا پڑے گا یہ خیال کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید نہایت کھلی ہوئی کتاب ہے
و سمجھنے کے لئے کسی خاص کاوش و اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ صحابہ کرام کی زندگی کی کھلی ہوئی شہادتیں ہیں۔ اس کے علاوہ خود قرآن مجید کو دیکھو مشکل ہی سے کوئی سورہ ہوگی جو
ظر اور تفکر و تدبر کی دعوت سے خالی ہو۔ ہر قدم پر لعلکم تعقلون، ہر چند آیات کے بعد لعلکم تفکرون،
ملہ کے بعد لعلکم تذکرون کی دعوت بلند ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سورہ قٓ میں قرآن مجید کے فہم کیلئے
ی شرط یہ قرار دی کہ

ن ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او	بے شک اس میں یاددہانی ہے اس شخص کے لئے جس کے
السمع وھو شھید	پاس دل ہو یا حاضر ہو کر بات پر کان دھرے۔

یعنی قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ سینہ میں بیدار و ہشیار دل ہو جو فقہ و فہم کا سرچشمہ ہے

اور اگر بیدار دل نہ ہو تو کم از کم سننے والے کان ہوں، جو پوری دلچسپی اور یکسوئی کے ساتھ قرآن مجید کی باتوں پر جم جائیں تاکہ اس کا نفوذ و اثر دل کے پردوں پر کارگر ہو سکے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ نہ دل کی ہوشیاری و بیداری، نہ سماعت کی یکسوئی اور دلچسپی، تو ایسے شخص پر قرآن مجید کی راہ بند ہے۔ قرآن کے لئے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ناگزیر ہے۔ یا تو آدمی کے سینہ کے دروازے کھلے ہوئے ہوں اور فہم وادراک کی روشنی اس کے اندر زندہ ہو۔ یا یہ ہو کہ اپنے کانوں کو اس کے لئے کھول دے، اور طبیعت کے حضور کو اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھائے۔

جو ان دونوں باتوں سے محروم ہیں وہ قرآن مجید کے فیض سے محروم ہیں۔ ان کی تصویر سورہ محمد میں کھینچی گئی ہے۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں؟ یہ منافقین کا بیان ہے۔ منافقین قرآن مجید پڑھتے تھے۔ لیکن دلچسپی اور حضور قلب کے ساتھ نہیں، بے دلی اور نفرت کے ساتھ۔ وہ قرآن مجید کی آیتوں پر سے گزر جاتے تھے۔ حالانکہ اس کی تاثیر کے ظہور کے لئے تدبر کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے باوجود ضعف عقائد اور فساد اعمال کی تمام آلودگیوں میں لتھڑے رہے

اصل یہ ہے کہ لوگوں نے معاملہ پر غور نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید کے متعلق سب سے پہلی بات جو جاننے کی ہے یہی ہے کہ یہ محل فکر و تدبر ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی کتاب ہے، جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تدبر کرے اس کا انداز بحث و استدلال ہمارے منطقیوں کے انداز بحث و استدلال سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ صغریٰ و کبریٰ بنائے اور پھر نتیجہ نکال کر مخاطب کو ساکت کر دے۔ قرآن مجید دنیا کو ساکت کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ عقل انسانی کی تربیت کے لئے آیا ہے تاکہ اس کی تمام صلاحیتوں کو زندہ کرکے استنتاج اور استدلال کی ان راہوں پر لگا دے جن کی آخری منزل نجات اور کامیابی ہے۔ اسلئے اسکا عام طریقہ یہ ہے کہ دلائل اور آیات

ن انگلی اٹھا دیتا ہے۔ استدلال کے بعض پہلوؤں کو کسی قدر بے نقاب کردیتا ہے۔ نتیجہ کے بعض گوشوں کیطرف ی اشارہ کردیتا ہے۔ باقی صغریٰ و کبریٰ کی تمام کڑیوں کو ملانا اور نتیجہ تک پہنچنا خود مخاطب پر چھوڑ دیتا ہے تدبر کرے اور خود اپنی رہنمائی میں ان مقاصد تک پہنچ جائے۔ جن تک پہنچنا چاہئے۔ وہ چند چیزوں کا کے بعد یہ کہکر خاموش ہوجاتا ہے کہ ان فی ذلک لآیات اس میں نشانیاں ہیں۔ کیا نشانیاں ہیں؟ س کا جواب نہیں دیتا۔ مخاطب کا فرض ہے کہ وہ تدبر کرے اور موقع کلام کے حدود کے اندر رہ کر نشانیوں غ لگائے۔

سورہ نحل کے ایک مقام پر غور کرو۔ قرآن مجید کے طریق استدلال کی پوری حقیقت بے نقاب ہوجائیگی۔

ی انزل من السماء ماء لکم منه شراب	وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ اس میں سے کچھ تو
شجر فیه تسیمون ٭ ینبت لکم به الزرع	تمہارے پینے کے کام آتا ہے کچھ زمین کو سیراب کرتا ہے اس سے درختوں
یتون والنخیل والاعناب ومن	کے جنگل پیدا ہوجاتے ہیں اور تم اپنے مویشی ان میں چراتے ہو
ثمرات ۔ ان فی ذلک لآیة لقوم یتفکرون	اسی پانی سے وہ تمہارے لئے کھیتیاں بھی پیدا کردیتا ہے۔ نیز زیتون
لکم الیل والنهار والشمس والقمر	کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لئے
م مسخرات بامره ۔ ان فی ذلک	ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرنیوالے ہیں اور اس نے تمہارے
ت لقوم یعقلون ٭ وما ذرا لکم فی	لئے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کردئے اور اسی طرح ستارے
ض مختلفا الوانه ۔ ان فی ذلک	بھی تمہارے لئے مسخر ہوگئے ہیں۔ یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے
لقوم یذکرون ٭	لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔
	اور زمین کی سطح پر طرح طرح کے رنگوں کی پیداوار جو تمہارے لئے
	پیدا کردی ہیں بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک نشانی
	ہے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔

ان آیات پر غور کرو، علی الترتیب تین لفظ آئے ہیں لقوم یتفکرون، لقوم یعقلون، لقوم یذکرون۔ پھر ایک جگہ فرمایا ان فی ذلک لآیہ اس میں ایک نشانی ہے۔ کیا نشانی ہے؟ کچھ نہیں بتایا تفکر سے معلوم ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا ان فی ذلک لآیات۔ اسمیں نشانیاں ہیں۔ کیا نشانیاں ہیں اور کس بات پر ہیں؟ ان سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ فرمایا جو عقل سے کام لینگے وہ پا جائینگے۔ پھر بعض چیزوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ان فی ذلک لآیہ اسمیں ایک دلیل ہے۔ کیا دلیل ہے؟ کس بات پر دلیل ہے؟ قرآن مجید ان سوالوں کے جواب سے خاموش ہے۔ تاکہ قوت تدبر خود بخود اپنا عمل کرے اور ان نشانیوں کو ابھارے۔

دلائل اور حکمت کے باب میں قرآن مجید کا عام اسلوب بیان یہی ہے۔ اس نے حکمت کا ایک وافر ذخیرہ ننگا ہو کے سامنے کر دیا ہے اور ایک بے پایاں خزانہ آیات کے پردوں میں چھپا دیا ہے تاکہ انسان خود ان پردوں کو ہٹائے اور جسقدر اسمیں سے لے سکتا ہے لے لے۔ عقل انسانی کی تمام کاوشیں ختم ہو جائینگی مگر یہ خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہماری طلب و جستجو کی ایک حد ہے، ہماری کاوشوں کی ایک انتہا ہے، ہماری فکر و نظر کی ایک نہایت ہے۔ ہمارے شوق و طلب کی ایک غایت ہے مگر اسرار قرآن کے سمندر کا کوئی ساحل نہیں۔ یہ بحر ناپیدا کنار ہے۔

قل لو کان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا (۱۰۹ کہف)

ترمذی کی ایک حدیث میں یہ حقیقت کتنی خوبی سے بیان ہوئی ہے۔ حارث اعور راوی ہیں۔ مررت فی المسجد فاذا الناس یخوضون فی الاحادیث فدخلت علی علی فاخبرتہ فقال او قد فعلوہا؟ قلت نعم قال اما انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الا انہا ستکون فتنۃ قلت فما المخرج منہا یا رسول اللہ؟ قال کتاب اللہ، فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم ما بینکم ھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضلہ اللہ وھو حبل اللہ المتین وھو الذکر الحکیم وھو الصراط المستقیم وھو الذی لا تزیغ بہ الاھواء ولا تلتبس بہ الالسنۃ ولا تشبع منہ العلماء ولا یخلق علی کثرۃ الرد ولا تنقضی عجائبہ وھو الذی لم تنتہ الجن اذ سمعتہ حتی قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد فآمنا بہ من قال بہ صدق ومن عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عدل ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم خذھا الیک یا اعور۔ اس حدیث کے چند جملوں پر غور کرو "اس سے علماء آسودہ نہیں ہوتے، اسکو کتنی ہی بار پڑھو کہنہ نہ ہوگی، اسکے عجائب کبھی ختم نہ ہونگے" کیا اس کتاب حکیم کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ حقایق سے بالکل خالی، صرف نیکی کی موٹی موٹی باتوں کی ایک کتاب ہے جسکو سمجھنے کیلئے کسی فکر و کاوش کی ضرورت نہیں؟

(باقی)

مقالات

مولانا شبلی و مولانا حمید الدین صاحب مرحوم پر غوغائے تکفیر

از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ مدرسوں کی باہمی رقابت کے سلسلہ میں علماء ایک دوسرے پر تکفیر و تضلیل کے فتوے جاری کرکے مسلمانوں میں نت نئے اختلافات پیدا کر رہے ہیں۔ اور امت مسلمہ کو سرگرداں و حیران بناتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو حق اور کس کو ناحق سمجھیں۔ وہ مسائل جنکی تحقیق یا تغلیط علماء کی خاص مجلسوں میں ہونی چاہئے ان کو عوام میں پھیلاکر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا، کسی کافر کو مسلمان کہنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔

مولانا شبلی کی تکفیر

مولانا شبلیؒ کی تکفیر جن مسائل کی بنا پر کی گئی ہے، وہ ان کے نہیں، بلکہ ملحدین کے خیالات ہیں، جنکو انھوں نے رد کے لیے نقل کیا ہے۔ بہرحال ان کے مفصل جوابات تو بعد کو شائع ہوں گے۔ اس وقت مختصراً یہ کہنا ہے کہ آج سے بائیس ۲۲ برس پیشتر ندوۃ العلماء کے اختلافات کے سلسلہ میں ندوہ کے اجلاس دہلی کے موقع پر ۱۳۳۲ھ میں انھیں علماء میں سے چند نے انھیں عبارتوں کو نقل کرکے مولانا پر تکفیر کا فتویٰ مرتب کیا تھا۔ اسؔ[1] وقت مولانا نے

[1] وفات سے چھ مہینے پہلے

اپنے دست خاص ایک مختصر تحریر لکھکر شائع کی تھی جو میرے پاس ہے۔ اس میں مخالفین کے ان الزامات کی پوری تردید کردی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آگاہی کے لئے اس کو مع سوال و جواب کے شائع کردیا جائے۔

مولانا شبلیؒ کے عقائد

حضرت مولانا شبلی صاحب   السلام علیکم

مجھے آپ سے چند سوال پوچھنے ہیں، اجازت ہو تو عرض کروں۔

۱۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف الکلام میں مادۂ عالم کو غیر مخلوق لکھا ہے۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد صحیح ہے۔ اور آپ نے تصنیف مذکور میں یہ مسئلہ اپنے مذہب کا لکھا ہے یا کیا؟

۲۔ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟ یعنی کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ ہر ایک آدمی اکتساب اور محنت سے نبی ہو سکتا ہے؟ یا اس کی اصلیت کچھ اور ہے؟

۳۔ اس کے علاوہ اور بھی کوئی خیال آپ نے ایسا ظاہر کیا ہے، جس کی شہادت قرآن مجید اور صحیح احادیث سے مل سکے؟ آپ جو کچھ جواب دیں گے، اسے میں پبلک میں شائع کردوں گا۔

عاجز سید عبدالسلام، مالک مطبع فاروقی، دہلی، ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ

الجواب

جناب میر صاحب!   وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

۱۔ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ "مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے" وہ ملحد اور زندیق ہے۔ میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔ الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں، تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

۲۔ نبوت کے متعلق میرا یہ ہرگز اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے میں نبوت کو عطیہ
تا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا یقین کرتا ہوں اور جو شخص اس بات کا قائل ہو، کہ آنحضرت
للہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا

۳۔ باقی میرے عقائد وہی ہیں، جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں۔ میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ
سنت وجماعت سے ہوں۔ "شبلی نعمانی" دہلی

خود الکلام میں جس کی ناقص عبارتوں پر فتوائے تکفیر کی بنیاد ہے، توحید کے عنوان کے نیچے مذکور ہے۔

"نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیر الاجزا، یا کثیر الافراد ہے، لیکن سب مل کر ایک ہے
یعنی اس کل[1] کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے
جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو"۔ (ص ۶۰)

ص ۶۱ میں "ہے خدا عالم کی علت تامہ ہے"۔

نبوت کے متعلق خود اسی کتاب میں مصنف کا یہ اعتقاد ہے۔

"نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا۔ اجزائے ذیل سے مرکب ہے...... اس کے[2] علوم و معارف اکتسابی
نہ ہوں، بلکہ من جانب اللہ ہوں" (ص ۱۳۰)

کیا اس کے بعد بھی کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے؟

مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر

مولانا حمید الدین صاحب رحمہ اللہ پر جو صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے، بلکہ اپنی صحتِ اعتقاد اور زہد و
کے لحاظ سے خواص امت میں تھے۔ بعض الفاظ کی بنا پر کفر کا فتویٰ مرتب کرنا حد سے زیادہ جرأت ہے۔

---

[1] عالم سے ہے (سلیمان) [2] یعنی نبی کے (سلیمان)

مولانا کی وہ دو باتیں تکفیر کا باعث سمجھی گئی ہیں، حالانکہ ان دو میں سے ایک بھی تکفیر کی مستوجب نہیں۔

پہلی بات کا منشا یہ ہے کہ قرآن میں کہیں کہیں قافیہ کی رعایت اور عبارت کی روانی اور فصاحت کا لحاظ کرکے مروجہ عام اصول نحو کی پیروی نہیں کی گئی ہے، یا لفظ آگے پیچھے کئے گئے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ جہاں کہیں ایسا ہوا ہے، ترجمہ میں بھی قرآن پاک کی بعینہٖ پیروی کیجائے اور لفظ کو آگے پیچھے سے ہٹایا نہ جائے کہ "ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔"

دوسری بات کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کی ہر سورت کو مسلسل و مربوط و متحد المقصد مضمون کی حیثیت سے غور کرنا چاہتے ہیں، ان کو ایک غلطی پیش آتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سورہ کا جو نام ہے، وہی اس سورہ کا موضوع ہے، حالانکہ یہ نام محض سورتوں کے امتیاز کیلئے ہر سورہ کے کسی خاص لفظ کا خیال کرکے رکھ دئے گئے ہیں ان ناموں کو سورتوں کے موضوع و مطلب سے کوئی تعلق نہیں، یہی مذاق عرب تھا اور اس کی پیروی سورتوں کے نام رکھنے میں کی گئی ہے گلستاں، بوستاں، خدائی نامہ، خالق باری، قادرنامہ، فارسی میں کتابوں کے نام ہیں، مگر ان ناموں کو کتاب کے موضوعِ بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح قرآنِ پاک میں پاروں اور رکوعوں کی تقسیم سے بعض طالب العلم جو یہ سمجھتے ہوں کہ اس پارہ یا رکوع پر مضمون ختم ہوگیا ہے۔ دوسرے پارہ یا رکوع سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ ان کا یہ سمجھنا درست نہیں کیونکہ قرآن کی تیس پاروں میں تقسیم معنی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ تلاوت کے لئے ہے۔ تاکہ تیس دنوں میں قرآن کو برابر حصوں میں تقسیم کرکے ختم کیا جاسکے، اسی طرح رکوع کی تقسیم جسکا صحیح نام عشرات ہے یعنی دس دس آیتوں کا ایک ایک حصہ، معنوی تقسیم نہیں بلکہ لفظی ہے، تاکہ نماز میں عام لوگ آسانی کیساتھ قرآن کے ایک مناسب حصہ کو پڑھ سکیں، اسی لئے ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں چھپے ہوئے قرآن پاک میں، یا تو رکوع کے نشان ہی نہیں ہوتے، یا ہوتے ہیں تو ہندوستان سے مختلف، کیونکہ آیتوں کے شمار میں اختلافات ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ غامض علمی بحثیں ہیں، جنکو علماء جانتے ہیں۔ مگر مخالفت کا برا ہو جو صحیح بات کے سمجھنے سے انسان کو ہمیشہ باز رکھتی ہے۔ فتوی میں مولانا شبیر احمد صاحب نے درست لکھا ہے کہ سیاق و سباق عبارت پر غور کرکے کسی عبارت کا مطلب سمجھا جائے۔ مفتی صاحب نے افسوس ہے کہ اس نکتہ پر غور نہیں فرمایا اور یہ وہی شکایت ہے جو حضراتِ فتوی اور ان کے اکابر کو علمائے بریلی و فرنگی محل سے ہمیشہ رہی ہے۔ پھر ہم گنہگاروں کے معاملہ میں، ان حضرات نے اس ضروری نکتہ کو کیوں فراموش فرمادیا۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

پر

فتوائے تکفیر

از جناب مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی

ہمارے عزیز دوست مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی، بڑی رد و کد کے بعد، بالکل پہلے پہل الاصلاح کے صفحات میں آئے ہیں اور اب انشاء اللہ اکثر نظر آئیں گے۔ اس مضمون کا مقصد الکلام اور علم الکلام کی حمایت نہیں ہے۔ صرف مستفتیوں کی "دیانت داری" کو بے نقاب کرنا ہے۔ اگر یہ مقصد پورا ہو جائے تو مضمون نگار اور الاصلاح دونوں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ باقی رہیں متکلمانہ جدلیات تو چاہے وہ علامہ شبلی نعمانی کی طرف منسوب ہوں یا امام رازیؒ اور امام غزالیؒ کیطرف، سب ظلمات بعضہا فوق بعض کے حکم میں داخل ہیں اور الاصلاح کتاب و سنت کا داعی اور خادم ہے۔ کلام اور علم الکلام کا نہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(اڈیٹر)

علامہ شبلی نعمانیؒ اور علامہ فراہیؒ کی تکفیر کا جو فتویٰ شائع ہوا ہے اس میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے عقائد کو چار عنوانات کے ماتحت نقل کیا گیا ہے۔ (۱) ذات خداوندی۔ (۲) نبوت۔ (۳) معجزات۔ (۴) معاد اور عذاب و ثواب۔ اس سے پہلے کہ ان عنوانات پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اقتباسات کی اصل حقیقت کی طرف مختصراً اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس غرض کیلئے ذیل میں ایک نقشہ درج کرتا ہوں۔ اس سے ہر اقتباس کی اجمالی حقیقت بخوبی واضح ہو جائے گی۔

نمبر شمار عقیدہ	اقتباسات مندرجہ استفتاء	اصل حقیقت
	(۱) ذات خداوندی	
۱	اس بناء پر دعوی کرنا کہ عالم کیلئے کوئی علت ضرور ہے صحیح نہیں الخ الکلام ص ۴۳	یہ ملاحدہ (یعنی منکرین خدا) کے اعتراض سے متعلق ہے
۲	یہ امر قطعی ہے کہ کوئی شئ عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی الخ الکلام ص ۴۴	یہ بھی، ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۳	لیکن یہ چیزیں خدا نے بالذات پیدا نہیں کیں الخ الکلام ص ۴۷	اصل میں یہ فلسفہ قدیمہ کا ایک مسئلہ ہے جسکو ملاحدہ نے اپنی ایک دلیل کی تائید میں پیش کیا ہے اور لطف یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس مسئلہ سے متفق ہیں۔
۴	اصل یہ ہے کہ خدا کے وجود کی جو ضرورت ہے وہ الخ الکلام ص ۴۴	یہ بھی، ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۵	اس امر کی تسلیم کرنیکے بعد کہ مظاہر قدرت کا بڑا حصہ خود اشیاء کی صورت نوعیہ کا نتیجہ ہے الخ الکلام ص ۴۸	یہ بھی، ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۶	صور نوعیہ کا قدیم ہونا جبکہ خود اہل مذہب تسلیم کرتے ہیں تو اب الخ الکلام ص ۴۹	یہ بھی ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۷	اس بناء پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے الخ الکلام ص ۳۰	یہ قدماء کے طریقہ استدلال پر ایک اعتراض کا آخری فقرہ ہے
۸	مادہ کی نسبت یہ ثابت ہوچکا ہے کہ وہ قدیم ہے الخ الکلام ص ۴۷	یہ، ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۹	ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم ہے الخ الکلام ص ۵۴	یہ تسلیم علی سبیل التنزل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی مصنف نے یہ کہکر کہ "لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا" تمام پچھلی تسلیموں کو رد کردیا ہے۔
۱۰	اسکا جواب یہ ہے کہ جسطرح مادہ قدیم ہے حرکت اور قوت بھی قدیم ہے الخ الکلام ص ۴۴	یہ، ملاحدہ کے اعتراض سے متعلق ہے۔
۱۱	تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں دو چیزوں کا مجموعہ ہیں الخ الکلام ص ۳۰	یہ قدماء کے طریقہ استدلال پر ایک اعتراض کی تقریر ہے۔ اسی تقریر کا آخری فقرہ عقیدہ ۷ میں لکھا گیا ہے۔

(۲) نبوت

۱/۱۲	ترقی کا سلسلہ خود انسان کی نوع میں قائم ہے الخ (حوالہ ندارد ؟)	یہ عبارت، مشہور حکیم ابن مسکویہ کی مشہور تصنیف الفوز الاصغر کا ترجمہ ہے، علامہ شبلیؒ نے علم الکلام میں جہان تمام مشاہیر متکلمین اور حکمائے اسلام کی مختصر سوانح حیات و خیالات تحریر فرمائے ہیں۔ وہیں ابن مسکویہ کے تذکرہ میں انکے خیالات بھی خود انہی کے کتاب سے نقل کر دیئے ہیں۔

(۳) معجزات

۱/۱۳	عالم میں علل و اسباب کا سلسلہ جاری ہے الخ الکلام ص ۶۶	یہ منکرین نبوت کا اعتراض ہے، جو امام رازی کی مطالب عالیہ سے نقل کیا گیا ہے۔

(۴) معاد اور عذاب و ثواب

۱/۱۴	سزا و جزا، کے متعلق تمام اہل مذاہب کا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ الخ الکلام ص ۱۲۹	یہ پوری عبارت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی محققانہ تصنیف مضنون کبیر کی بحث معاد کا خلاصہ ہے جسمیں امام ممدوح نے ملاحدہ کے اس اعتراض کو اٹھایا ہے کہ عذاب و ثواب کا منشاء غضب یا انتقام نہیں ہے بلکہ یہ انسانی افعال کے لازمی نتائج ہیں۔ جو کبھی منفک نہیں ہو سکتے۔

عبارت ہائے متنازعہ کی اجمالی حقیقت، آپ سن چکے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) ذاتِ خداوندی

اس عنوان کے ماتحت، گیارہ اقتباسات درج کئے گئے ہیں، جو الکلام کے ص ۳۰ سے لیکر ص ۴۵ تک سے ماخوذ ہیں۔ ان صفحات میں علامہ موصوف نے کئی باب باندھے ہیں، سب سے پہلے وجود باری کے طریقہ استدلال پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد ملاحدہ یعنی منکرین خدا کے اعتراضات کا بیان شروع ہوا ہے پھر ملاحدہ کے اعتراضات کے جواب کا باب ہے۔ استفتاء میں چونکہ یہ تمام اقتباسات بے ترتیب لکھے گئے ہیں، حتیٰ کہ ایک ہی صفحہ کی دو عبارتیں ہیں۔ ایک کو شروع میں لکھا گیا ہے اور دوسری کو آخر میں

اور بیچ میں دور دور کے صفحات کی عبارتیں رکھدی گئی ہیں، اس لئے اس ترتیب سے اصل کتاب کے ساتھ ان اقتباسات پر تفصیلی نظر کرنی وقت طلب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے سلسلہ سے ابواب متعلقہ پر غور کیا جائے۔ عبارات متنازعہ اپنے اپنے موقع پر آتی جائیں گی۔ (الف) وجود باری۔

اس باب سے دو عقیدے نقل کئے گئے ہیں۔

مصنف علیہ الرحمۃ نے اس پوری بحث میں، جو صفحہ ۳۰ سے لیکر صفحہ ۹۳ تک پھیلی ہوئی ہے۔ دو باتیں بیان کی ہیں:۔ سب سے پہلے وجود باری کو ثابت کرنے کیلئے حکماء قدیم، ارسطو، بوعلی سینا اور متکلمین اسلام کے جتنے منطقیانہ طریقہائے استدلال تھے، ان سب کو ناکافی ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد خود، قرآن مجید کے فطری طریقہ استدلال سے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے اور آخر میں نہایت پرزور لفظوں میں کتاب الٰہی کے زور استدلال کی طرف ملاحدہ حال کو، جنکی اصلاح خاص طور پر مصنف کتاب کے پیش نظر ہے، اس طرح توجہ دلائی ہے:۔

"آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہوگئی ہے، جبکہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہوگئے ہیں، جبکہ حقایق اشیاء نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے۔ بڑے سے بڑے فلاسفر اور حکماء انتہائی غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کرسکے جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا"

اور ثبوت میں یورپ کے پانچ بڑے بڑے حکماء کی رائیں نقل کرکے اس باب کو ختم کر دیا ہے۔

فتوے میں اس باب کے صفحہ ۳۰ سے دو عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ اور دونوں کو علامہ موصوف کا ذاتی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر پوری عبارت اصل کتاب سے درج کیجائے تاکہ حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں:۔

"خدا کے اثبات پر قدماء استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں وہ کسی علت کی محتاج ہے اور یہی علت خدا ہے۔ اس استدلال کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہے پہلے مقدمہ پر یہ استدلال کیا جاتا تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے۔ یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا اور اسلئے

اس کی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی۔ لیکن وہ فی الواقع صحیح نہ تھا۔ تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں وہ چیزوں کا مجموعہ ہیں مادہ اور ایک خاص صورت جو چیز بدلتی رہتی ہے اور تغیر پذیر ہے وہ صرف صورت ہے اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے کوئی چیز جب فنا ہوتی ہے تو صرف اس کی صورت فنا ہوتی ہے اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ایک کاغذ کو جلا دو جلکر راکھ ہو جائیگا۔ اب کاغذ فنا ہو گیا لیکن راکھ موجود ہے جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہے راکھ کو برباد کرو کسی نہ کسی صورت میں تو قائم رہیگی غرض جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہے اصل مادہ کے حادث ہونے میں نہ کوئی تجربہ پیش کیا جاسکتا ہے نہ کوئی استدلال قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں اور جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں۔ ارسطو نے اس اعتراض کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ (الکلام ص ۳۰)

استفتاء میں اس پوری عبارت میں سے دو ٹکڑے کاٹ کر دو جگہ لکھے گئے ہیں پہلا ٹکڑہ "تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں" سے شروع ہوتا ہے اور بیچ میں تمام منقوط فقرے حذف کرکے " نہ کوئی استدلال قائم کیا جاسکتا ہے" پر ختم کر دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتویٰ مطبوعہ صفحہ ۴ عقیدہ نمبر ۱۱) اور دوسرا ٹکڑہ "اس بنا پر" سے شروع ہوتا ہے اور آخر کے چند جملوں کو چھوڑ کر "لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں" پر ختم کر دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو فتویٰ مطبوعہ صفحہ ۴ عقیدہ نمبر ۶) اور ان دونوں ٹکڑوں کو اسطرح نقل کیا گیا ہے کہ موخر الذکر کو صفحہ ۴ کے شروع میں اور مقدم الذکر کو اسی صفحہ کے بالکل آخر میں۔ غور کرو ایک منتظم اور مربوط سلسلہ عبارت کو کسطرح مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے ادھر ادھر سے کاٹ چھانٹ کر دو ٹکڑے بنائے گئے۔ اس کے بعد ان دونوں ٹکڑوں کو الٹ پلٹ کر دور دور لکھا گیا۔ مخالفین کی اس تحریف کا منشا بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والوں کا ذہن کسیطرح اصل حقیقت کی طرف منتقل نہ ہونے پائے لیکن ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ الکلام کوئی نایاب کتاب نہیں ہے۔ اس کے متعدد اڈیشن ہزاروں کی تعداد میں چھپ چکے ہیں اسلئے اتنی کثیر الشیوع تصنیف کے کسی اقتباس میں تدلیس کرکے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔

اوپر پوری عبارت لفظ بلفظ الکلام سے نقل کر دی گئی ہے۔ اسے پڑھئے اور اصل حقیقت پر غور کیجئے۔ علامہ موصوف نے پہلے خدا کے اثبات پر قدماء کے طریقہ استدلال کو بیان فرمایا لیکن چونکہ اس طریقہ کو معترضین کے اعتراضات پہلے سے مجروح کر چکے تھے اس لئے ان کے اعتراض کو بھی نقل کیا۔ اور آخر میں خود تصریح کر دی کہ اسی اعتراض کے لحاظ سے، جو قدماء کے اس طریقہ استدلال

پروار د ہوتا ہے ارسطو نے وجود باری کو ثابت کرنے کیلئے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

اتنی واضح اور صاف تشریح کے باوجود ایک اعتراض کو مصنف کتاب کا ذاتی عقیدہ بیان کرنا حیرت انگیز دلیری ہے۔

اس باب میں، علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قدماء یونان اور ان کے تمام متبعین کے طریقہائے استدلال پر جو اعتراضات وارد کئے ہیں۔ ان کا منشا، صرف ان منطقیانہ طریقوں کو حصول مدعا کیلئے ناکافی ثابت کرنا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے خود اسی فصل کے آخر میں نہایت واضح لفظوں میں یہ حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے ۔

"ان دلائل میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان سے اگر خدا کا وجود ثابت بھی ہوتا ہے تو اسکا فاعل بالاختیار ہونا ثابت نہیں تو ان دلائل سے صرف ایک علۃ العلل کا وجود ثابت ہوتا ہے لیکن علت کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ ضرورت صادر ہو۔ آفتاب روشنی کی علت ہے لیکن آفتاب کو نہ علم ہے نہ ارادہ بلکہ روشنی اس سے خود بخود بلا علم و ارادہ صادر ہوتی ہے۔

اسی بنا پر بہت سے حکما کا مذہب ہے کہ خدا نے عالم کو بہ اختیار نہیں پیدا کیا اور تعجب ہے کہ شیخ بو علی سینا بھی انہی کا ہمزبان ہے۔

ان تمام تقریروں سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے اور متکلمین بھی چونکہ انہی کے نقش قدم پر چلے تھے اسلئے وہ بھی ناکام رہے۔ اب دیکھو قرآن مجید نے اس عقیدہ کو کیوں کر حل کیا" (الکلام ص ۴۴)

اس کے بعد مصنف نے "وجود باری پر قرآن مجید کا طریقہ استدلال" کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ اور پانچ صفحوں میں نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید کے فطری طریقہ استدلال سے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ اس بحث کے آخری فقرات ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

علامہ ممدوح لکھتے ہیں:۔

صنع اللہ الذی اتقن کل شئ	یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو خوب مضبوط بنایا۔
ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر ھل تری من فطور	خدا کی کاریگری میں تم کہیں فرق نہ پاؤ گے پھر دوبارہ دیکھو کہیں دراڑ دکھائی دیتی ہے۔
خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا	خدا نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔
لا تبدیل لخلق اللہ	خدا کی بناوٹ میں ردوبدل ممکن نہیں ۔

فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا خدا کے طریقہ میں تم ردوبدل نہیں پا سکتے۔

ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے ہیں۔ کامل اور بے نقص ہے۔ موزوں اور مرتب ہے۔ ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے یہ دلیل کا صغریٰ ہے۔ کبریٰ خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستمر النظام ہوگی وہ خود بخود پیدا نہیں ہو گئی ہوگی بلکہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار نے اسکو پیدا کیا ہوگا۔" (الکلام ص ۴۸)

کیا اس تشریح کے بعد بھی کہ عالم کا ذرہ ذرہ کسی صاحب قدرت اور صاحب اختیار کا پیدا کیا ہوا ہے، فقرات متنازعہ کو مصنف کا عقیدہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ ہمیشہ عقل و فہم کی روشنی میں بات پوری سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور خود سمجھ میں نہ آئے تو کسی سے پوچھے۔ پوچھنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

(ب) ملاحدہ (یعنی منکرین خدا کے اعتراضات

اس باب سے ۸ عقیدے نقل کئے گئے ہیں:

اس بحث کو صفحہ ۴۸ سے صفحہ ۹۵ تک پھیلی ہوئی ہے، میں نے کئی مرتبہ کامل غور و فکر کے ساتھ پڑھا اور ہر مرتبہ اسی یقین و اطمینان کے ساتھ ختم کیا کہ کتاب کے ان ۴۸ صفحات میں ملاحدہ کے اعتراضات کی تقریروں کے سوا، ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے، جسکو مصنف کتاب کا عقیدہ سمجھا جا سکے۔ نہایت موٹی بات ہے کہ جب ملاحدہ کے اعتراضات کا عنوان باندھا گیا ہے۔ تو اس عنوان کے ماتحت جو کچھ بیان ہوگا وہ یقیناً ملاحدہ کے اعتراضات ہی سے متعلق ہوگا۔ اس قرینہ کے علاوہ خود مصنف نے تشریح بھی کر دی ہے کہ یہ تمام ملاحدہ کے اعتراضات ہیں چنانچہ اعتراضات کو شروع کرنے سے پہلے علامہؒ لکھتے ہیں:"۔ یورپ کے ملاحدہ آجکل خدا کے وجود پر جو اعتراضات کر رہے ہیں اور جسکی بنا پر ہمارے ملک میں مذہب کی طرف سے بیدلی پھیلتی جا رہی ہے، ہمکو صرف ان اعتراضات کا نقل کرنا اور ان کا جواب دینا کافی ہے" (دیکھو الکلام صفحہ ۴۸) اور جہاں پہلا سلسلہ اعتراضات ختم ہوتا ہے۔ وہاں بھی تحریر فرماتے ہیں۔" یہ ان ملاحدہ کے خیالات ہیں جنکا یہ بیان ہے کہ ہمکو خدا کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ملتی" (دیکھو الکلام صفحہ ۵۵) لیکن ان تمام تشریحات کے باوجود بھی، انہی اعتراضات کو اگر کوئی مصنف کا ذاتی عقیدہ سمجھے اور دنیا کو سمجھانے کی کوشش بھی کرے تو بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ع۔ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

مصنف کی مذکورہ بالا تشریحات سے صاف ثابت ہے کہ صفحہ ۱۴ سے لیکر صفحہ ۱۵ تک ۱۰ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یکسر ان ملاحدہ کے خیالات ہیں جنکو خدا کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ملتی لیکن فتوی میں انتہائی مدلیسانہ جرأت کے ساتھ انہی اعتراضات کو مصنف کتاب کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو عقیدہ نمبر ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۶ مندرجہ فتوی مطبوعہ صفحہ ۳ اور عقیدہ نمبر ۹ و ۱۰ مندرجہ صفحہ ۴۔ یہ تمام عقائد علی الترتیب الکلام صفحہ ۴۳ و ۴۴ و ۴۷ - ۴۴ - ۴۸ - ۴۹ - ۴۷ اور ۴۴ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اور معلوم ہے کہ یہ تمام اعداد ۴۱ - لغایت ۱۵ میں داخل ہیں۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے گو یہ صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جن آٹھ عقائد کو ملاحدہ کے اعتراضات سے اخذ کر کے مصنف کتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ سراسر اتہام اور افترا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ جواب مجمل ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفصیل کے ساتھ ان بہتانوں کی اصل حقیقت کھول کر بیان کر دیجائے۔

علامہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ آغاز باب میں لکھتے ہیں:-

> خدا کا انکار کوئی جدید خیال نہیں ہمیشہ ہر زمانہ میں ملاحدہ کا ایک گروہ موجود تھا۔ سائنس اور فلسفہ حال نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ ملاحدہ سابق کے دلائل بمقابلہ ملاحدہ حال کے زیادہ دقیق و پر زور ہوتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ملاحدہ حال کے دلائل کو دلائل نہیں کہہ سکتے۔ ان کے تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا کا کوئی ثبوت نہیں ملتا" "مادہ کے سوا عالم میں اور کوئی چیز موجود نہیں" "خدا کے اعتراف کے بغیر نظام عالم کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے"۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ کوئی استدلال نہیں بلکہ عدم علم کا اعتراف ہے۔ ملاحدہ سابق کے اعتراضات کو چھیڑ کر ان سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پورپ کے ملاحدہ آجکل خدا کے وجود پر جو اعتراضات کر رہے ہیں۔ صرف انہی اعتراضات کو نقل کرنا اور ان کا جواب دینا کافی ہے۔"
>
> انتہی ملخصاً الکلام ص ۴۰ و ۴۱

اس کے بعد ملاحدہ حال کی دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک تو وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ گو خدا ہماری معلومات و تحقیقات سے باہر ہے لیکن اقرار و انکار کے دونوں پہلوؤں میں سے انکار کا پہلو زیادہ قوی ہے۔ اس قسم کے ملاحدہ کے اعتراضات صفحہ ۴۱ سے صفحہ ۱۵ تک بیان کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو علانیہ اس بات کے مدعی ہیں کہ خدا کا وجود کسیطرح بیان کیا جا تا ہے۔

ہو ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کے ملاحدہ کے اعتراضات صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۴۵ تک بیان کئے گئے ہیں۔

پھر تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ ملاحدہ کس بنا پر خدا کے قائل نہیں ہیں۔ اور خدا کے ثبوت میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں، ان پر ان ملاحدہ کے کیا کیا اعتراضات ہیں، چنانچہ ملاحدہ کا پہلا اعتراض یہ نقل کیا گیا ہے "ثبوت کے جسقدر دلائل ہیں، سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ اگر خدا کا وجود نہو تو سلسلہ غیر متناہی کا وجود لازم آئیگا۔ لیکن غیر متناہی کے محال ہونے پر کوئی دلیل نہیں" (دیکھو الکلام ص ۴۲)

پھر دوسرا اعتراض یہ نقل کیا گیا ہے "خدا کے ثبوت میں یہ مقدمہ بڑے آب و تاب سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے، اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے اشتریح طلب ہے۔ یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم نے جن چیزوں کو پیدا ہوتے دیکھا ہے بغیر علت کے نہیں دیکھا لیکن سوال یہ ہے ہم نے کیا چیز پیدا ہوتے دیکھی ہے؟ کیا ہم نے اصل مادہ کو پیدا ہوتے دیکھا ہے؟ ہم نے جن چیزوں کو پیدا ہوتے دیکھا ہے وہ مادہ کی صورتیں ہیں نہ کہ اصل مادہ۔ اس لئے اس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صورتوں کے پیدا ہونے کے لئے علت درکار ہے اس سے زیادہ جو دعویٰ کیا جائے اس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے بلکہ صرف تخیل ہے۔ اس بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ عالم کیلئے کوئی علت ضرور ہے صحیح نہیں، کیونکہ عالم مادہ کا نام اور مادہ کا حادث و مخلوق ہونا ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے اس کی علت ثابت نہیں ہو سکتی" (دیکھو الکلام ص ۴۳)

چونکہ ملاحدہ کے اس اعتراض سے ایک تہمت تراشی گئی ہے یعنی خط کشیدہ عبارت کو علامہ موصوف کا عقیدہ بتایا گیا ہے۔ (دیکھو فتویٰ مطبوعہ ص ۲ عقیدہ نمبر ۱) اس لئے میں نے اصل کتاب سے اس اعتراض کی پوری تقریر حرف بحرف نقل کر دی تاکہ حقیقت کے سمجھنے اور رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔ اسوقت، ملاحدہ کی پوری تقریر آپکے سامنے ہے اسے پڑھئے خط کشیدہ عبارت کی اصل حقیقت خود بے نقاب ہو جائیگی۔ عبارت متنازعہ درحقیقت ملاحدہ کا ایک استدلال ہے، جو خدا کے عدم وجود پر پیش کیا گیا ہے۔ اس ٹکڑے کو مصنف کتاب کا عقیدہ بیان کرنا انتہائی تدلیس کی حیرت انگیز مثال ہے۔

اس کے بعد ملاحدہ کا تیسرا اعتراض یہ نقل کیا گیا ہے "شاید یہ کہا جائے کہ گو مادہ قدیم اور مخلوق ہے لیکن مادہ

کبھی صورت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان صورتوں کے لئے کوئی علت ہوگی اور وہی خدا ہے لیکن یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ مادہ قدیم ہے اور یہ صورتیں علی سبیل البدلیۃ پیدا ہوتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں الخ (الکلام ص ۴۴)

اس کے بعد خدا کے وجود پر ملاحدہ کا چوتھا اعتراض یہ نقل کیا گیا ہے: "اصل یہ ہے کہ خدا کے وجود کی جو ضرورت ہے وہ صرف اس لحاظ سے ہے کہ نظام عالم کا سلسلہ کس بنیاد پر قائم کیا جائے؟ اس لئے ہم کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ عالم کا وجود اور عالم کا نظام خدا کے وجود کے بغیر فرض کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو خدا کے وجود کی تسلیم کی کوئی ضرورت نہیں رہتی" الکلام ص ۴۴)

اس اعتراض کا خط کشیدہ حصہ بھی علامہ نعمانیؒ کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ (دیکھو فتوی مطبوعہ ص ۳ عقیدہ نمبر ۴)

اس کے بعد ملاحدہ حال نے اپنے اس دعوی پر کہ "بغیر خدا کو مانے ہوئے نظام عالم کا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے"۔ جو دلیل پیش کی ہے۔ اس کو کتاب میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:-

"یہ امر قطعی ہے کہ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر عالم کا مادہ قدیم ہے۔ تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم کی ترکیبی صورت سے پہلے فضاء غیر متناہی میں نہایت چھوٹے چھوٹے اجزاء پھیلے ہوئے تھے ان اجزاء کو علمی اصطلاح میں دیمو قراطیسی کہتے ہیں۔ یہ اجزاء آپس میں ملے اور ترکیب پا کر رفتہ رفتہ یہ عالم پیدا ہو گیا" (الکلام ص ۴۴)

ملاحدہ کی اس دلیل کا ابتدائی خط کشیدہ فقرہ بھی علامہ موصوف کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے (دیکھو فتوی مطبوعہ ص ۳ عقیدہ نمبر ۲)

ملاحدہ کی اس تجویز پر کہ اجزاء دیمو قراطیسی آپس میں خود بخود ملے اور ترکیب پا کر رفتہ رفتہ یہ عالم پیدا ہو گیا۔ ایک اعتراض وارد ہوتا تھا جس کو مع جواب کے ملاحدہ کی زبان سے اسطرح بیان کیا گیا ہے: "اس تجویز پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ اجزاء خود بخود کیونکر مل گئے؟ اور یہ گوناگوں مرکبات خود بخود کیونکر پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح مادہ قدیم ہے حرکت اور قوت بھی قدیم ہے۔ حرکت ان اجزائے دیمو قراطیسی کی فطری خاصیت ہے۔ جو اجسام ہم کو ساکن نظر آتے ہیں ان کے اجزاء دیمو قراطیسی ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ اگر ان کو کبھی سکون ہوتا ہے تو وہ متقابل جذب کے تعارض کی وجہ سے ہوتا ہے بہر حال مادہ کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے اور مادہ کبھی حرکت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر اجزائے دیمو قراطیسی کا باہم مل جانا کوئی استبعاد کی بات نہیں ہے" (الکلام ص ۴۴ و ۴۵)

ملاحدہ کے اس جواب کا ابتدائی خط کشیدہ ٹکڑا بھی علامہ موصوف کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے (دیکھو فتویٰ مطبوعہ ص ۴ عقیدہ نمبر ۱۰)

ملاحدہ کی اس تجویز پر ایک اور شبہہ وارد ہوتا تھا جس کو اصل کتاب میں منکرین خدا کی زبان سے اسطرح بیان کیا گیا ہے۔

"اب جو کچھ شبہہ باقی رہتا ہے وہ یہ ہے کہ محض بخت واتفاق سے ایسی ایسی عجیب وغریب مخلوقات جو سرتاپا حکمت اور صنعت سے بھری ہوئی ہیں۔ کیونکر پیدا ہو سکتی ہیں؟ اسی سوال کو مذہب نے نہایت موثر الفاظ میں ادا کیا ہے اور سمجھایا ہے کہ خدا کا وجود اس سوال کا لازمی نتیجہ ہے" (الکلام ص ۴۵)

اس کے بعد ملاحدہ نے اس شبہہ کا جو جواب دیا ہے اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "اہل مذہب میں بھی دو گروہ ہیں، ایک خدا کو تمام اشیاء کا بالذات خالق مانتا ہے یعنی عالم میں جو کچھ پیدا ہوتا رہتا ہے ایک ایک چیز کو خود بالذات اور بلا واسطہ پیدا کرتا ہے۔ اسباب وعلل اور درمیانی وسایط کوئی چیز نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ خدا نے خلقت کے اصول وقوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جنکے موافق نظام عالم قائم ہے اور نئے نئے حوادث کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب اہل مذہب میں بھی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ عالم کا سلسلہ چند قوانین قدرت پر قائم ہے تو بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ یہ قوانین قدرت خود بخود بنے ہیں یا خدا کے بنائے ہیں؟ اگر پہلا احتمال فرض کر لیا جائے تو خدا کی مطلق ضرورت نہیں رہتی" (انتہی ملخصاً الکلام ص ۴۶)

اس کے بعد ملاحدہ نے یہ ثابت کرنیکی انتہائی کوشش کی ہے کہ قوانین قدرت خود بنتے ہیں۔ چنانچہ انکی مفصل تقریر ڈہائی صفحوں میں نقل کی گئی ہے۔ چونکہ ملاحدہ کی اس تقریر سے بھی دو تہمتیں منتخب کی گئی ہیں۔ اس لئے انکی حقیقت واضح کرنے کے لئے اس بحث کا بیشتر حصہ اصل کتاب سے لفظ بلفظ نقل کرتا ہوں۔

قوانین قدرت خود بنتے ہیں

مادہ کی نسبت یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ قدیم ہے۔ علوم جدیدہ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے یعنی جب محض اجزاء دیمقراطیسی تھے تو یہ اجزاء ہمیشہ حرکت میں تھے۔ اور جب ان اجزاء کی ترکیب سے مختلف اجسام بنے، تب بھی یہ اجزاء ہر وقت خود بخود حرکت میں رہتے ہیں گو ہم کو نظر نہیں آتے۔ ان امور کے تسلیم

کے بعد اس بات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قوانین قدرت کیلئے ایک الگ صانع یعنی (خدا) تسلیم کیا جائے اجزائے دیموقراطیسی جب آپس میں امتزاج پاتے ہیں تو مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر صورت خود ایک خاصہ اور ایک اثر رکھتی ہے یہ خاصہ اور اثر خود اس ترکیب اور امتزاج کا نتیجہ ہے باہر سے کوئی شخص ان صورتوں میں وہ خواص پیدا نہیں کرتا۔ اس مضمون کو یوں سمجھو کہ خود فلسفہ قدیمہ میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ ذاتیات اور لوازم مجعول نہیں مثلاً خدا نے مختلف انواع کے درخت پیدا کئے جنمیں سے ہر نوع کا پتہ شاخیں پھول پھل مزہ، رنگ مختلف ہوتا ہے لیکن یہ چیزیں خدا نے بالذات پیدا نہیں کیں بلکہ اس نوع کو پیدا کیا اور یہ چیزیں اس کے لوازم ہونیکی وجہ سے آپ سے آپ پیدا ہو گئیں"۔ (الکلام ص ۴۷)

ملاحدہ کے دلائل کا جتنا حصہ اس مقام پر اصل کتاب سے نقل کیا گیا ہے، اس کا منشا بالکل واضح ہے، شروع میں ملاحدہ حال نے تحقیقات جدیدہ کے مطابق، اپنے اس دعویٰ پر کہ "قوانین قدرت خود بنتے ہیں" جو دلیل پیش کی ہے۔ اسی کی تائید میں آخر میں فلسفہ قدیمہ کا ایک مسئلہ بھی بیان کیا ہے لیکن ملاحدہ کی اس تقریر کے ابتدائی اور آخری خط کشیدہ فقرے کو بھی علامہ موصوف کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے (دیکھو فتویٰ مطبوعہ صفحہ ۲ عقیدہ نمبر ۳۔ اور صفحہ ۴ عقیدہ نمبر ۹) غور کرو اس جگہ بھی مغالطہ دینے کے لئے انتخاب عبارت میں کیسی شاطرانہ چال چلی گئی ہے۔ پہلے تو ملاحدہ کی مذکورہ بالا تقریر کے شروع و آخر سے دو ٹکڑے اڑائے گئے۔ اس کے بعد ان کو کافی فاصلے کے ساتھ الگ الگ علامہ شبلی نعمانیؒ کا عقیدہ بنا کر لکھا گیا۔ اس قسم کی بدترین تدلیس کا کوئی نمونہ کہیں آپ نے دیکھا ہے؟ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ فلسفہ قدیمہ کا یہ مسئلہ جسکو ملاحدہ نے اپنی دلیل کی تائید میں اور جو دا انھوں نے خواہ مخواہ کے لئے علامہ نعمانی کے سلسلہ عقائد میں بیان کیا ہے، ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے خاتم المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی متفق ہیں، چنانچہ موصوف اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

فانه جعل لكل نوع اوراقاً بشكل خاص وازهاراً بلون خاص وثماراً مختصة بطعوم وبتلك الامور يعرف ان هذا الفرد من نوع كذا وكل اوهذا كلها تابعة للصورة النوعية المتوية	خدا نے ہر قسم کے درخت کے لئے جداگانہ شکل کے پتے، جداگانہ رنگ کے پھول جداگانہ مزے کے پھل بنائے جنکے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص درخت فلاں درخت کے افراد میں داخل ہے، اور یہ سب خاصیتیں صورت نوعیہ کے تابع ہیں اور اسی میں لپٹی ہوئی ہیں۔

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں:-

ولیس لك ان تقول لم کانت ثمرۃ النخل علی	اور تم پوچھ نہیں سکتے کہ خرما کا پھل اس صفت کا کیوں ہوتا ہے
هذه الصفۃ فانہ سوال باطل لان	کیونکہ ایسا سوال کرنا لغو ہے۔ اسوجہ سے کہ ماہیت کے جو لوازم ہیں
وجود لوازم الماھیات معھا لایطالب بلم	اسکے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان کی نسبت یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ
(حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۰)	کیوں ہوئے؟

اس کے بعد ملاحدہ کی باقی تقریر ان لفظوں میں نقل کی گئی ہے:-

"اس امر کے تسلیم کرنے کے بعد کہ مظاہر قدرت کا بڑا حصہ خود اشیا کی صورت نوعیہ کا نتیجہ ہے یعنی ان کو بالذات خدا نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ وہ صور نوعیہ کا لازمی نتیجہ تھیں جو خود بخود ان کے ساتھ پیدا ہو گئیں۔ یہ بحث باقی رہجاتی ہے کہ صور نوعیہ کا خالق کون ہے؟ اسقدر حکمائے قدیم کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ صور نوعیہ قدیم اور ازلی ہیں صور نوعیہ کا قدیم ہونا جب خود اہل مذہب تک تسلیم کرتے ہیں تو اب صرف یہ بحث رہجاتی ہے کہ صور نوعیہ خود بخود پیدا ہو گئیں یا خدا نے پیدا کیں؟ اہل مذہب اس بات پر کوئی دلیل نہیں قائم کر سکتے کہ صور نوعیہ خدا نے پیدا کیں بلکہ یہ احتمال زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ خود بخود پیدا ہو گئیں کیونکہ جب وہ قدیم اور ازلی ہیں تو ان کو بغیر کسی قوی دلیل کے معلول کہنا بالکل خلاف عقل ہے۔ حاصل یہ کہ اجزائے دیمقراطیسی قدیم ہیں۔ ان کے ساتھ حرکت بھی قدیم ہے۔ حرکت سے امتزاج پیدا ہوا۔ امتزاج نے مختلف صور نوعیہ پیدا کیں۔ باقی تمام مظاہر کائنات ان صور نوعیہ کے لازمی نتائج ہیں جیسا کہ خود اہل مذہب کو تسلیم ہے" (الکلام ص ۳۴)

فتوی میں، ملاحدہ کی اس پوری تقریر کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ "اس امر کے تسلیم" سے شروع ہو کر "صور نوعیہ قدیم اور ازلی ہیں" پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور دوسرا حصہ "صور نوعیہ کا قدیم ہونا" یہاں سے شروع ہوا ہے اور "جیسا کہ خود اہل مذہب کو تسلیم ہے" اس پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر حصہ کے متعلق دعوی کیا گیا ہے کہ مصنف الکلام کا یہ ذاتی عقیدہ ہے۔ (دیکھو فتوی مطبوعہ صفحہ ۳ عقیدہ نمبر ۵ و ۶)

ملاحدہ کی پوری تقریر، آپکے سامنے آچکی ہے۔ اسے پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے، پھر فیصلہ کیجئے کہ مخالفین کے ان

اقتباسات میں سچائی کا بھی کچھ شائبہ ہے؟

(ج) ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب

اس باب سے ایک عقیدہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

"ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے"

ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ اور حکمائے اسلام یعنی فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی رائے ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں۔ حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے۔"
(دیکھو فتویٰ مطبوعہ صفحہ ۴ عقیدہ نمبر ۹)

لیکن اصل کتاب میں یہ مضمون کس طرح ہے؟ یہ بھی پیش نظر رہے تو حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس لئے سب سے پہلے ذیل میں کتاب کی پوری عبارت لفظ بلفظ نقل کی جاتی ہے:

ملاحدہ کے اعتراضات کا جواب

ہم کو اس سے انکار نہیں کہ عالم اجزاء دیمو قراطیسی سے بنا ہے۔ ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم ہے۔ جیسا کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ اور حکمائے اسلام یعنی فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی رائے ہے بلکہ جیسا کہ ابن رشد نے تلخیص المقال میں لکھا ہے خود قرآن مجید کی ان آیتوں سے ان السموات والارض کانتا رتقا و کان عرشہ علی الماء ثم استوی الی السماء وھی دخان یہی متبادر ہوتا ہے ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے۔ مختلف قوانین قدرت ہیں۔ جن کے موافق اجزا باہم ملتے ہیں۔ ترکیب پاتے ہیں اور پھر ان میں خاص خاص قویٰ اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا اس کی تفصیل یہ ہے۔ (دیکھو الکلام ص ۵۴)

فتوے کے ناتمام اور محرف اقتباس کے مقابلہ میں کتاب کی پوری اور صحیح عبارت کو رکھ کر غور کیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مخالفوں نے کتنی غلط بیانی کی ہے اور کس پر فریب طریقہ سے کام لیا ہے۔ اس اقتباس کی مثال بالکل

ایسی ہی ہے جیسے لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کے دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر کوئی شخص صرف لاتقربوا الصلوٰۃ (نماز کے پاس بھی نہ جاؤ) ہی سے نماز نہ پڑھنے کا حکم ثابت کرے تو بتاؤ اس کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس اقتباس میں بھی اسی پرفریب طریقہ سے کام لیا گیا ہے، ابتدائی جملے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ اور آخری جملہ "لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا" جو اس پورے فقرہ کی اصل حقیقت تھا۔ نہایت صفائی کے ساتھ حذف کر دیا گیا ہے۔ حذف کی کوشش بے سود کی گئی حقیقت کو چھپانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ فتوے میں آپ اسے حذف کر سکتے ہیں۔ کر دیں۔ لیکن کتاب کے صفحوں سے لفظوں کو تو نہیں چھیل سکتے؟

بہرحال اصل کتاب کی پوری عبارت آپ کے سامنے آچکی، آپ نے اگر غور کیا ہوگا تو حقیقت بھی معلوم ہو گئی ہوگی لیکن اس لئے کہ بات ذرا اور واضح ہو جائے اس کے متعلق چند فقرات عرض کرنا چاہتا ہوں

علامہ موصوف نے گذشتہ باب میں وجود باری پر ملاحدہ کے ایک ایک اعتراض کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔ اور اس باب میں ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ یعنی یہ ثابت کیا ہے کہ خدا کو ماننا بہرحال ضروری ہے خدا کو مانے بغیر مفر نہیں ہے۔

اب غور کرو مخالف کو جواب دینے کی کتنی شکلیں ہو سکتی ہیں؟ عموماً دو ہی طرح پر جواب دیا جاتا ہے یا تو مخالف کے اصولوں کو توڑ کر اس سے اپنا اصول منوایا جاتا ہے۔ اور یا مخالف کے تمام مقدمات کو علی سبیل التنزل تسلیم کرکے خود اسی کے اصول سے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت مسلم ہے کہ دوسرا طریقہ پہلے طریقہ سے زیادہ موثر اور سالم طریقہ ہے۔ پہلے طریقہ میں بحث کا خاتمہ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ کر یزی اور موشگافی آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ بخلاف اس کے دوسرا طریقہ ان تمام نقائص سے محفوظ ہے۔ جب کسی مدعا کو اس طرح ثابت کر دیا جاتا ہے تو مخالف کے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور بجز تسلیم کے کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہتا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ موصوف نے بھی ملاحدہ کو جواب دینے کے لئے یہی دوسرا طریقہ اختیار فرمایا اور پہلے ان کے تمام مقدمات کو علی سبیل التنزل تسلیم کرکے خود انہیں کے مسلمات سے خدا کا وجود تفصیل سے ثابت کیا۔ اس تفصیل کا آخری فقرہ حسب ذیل ہے۔

"قوانین قدرت کا بھی یہی حال ہے عالم میں سیکڑوں ہزاروں قوانین قدرت ہیں لیکن اگر ان میں سے ایک بھی باہمی توافق کے مرکز سے ذرا ہٹ جائے تو تمام نظام عالم برہم ہو جائے - یہ امر بات کی دلیل ہے کہ کوئی اور بالاتر قوت ہے جو ان تمام قوانین قدرت کو محکوم رکھتی ہے اور جس نے ان تمام قوانین میں باہم توافق، تناسب، ربط اور اتحاد پیدا کیا ہے - میٹرلسٹ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "مادہ خود بخود پیدا ہوا - مادہ کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی - حرکت نے امتزاج پیدا کیا - اور پھر رفتہ رفتہ بہت سے قوانین قدرت پیدا ہو گئے" لیکن وہ اس بات کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا کہ ان سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں قوانین قدرت میں یہ توافق، تناسب اور اتحاد کہاں سے آیا؟ توافق اور اتحاد پیدا ہونا خود ان قوانین کی ذاتی خاصیت نہیں ہے - اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو محض ایک فرضی احتمال ہوگا جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی - یہی بالاتر قوت جو تمام قوانین قدرت پر حاکم ہے اور جس نے ان تمام قوانین میں ربط و اتحاد قائم کیا ہے، خدا ہے - یہی معنی ہیں قرآن مجید کی اس آیت کے :-

وله اسلم من فی السموات والارض طوعا وکرھا — زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اسکا کہا مانتے ہیں بجبر یا بخوشی -

یورپ کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفروں کو اسی بنا پر خدا کا اقرار کرنا پڑا ہے" (دیکھو الکلام صفحہ ۵۰) غور کرو! ملاحدہ کو خدا کے سمجھانے کا اس سے بہتر انداز اور کیا ہو سکتا ہے؟ باقی کسطرح پر بھی گر کسی بات کو تسلیم کرنا - ذاتی عقیدہ ہو جانا ہو تو یہ اور بات ہے علامہ نے ملاحدہ کے ان مقدمات کو جو خدا کے عدم وجود پر وہ پیش کرتے ہیں علی سبیل التنزل (بطور فرض) تسلیم کیا ہے لیکن اس کے بعد ہی یہ کہکر کہ "لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا" تمام پچھلی تسلیموں کو رد کر دیا ہے -

یہ جو کہا گیا کہ مصنف نے ملاحدہ کے ان تمام مقدمات کو علی سبیل التنزل (بطور فرض) تسلیم کیا ہے - اس کا ایک تو یہ تو خود اسی عبارت کا آخری ٹکڑا ہے - اس کے علاوہ جسکا یہ عقیدہ ہو کہ عالم کا ذرہ ذرہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے جیسا وجود باری کی بحث میں گذر چکا - اور پھر جس کا یہ عقیدہ ہو کہ "نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے لیکن سب مل کر ایک ہے، یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اسقدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے - جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو" (دیکھو الکلام ص ۶۰) اور جو اس بات کا قائل ہو

"خدا عالم کی علت تامہ ہے"۔ (دیکھو الکلام ص ۶۱) اس کے متعلق یہ کسی طرح نہیں باور کیا جاسکتا کہ وہ ملاحدہ کے کسی مقدمہ کو عقیدۃً صحیح تسلیم کرسکتا ہے۔ یہ تمام تفصیلات اس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ مصنف نے اس جگہ ملاحدہ کے تمام مقدمات کو بطور فرض تسلیم کیا ہے، اس تسلیم کو عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو ہمارے مناظر فرض الباطل مع الخصم حتیٰ تلزمہ الحجۃ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیا ہمارے مفتیان دین اس سے ناواقف ہیں۔

(۲) نبوت

اس باب میں علامہ موصوف کا عقیدہ جس عبارت سے ڈھونڈھ کر نکالا گیا ہے، وہ حسب ذیل :-

"ترقی کا سلسلہ خود انسان کی نوع میں قائم ہے۔ یہانتک کہ قوا عقلیہ، ذہن، ذکا، صفائی باطن اور پاکیزہ خوئی میں ترقی کرتے کرتے انسان ملکوتیت کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ یہی مرتبہ ہے جسکو ہم نبوت اور رسالت سے تعبیر کرتے ہیں"۔

(دیکھو فتوی مطبوعہ صفحہ ۵) اور خلاصہ عقیدۃً بیان کیا گیا ہے کہ "نبوت کسبتہ ہے اس لئے انبیا علیہم السلام نہ معصوم ٹھہر سکتے ہیں نہ آنحضرت خاتم النبیین ہوسکتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں بھی نبی ہونا ممکن ہے"۔

فتوی میں اس اقتباس کے ساتھ کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ تلاش و جستجو کے بعد علم الکلام میں جو فن کلام کی تاریخ ہے ابن مسکویہ کے تذکرہ میں یہ عبارت نظر پڑی جسطرح پچھلے باب میں انتہائی دلیری کے ساتھ ملاحدہ کے اعتراضات کو علامہ کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس باب میں بھی ابن مسکویہ کے ایک خیال کو علامہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ نے علم الکلام میں فن کلام کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ علم کلام کب پیدا ہوا؟ کن اسباب سے پیدا ہوا؟ کس طرح عہد بعہد بڑھا؟ کیا کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں؟ اور کن وجوہ سے ہوئیں غرض یہ کہ اس فن کے متعلق تاریخی حیثیت سے مکمل بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں چونکہ مشاہیر متکلمین اور حکمائے اسلام کا تذکرہ بھی ناگزیر تھا۔ اس لئے اختصار کے ساتھ صفحہ ۶۰ سے لیکر صفحہ ۷۰ تک انکے عام حالات و خیالات کو بھی بیان کیا گیا حکمائے اسلام کے سلسلے میں ابن مسکویہ کا جب تذکرہ آیا تو علامہ موصوف نے ان کے خیالات کو بیان کرنے کے لئے ان کی مختصر

تصنیف الفوز الاصغر کا خلاصہ درج کر دیا جو صفحہ ۱۲۵ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۴۸ پر ختم ہوا ہے۔ اسی بیان میں صفحہ ۱۴۱ سے نبوت کی بحث چلتی ہے اور صفحہ ۱۴۳ کے شروع میں عبارت متنازعہ ختم ہو جاتی ہے۔ ابن مسکویہ کی اصل عبارت حسب ذیل ہے:

"ويبلغ الانسان هذه المرتبة متصاعدا فيها الى غاية افقه التى ان تجاوزها لم يكن انسانا بل صار ملكا كريما وينبغى ان تتصور ذلك كما تصورت تلك الوسائط الاخرى فى اواخر آفاقها ومن هٰهنا يمكن ان يتبين كيفية الوحى واتصال تلك القوة الشريفة بالانسان" (الفوز الاصغر مطبوعہ مصر ص ۹۲)

تفصیل بالا سے یہ واضح ہو گیا کہ اس عبارت کو مصنف کتاب کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے نفس اعتراض کا اتنا جواب کافی تھا لیکن چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے متعلق علامہ نعمانیؒ کے اصل خیالات بھی پیش کر دوں۔ تاکہ اس بہتان کی حقیقت تفصیل سے واضح ہو جائے۔

حیرت ہے کہ جس شخص کے متعلق خواہ مخواہ کے لئے ایک خبیث شخص کی تحریر پر نبوت کو مکتسبہ کہنے، آنحضور صلعم کو خاتم النبیین نہ ماننے کا اتہام لگایا جاتا ہے وہی شخص اپنی کتاب الکلام میں جہاں اس حقیقت کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ نبوت غیر مکتسبہ ہے۔ آنحضور خاتم الانبیاء ہیں۔ اسلام خدا کا بھیجا ہوا آخری مذہب ہے۔ اس کے بعد دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں تو اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔

بہرحال ملاحظہ ہو علامہ موصوف لکھتے ہیں:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

بعث فى الاميين رسولا منهم يتلو عليهم اٰيٰته ويزكيهم

نبوت کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد آنحضرت صلعم کا نبی ہونا ایک بدیہی مسئلہ رہ جاتا ہے۔ نبی کی حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہوا اجزائے ذیل سے مرکب ہے (۱) خود کامل ہو (۲) دوسروں کو کامل کر سکتا ہو (۳) اس کے علوم و معارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔ یہ تمام باتیں جس کمال کے ساتھ آپ کی ذات مبارک میں

موجود تھیں کیا ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟ غور کرو وہ شخص جس نے کسی قسم کی ظاہری تعلیم نہ پائی ہو جس نے آنکھ کھول کر اپنے گرد و پیش بت پرستی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا ہو جس کے کانوں میں ناقوس کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی ہو جس نے الٰہیات، اخلاق، اصول معاشرت، قانون تمدن کے متعلق ایک حرف بھی کسی سے نہ سنا ہو دفعتہً منظر عام پر آئے اور ایک طرف تو فلسفہ اخلاق تزکیہ روح الٰہیات معاد، قانون معاشرت، اصول تمدن کے وہ دقائق اور نکات بتائے جو کسی حکیم کسی فلسفی کسی مقنن اور کسی پیغمبر نے بھی نہیں بتائے تھے۔ دوسری طرف تمام قوم کی قوم میں جو اسوقت جہالت و وحشت اور ظلم، فسق و فجور، سفاکی و خون ریزی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پاکیزہ اخلاق اور سچائی کی وہ روح پھونک دے کہ دفعتہً ان کی کایا پلٹ ہو جائے بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون ہو سکتا ہے۔" (دیکھو الکلام صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱)

اس کے بعد آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت دنیا کی جو حالت تھی اس کا ذکر کرکے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو خیال اس کے دل میں آتا ہے وہ انہی واقعات، روایات اور خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوتے ہیں۔ انہی سے وہ ادل بدل کر ایک دوسری صورت بنا لیتا ہے۔ اب غور کرو کہ اگر اقتضائے فطرت کی رو سے آنحضرت کے دل میں خدا کا خیال آتا تو اسی قسم کا خدا ہوتا جو اس زمانہ کے لوگوں کا تھا لیکن آپ نے جس خدا کی تلقین کی وہ ایسا خدا تھا جو واحد محض ہے جس کی ذات و صفات میں کسی شخص کو کسی قسم کا اشتراک نہیں جو نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں، نہ اوپر نہ نیچے، نہ دائیں نہ بائیں، نہ زمان میں نہ مکان میں اور پھر ہر جگہ ہے جو ایک ایک ذرہ کو جانتا ہے، چیونٹی کے پاؤں کی آہٹ کو سن لیتا ہے۔ ہمارے دل کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔ ایسا منزہ، ایسا کامل، ایسا بالاتر خدا انسان خود اپنے خیال سے نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ بلکہ وہی خدا یہ خیال پیدا کرا سکتا تھا جو ان صفات کیساتھ موصوف ہے۔" (دیکھو الکلام صفحہ ۱۴۲)

اور آگے چلکر لکھتے ہیں:۔

"اب ہم تفصیل کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت کے متعلق آنحضرت صلعم نے جو اصول اور مسائل وحی کے ذریعہ سے تلقین فرمائے وہ اسقدر کامل اور اعلیٰ درجہ کے ہیں کہ کسی حکیم اور مقنن کے خیال میں نہیں آئے اور بغیر وحی الٰہی کے کسی کے خیال میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔" (دیکھو الکلام صفحہ ۱۴۳)

اس کے بعد مصنف علیہ الرحمۃ نے صفحہ ۱۳۳ سے لیکر صفحہ ۱۶۴ تک اور پھر صفحہ ۲۱۸ سے لیکر صفحہ ۲۴۲ تک کل ستاون صفحات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک اسلامی تعلیم کو تمام دیگر مذاہب کی تعلیمات سے مقابلہ کرکے نہایت ہی خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اسلام خدا کا بھیجا ہوا آخری مذہب ہے۔ اس مذہب کے بعد دنیا کو کسی اور مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ الکلام صفحہ ۱۰۲ میں، توحید کے بیان میں لکھتے ہیں:-

"اسلام کو اس باب میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے توحید کو کامل یعنی شرک کے ہر قسم کے شائبوں سے پاک کر دیا اور یہ منجملہ ان تکمیلوں کے ہے جنکی وجہ سے اسلام کے بعد اور کسی مذہب کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ کمال کے بعد پھر کوئی درجہ نہیں۔"

غور کرو کسقدر اندھیر ہے کہ جس مسئلہ کو پوری کتاب کے تقریباً چوتھائی حصہ میں پھیلا کر اسقدر بسط کے ساتھ لکھا گیا ہو اس کی طرف سے تو آنکھیں بند کر لیجائیں اور علم الکلام کا ایک فقرہ جس کی حقیقت اوپر گذر چکی۔ خواہ مخواہ کے لیے ایک مومن کو کافر ثابت کرنے کے لیے ڈھونڈ کر نکالا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(۳) معجزات

اس مسئلہ میں، علامہ شبلی نعمانی کو جس بنا پر کافر کہا گیا ہے، وہ الکلام کی حسب ذیل عبارت ہے

"عالم میں علل و اسباب کا سلسلہ جاری ہے یعنی جو چیز وجود میں آتی ہے۔ اس کے علل و اسباب ہوتے ہیں۔ اور جب کسی شے کے علل و اسباب موجود ہوتے ہیں تو ضرور اس شے کا وجود ہوتا ہے۔ اب معجزے کی اگر یہ تعریف ہے کہ علت و معلول کے سلسلے کے خلاف وقوع میں آئے تو معجزہ بداہتہً باطل ہوگا۔ الکلام صفحہ ۶۶ (دیکھو فتوی مطبوعہ صفحہ ۵)

لیکن جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے اور جس کو فتوی میں بزعم خود مصنف کتاب کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ واقعی اتہام بھی کہاں تک صحیح ہے؟

اصل یہ ہے کہ علامہ نے سب سے پہلے صفحہ ۶۲ میں نبوت کی تشریح کی۔ اسی ذیل میں معجزہ کا ذکر آیا۔ ملاحدہ کے نزدیک معجزہ ناممکن ہے اس لیے ملاحدہ معجزات پر اعتراض کرکے نبوت پر قدح کرتے ہیں صفحہ ۶۴ میں ملاحدہ کے ان اعتراضات کو

جو سلسلہ معجزات نبوت پر وارد ہوتے ہیں "خرق عادت کے مسئلہ کی بنا پر نبوت پر اعتراض" کے عنوان سے درج کیا گیا جس کا سلسلہ ص ۴۳ تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ص ۴۴ سے ص ۶۰ تک نبوت پر عام اعتراضات نقل کئے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ ص ۴۴ سے لیکر ص ۶۰ تک ۱۶ صفحات میں نبوت پر جن جن حیثیتوں سے جتنے اعتراضات کئے جاتے تھے سب کو لکھ گیا۔ اور اسی کے بعد ص ۶۰ سے "نبوت اور خرق عادت کی اصل حقیقت" کھول کر بیان کی گئی ہے جس کا سلسلہ ص ۱۳۰ پر جا کر ختم ہوا ہے۔

فتویٰ میں جو اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ص ۶۶ سے ماخوذ ہے۔ اس لئے غور فرمایئے کہ اس عبارت کا تعلق کس سے ہو سکتا ہے؟ منکرین نبوت کے اعتراض سے یا مصنف کتاب کے ذاتی عقیدہ سے؟ اس قرینہ کے علاوہ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ص ۶۶ میں جہاں عبارت متنازعہ ختم ہوتی ہے۔ وہیں علامہ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "امام رازی نے مطالب عالیہ میں جہاں اس اعتراض کی تقریر کی ہے لکھتے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ بدیہی و نظری۔ نظری بدیہی پر متفرع ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی نظری ایسا ہو جو بدیہی کو باطل کرتا ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ فرع اصل کے خلاف ہے اور یہ محال ہے اس سے معلوم ہوا کہ علوم نظری بدیہیات میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ اب ہم جب غور کرتے ہیں کہ بدیہی کیا چیز ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو علم انسان کو خود بخود یقینی طور پر حاصل ہوتا ہے جس میں وہ کسی طرح شک نہیں کر سکتا وہی بدیہی ہے۔ جب یہ مقدمہ ثابت ہو چکا تو ہم کہتے ہیں کہ جب ہم کسی انسان کو دیکھتے ہیں تو ہم کو قطعی یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص پہلے رحم میں تھا پھر حسب رسم بچہ ہو کر نکلا۔ بچہ سے جوان ہوا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں بلکہ "دفعۃً" پیدا ہو کر جوان ہو گیا تو ہم قطعاً یقین کرلیں گے کہ یہ شخص غلط کہہ رہا ہے اور اس کا قول باطل و افترا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خرق عادات کا دعویٰ ایک لغو بات ہے اور جب یہ کلیہ ثابت ہو چکا تو ہم چند مثالوں کے ذریعہ سے اس کو سمجھاتے ہیں" (دیکھو الکلام ص ۶۶)

اس تشریح کے بعد کچھ اور عرض کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن مزید اطمینان کے لئے امام صاحب کی مطالب عالیہ سے اس اعتراض کی تقریر ان کے اصل الفاظ میں بھی نقل کر دیتا ہوں۔ امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت کی بحث کو تخمیناً ۹۰ صفحوں میں لکھا ہے۔ اس میں سے قریباً ۵ صفحے صرف ملاحدہ کے اعتراضات کی تفصیل میں ہیں بہر حال امام صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

احتج المانعون من خرق العادات بوجهين: الاول قالوا علومنا قسمان بديهية و
كسبية والكسبيات مفرعة على البديهيات واذا كان كذلك كان كل شيء يوجب
القدح في البديهي كان قادحاً في الاصل والفرع معاً واذا كان كذلك كان فاسداً فعلمنا
ان العلوم الكسبية يمتنع كونها قادحاً في العلوم البديهية ثم انا اذا اردنا ان نبحث
عن حقيقة العلوم البديهية لم نجد لها معنى الا العلم الحاصل في النفس ابتداً
على سبيل الجزم من غير ان يقدر الانسان على تشكيك نفسه فيه فلما كان كذلك
كان علمنا [illegible] عرفت هذه [illegible] اذا [illegible] لما [illegible] كان [illegible]
[illegible] لا ينفصل عن الجزم بانه كان [illegible] ولو جوزنا
[illegible] كان كذلك بل انه [illegible] الآن شيئاً من غير هذه المقدمات والمواد
قطعنا بانه كاذب في هذا القول وجزمنا بان الذي يقوله باطل وبهتان فلما
كان هذا الجزم حاصلاً [illegible] من غير ان يستفاد ذلك الجزم من دليل
متقدم ومن قياس سابق علمنا انه من العلوم البديهية اذا ثبت هذا فنقول
لو قلنا بحدوث انسان شاب [illegible] من غير تلك المقدمات والمواد لكان
لزمنا ان نمنع [illegible] مع هذا التجويز ذلك القطع والجزم البديهي فثبت ان
الحكم بهذا التجويز حكم [illegible] يوجب القدح في البديهي وقد بينا ان كل ما كان
كذلك فانه باطل فوجب ان يكون الحكم بهذا التجويز باطلاً فثبت بهذا الطريق
ان القول بخرق العادات عن محال يكون باطلاً اذا عرفت هذا الاصل
فنذكر له امثلة　　　(مطالب عالیه ص ٢٠٥ و ٢٠٦)

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، رفع اتہام کے لئے بالکل کافی ہے۔ لیکن چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کے متعلق بھی

مصنف کتاب کی تحقیقات کچھ عرض کر دوں۔ جو اسی کتاب میں چند ہی صفحوں کے بعد تحریر فرمائی گئی ہیں۔ علامہ موصوف الکلام ص ۱۱۵ میں لکھتے ہیں:۔

"خرق عادت تمام مذاہب کا ضروری عنصر ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں۔ فرقہ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ بے شبہ اشاعرہ کی افراط بجوئی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے"

اس کے بعد اپنے زمانہ کے نئے مفسرین پر نکتہ چینی کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:۔

"خرق عادت کے منکرین کا تمام تر استدلال صرف یہ ہے کہ خرق عادت قانون فطرت کے خلاف ہے اور جو چیز قانون فطرت کے خلاف ہے وہ ممتنع ہے۔ اس دلیل کے دوسرے مقدمہ سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن پہلے مقدمہ کے ثابت ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا فطرت کے تمام قوانین منضبط ہو چکے ہیں؟ کیا اس پر اطمینان ہو چکا ہے کہ ہم جن امور کو قانون فطرت سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت قانون فطرت ہیں؟ علوم جدیدہ کی تحقیقات اور تجربے سیکڑوں ایسے قانون فطرت دریافت کئے جو پہلے مطلق معلوم نہ تھے اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے۔" (دیکھو الکلام ص ۱۱۷)

اس کے بعد علامہ موصوف نے ص ۱۱۷ سے لیکر ۱۲۶ تک ۹ صفحات میں ملاحدہ حال کی تشفی کے لئے خرق عادت کے ثبوت میں یورپ کے مشہور و مستند حکماء و فضلا کے اقوال و آراء نقل کئے ہیں کیا ان تصریحات کے بعد بھی علامہ نعمانی کو منکر معجزات و خارق عادات کہا جا سکتا ہے؟

(۴) معاد اور عذاب و ثواب

علامہ شبلی نعمانی رحمتہ اللہ علیہ کے فرد قرارداد جرم کی یہ آخری دفعہ ہے۔ اس کے ثبوت میں فتوے میں الکلام کے صفحہ ۱۳۹ سے حسب ذیل عبارت نقل کی گئی ہے:۔

"سزا و جزا کے متعلق تمام اہل مذاہب کا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ انسان جب خدا کے احکام کی تعمیل نہیں

کرتا تو خدا اس سے ناراض ہوتا ہے اور چونکہ دنیا دار العمل ہے اس لئے یہاں انسان کو سزا نہیں ملتی لیکن جب قیامت میں خدا مسند حکومت پر متمکن ہوگا تو تمام معاملات اس کے حضور میں پیش ہونگے۔ وہ حسب مراتب لوگوں کو انکی نافرمانیوں کی سزا دیگا۔ اسی طرح جن لوگوں نے اطاعت اور فرمانبرداری کی ہے۔ ان کو صلے اور انعامات ملیں گے یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے اور عام لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طرز نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ عذاب و ثواب کی اصل حقیقت نہیں بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنیکا ایک پیرایہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جسطرح عالم جسمانیات میں اسباب و علل اثر و موثر کا سلسلہ ہے۔ مثلاً سنکھیا قاتل ہے۔ گلاب محرک نزلہ ہے۔ املتاس مسہل ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ روحانیات میں بھی قائم ہے۔ نیک و بد جسقدر افعال ہیں ان کا نیک و بد اثر روح پر مترتب ہوتا ہے۔ اچھے کاموں سے روح کو انبساط ہوتا ہے۔ برے افعال سے انقباض، آلودگی اور نجاست کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ نتائج ہیں جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ فرض کرو ایک شخص نے کسی کی کوئی چیز چرائی اب اگر وہ شخص جس کی وہ چیز تھی معاف بھی کردے تو چوری کرنے سے اس شخص کی عزت پر جو داغ آگیا وہ کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتا۔ غرض اچھے کاموں سے جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے اور برے کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا نام عذاب و ثواب ہے۔ اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہے۔" (دیکھو نسخہ مطبوعہ ص ۶۵۹)

لیکن اس حوالہ میں بھی حسب عادت، آخری فقرہ قصداً حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل کتاب میں جہاں اس عبارت کا آخری لفظ ختم ہوتا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ:- "امام غزالی مضنون بہ علی غیر اہلہ میں لکھتے" اور اس کے نیچے امام موصوف کے اصل عربی عبارت کے ضروری فقرے بھی درج کر دیئے گئے ہیں (دیکھو الکلام ص ۱۴۰) جس کا صاف منشا یہ ہے کہ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت میں امام غزالی کی کتاب مذکورہ بالا کا خلاصہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ پورے بیان کو سامنے رکھکر اس عبارت کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اسی وجہ سے لوگوں کو سخت دھوکا ہوا۔ بات یہ ہے کہ عذاب و ثواب مذہب کا ایک معرکہ آرا مسئلہ ہے۔ اس بارہ میں ملاحدہ کا خیال ہے کہ چونکہ

مذہب انسان کی ایجاد ہے اور انسانی تمدن کے نمونے پر قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے عذاب و ثواب کا مسئلہ بھی اس میں شامل کیا گیا۔ ورنہ عذاب و ثواب خدا کی شان سے بالکل بعید ہے۔ مصنف الکلام کو اس بارہ میں ملاحدہ حال کے جن اعتراضات سے سابقہ پڑا۔ انہی اعتراضات سے امام غزالی کو بہت پہلے پڑ چکا تھا۔ امام صاحب نے مضنون بہ علی غیر اہلہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور ان اعتراضات کو نہایت خوبی سے اٹھایا ہے۔ اسی کتاب کا ماحصل ہے جس کو مصنف الکلام نے صفحہ ۱۳۹ میں درج کیا ہے۔ چنانچہ یہ لکھکر کہ "امام غزالی مضنون بہ علی غیر اہلہ میں لکھتے ہیں" خود اپنے ماخذ کا حوالہ بھی دیدیا ہے۔ امام صاحب کے خاص الفاظ یہ ہیں:۔

اما العقاب علی ترك الامر وارتکاب النهی فلیس	اوامر و نواہی کی عدم تعمیل پر جو عذاب ہوگا وہ غضب یا انتقام نہیں ہے
العقاب من الله تعالیٰ غضباً و انتقاماً و مثال	اسکی مثال یہ ہے کہ جو شخص بیوی سے صحبت نہ کریگا خدا اسکو اولاد نہ دیگا
ذلك ان من غادر الوقاع عاقبة الله تعالیٰ	جو شخص کھانا پینا چھوڑ دیگا خدا اس کو بھوک پیاس کی تکلیف دیگا
بعدم الولد ومن ترك الاكل والشرب عاقبه	طاعات و معاصی کو قیامت کی تکلیفات اور لذائذ سے بھی بالکل یہی
بالجوع والعطش فكذلك نسبة الطاعات	نسبت ہے۔ یہ اعتراض کرنا کہ معصیت پر کیوں عذاب ہوگا؟
والمعاصی الی آلام الآخرة ولذاتها من غیر فرق	گویا یہ کہنا ہے کہ جاندار زہر سے کیوں ہلاک ہوجاتا ہے اور زہر کیوں
فالسوال عن انه لم تفضی المعصیة الی العقاب	ہلاکت کا سبب ہے؟
كالسوال فی انه لم یهلك الحیوان عن السم	
ولم یودی السم الی الهلاك (مضنون بہ علی غیر اہلہ مطبوعہ مصر ص)	

اس تشریح کے بعد اگر آپ نے غور کیا ہوگا تو اصل حقیقت سمجھ میں آگئی ہوگی۔ ملاحدہ کا اعتراض ہے کہ: خدا کو گناہ پر عذاب دینے سے کیا حاصل؟ انتقام تو وہ شخص لیتا ہے جسکو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہو یا پہنچنے کا اندیشہ ہو اور خدا اس سے بری ہے اگر تمام عالم فسق و فجور میں پڑ جائے یا نماز روزہ نہ بجالائے تو اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ اس صورت میں انتقام لینا بے فائدہ ہے۔ اور ملاحدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت تمام اہل مذاہب نے خدا کا تصور بالکل انسانی حیثیت سے کیا ہے اور چونکہ وہ دیکھتے ہیں

دنیا کے بادشاہوں کو احکام کی نافرمانی سے سخت طیش اور ملال ہوتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سخت سزائیں دیتے ہیں۔ اس لئے اہل مذاہب نے خدا کی نسبت بھی یہی خیال قائم کیا کہ وہ گناہوں سے ناراض ہوتا ہے اور قیامت میں گنہگاروں کو دوزخ میں عذاب گوناگوں دیگا۔" (دیکھو الکلام صفحہ ۱۴۱ بحث متنازعہ) عبارت متنازعہ میں اسی اعتراض کو اٹھایا گیا ہے کہ جس طرح خدا پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ سنکھیا کھانے پر فلاں شخص کو کیوں مار ڈالا؟ اسی طرح یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا کہ فعل بد کے ارتکاب پر خدا نے عذاب کیوں دیا؟ کیونکہ عذاب اس فعل بد کا لازمی نتیجہ تھا۔ جو اس سے منفک نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر قیامت میں اوامر و نواہی کی عدم تعمیل پر جو عذاب ہو گا اس کا منشا غضب یا انتقام نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو بلکہ وہ عذاب ان افعال کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

پھر عالم آخرت میں ان کی کیفیت کیا ہوگی؟ عبارت متنازعہ میں اس سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ملاحدہ کو اعتراض نفس عذاب وثواب پر تھا۔ اس کی کیفیت و نوعیت پر نہ تھا۔ اس لئے اتنے ہی جواب پر اکتفا کیا گیا

حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام روداد آپ کے سامنے ہے۔ غور سے پڑھئے۔ اور بار بار پڑھئے اور ایک ایک واقعہ کو جانچئے اور پھر دیکھئے کہ مخالفوں نے علامہ کو کافر ثابت کرنے کے لئے کیا کیا غلط بیانیاں کی ہیں؟ کس کس طرح واقعات کو بدلا ہے؟ کیا کیا غلط نتائج قائم کئے ہیں؟ کیسے کیسے پر فریب طریقوں سے کام لیا ہے۔ علامہ شبلی تو کیا اگر یہ کوششیں کسی بڑے سے بڑے مستند امام مذہب کے متعلق صرف کی جاتیں تو وہ بھی کافر ہو جاتے۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا

ادبیات

غزل

از مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ

حرم سے جاتے ہیں طیبہ کو یوں ترے مخمور
نظر میں جلوۂ ساقی، جگر میں شعلۂ طور

خمار نرگس ساقی کا فیض کیا کہنا
تڑپ رہی ہے نگاہوں میں موج بادۂ نور

خطا معاف اگر لب پہ ہے انا المحبوب
کہ تازہ کرنی ہے پھر رسم سرمد و منصور

وہ بادہ دے جو رگ برق سے مخمر ہو
نہیں ہے رند کو ذوق عصارۂ انگور

بہت بلند نظر ہیں ترے شہید جمال
وہ اور ہوں گے جنھیں ہو تلاش جلوۂ طور

بلا لے اپنے غلاموں کو آستانے پر
تڑپ رہے ہیں بہت تیری جلوہ گاہ سے دور

فتنۂ تکفیر

بعض اکابر کی رائیں

الاصلاح بابت فروری ۱۹۳۶ء کے جن فقروں پر بعض لوگوں نے تکفیر کا فتویٰ شائع کیا تھا۔ انکی نسبت ہم نے ہندوستان کے اکابر علماء کی رائیں دریافت کی تھیں۔ جن میں ہر مسلک و خیال کے علماء شامل ہیں۔ تقریباً ہر حلقہ سے جوابات موصول ہو چکے ہیں جو عنقریب علٰحدہ رسالہ کی صورت میں چھاپکر شائع کر دئے جائیں گے۔ ذیل میں بعض اکابر کی تحریریں شائع کیجاتی ہیں۔ (اڈیٹر)

نقل تحریر[1] حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جانشین شیخ الہند و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔

محترما! زید عنایتکم

بعد از سلام مسنون عرض آنکہ میں نے الاصلاح کے پرچوں کو مختلف مقامات سے مطالعہ کیا مجھے ان میں ایسی کوئی چیز (میرے فہم کے موافق) نہیں ملی جس کا کوئی صحیح محمل نہو سکے۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۱۰ر صفر ۱۳۵۵ھ

نقل تحریر امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ۔

جی فی اللہ السلام علیکم۔ جس عبارت کی نسبت آپ نے استفسار کیا ہے، اس کا مطلب وہی ہے جو آپ نے اپنی تحریر میں واضح کر دیا ہے۔ اس عبارت کی بنا پر صاحب عبارت کی تکفیر کی جرأت عجائب وجوہ تکفیر میں سے ہے۔ بلاشبہہ عبارت میں پوری وضاحت نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ بطور یادداشت کے لکھی گئی تھی اور مقصود ایک

---

[1] یہ تحریر قول فیصل کے علاوہ ہے۔ قول فیصل اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ (الاصلاح)

معاملہ کی طرف اشارہ کر دینا تھا، نہ کہ بحث و توضیح کا حق ادا کرنا۔ اہل علم و حق کا طریقہ یہ ہے کہ ہر قول کا مطلب قائل کے عقائد و مسلک کے مطابق ٹھہراتے ہیں، نہ یہ کہ پہلے بطریق جدل و خصومت ایک دور از کار بات ٹھہرالینی، پھر تفسیق و تکفیر تک اسے پہنچا دینا اگر یہ طریقہ تسلیم کر لیا جائے تو صاحب عبارت کی کیا خصوصیت ہے؟ کوئی مسلمان بھی تکفیر سے بچ نہیں سکتا، جس کو ہم کافر بنانا چاہیں، کوئی نہ کوئی بات اس کی پکڑلی جا سکتی ہے۔ اور پھر بطریق لزوم مخاصمانہ کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیا جا سکتا ہے۔

صاحب عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے نام اس طریق پر نہیں رکھے گئے ہیں جو تدوین علوم و کتب کے صناعی طریقوں میں اختیار کیا گیا ہے یعنی ہر کتاب اور مقالہ کے لئے ایسا نام تجویز کرنا، جو اس کے موضوع اور مقصد پر دلالت کرتا ہو۔ چونکہ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں، اس لئے بسا اوقات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں، ان ناموں کے ذریعہ سورت کے تمام مطالب کا سراغ لگانا چاہئے۔ چنانچہ یورپ کے بعض مترجمین قرآن کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور اس غلط فہمی کی بنیاد پر بہت سی عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ پس عبارت میں غلط خیال پیدا ہونیکا مطلب یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ یہ طریقہ غلط ہے بلکہ لوگوں کی غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مولانا حمید الدین مرحوم، جن کی عبارت پر یہ ہنگامہ بپا کیا گیا ہے، ان علماء حق میں سے تھے، جنکا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں ہوتا، بلکہ عمل بھی ہوتا ہے۔ اور اس دوسری جنس کی کمیابی کا جو عالم ہے وہ اہل حق سے پوشیدہ نہیں۔ میں جب کبھی ان سے ملا، مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے۔ ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھکر رشک ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے ایسے مقدس اور مرتاض انسان کی تکفیر کی جرأت کی ہے اللہ ان کے حال پر رحم فرمائے۔

دہر چو من یکے، و آں ہم کافر

پس در ہمہ دہر یک مسلماں نہ بود

امید ہے کہ اس علاقہ کے مسلمان اس طرح کے خانہ ساز فتنوں سے بالکل متاثر نہ ہوں گے اور مدرسۃ الاصلاح

کی خدمت و اعانت میں پوری طرح سرگرم رہیں گے۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین ھداھم اللہ و اولٰئک ھم اولوا الالباب ط

ابوالکلام۔ کلکتہ۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۶ء

نقل تحریر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار۔

الاصلاح کی جن عبارات کی بنا پر مولانا حمید الدین فراہی مرحوم اور ان کے ہم خیالوں پر فتوی تکفیر ارباب افتاء و صاحب درس نے صادر فرمایا ہے۔ میرے نزدیک یہ فتوی غلط فہمی یا عدم تدبر پر مبنی ہے۔

مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے جس وقت نظر کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کر کے قرآن کریم کے مضامین عالیہ اور اس کے اسلوب بیان اور طرز ادا کو جس عنوان سے قوم و ملت کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کا ثمرہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کلام ربانی ہے اور تمام لفظی اور معنوی عیوب و نقائص سے پاک ہے۔

جو شخص قرآن کریم کا اس درجہ احترام کرتا ہو کہ اس کے اردو ترجمہ میں بھی قرآن کریم کے الفاظ کے معانی اور اسلوب بیان کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہو، یہاں تک کہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ "قرآن کے ترجمہ میں بڑی ذمہ داری ہے" اس کے متعلق یہ رائے کیونکر قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ قرآن کریم کے کسی لفظ کے غیر فصیح اور کسی عبارت کے غیر بلیغ ہونے کا قائل ہے۔ الاصلاح کے جن لفظوں پر مفتیوں نے گرفت کیا ہے۔ بظاہر ان سے غلط فہمی ہو سکتی ہے مگر ارباب علم کو غور کرنا چاہیے کہ ان الفاظ سے متکلم کا مقصود کیا ہے قرآن کریم پر طعن ہے یا ملحدین اور معترضین کے طعنوں کا رفع کرنا ہے۔ اگر مولانا کی تفاسیر و نیز الاصلاح کے مضامین پر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا مطمح نظر قاصرین اور ملحدین کے طعنوں کا رفع کرنا ہے۔

اس لئے مجھے حیرت ہے کہ جو تحریر کفر و الحاد کے انسداد کے لئے لکھی جائے، وہی تحریر بعض علماء کے نزدیک باعث کفر و الحاد ہو جائے، اور سب سے زائد مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ علمائے دیوبند جو فتوی تکفیر میں نہایت محتاط ہیں

آج سب سے پہلے وہی ایک ایسے شخص کی تکفیر کے لئے اٹھے ہیں جو قرآن کریم کی صداقت اور اس کے اعجاز کے ثبوت کے لئے بہترین ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین

مگر الحمد للہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی تحریر کو دیکھ کر اطمینان ہوا کہ انھوں نے الاصلاح کے پرچوں کو ملاحظہ فرما کر اپنی صحیح رائے ظاہر فرما دی ہے اور حضرات مکفرین کے رویہ سے بیزاری کا اظہار فرما دیا ہے۔ وکفی بہ قدوۃ۔ فقط واللہ اعلم بالصواب ناچیز ابو المحاسن محمد سجاد کان اللہ لہٗ۔ نائب امیر شریعت صوبہ بہار

نقل تحریر حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔

جس جماعت کو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت حق تعالیٰ نے سپرد کی تھی اسکو جتلا دیا گیا تھا کہ

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء ھم البینات واولئک لھم عذاب عظیم۔

لیکن واحسرتا! تنزیل رب العالمین کے اس قطعی حکم کی تعمیل میں اس جماعت نے ادھان سے کام لیا اور اختلاف کے ساتھ تفریق کے بھی مرتکب ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کو باہم جدا کرنیکا کام جنھوں نے اپنے سر لیا اور بینات سے کنارہ کش ہو کر بعض متشابہ الفاظ کی اتباع میں یہ فتنہ کی حد تک پہنچے، اسی سلسلہ میں مولانا حمید الدین مرحوم کی تحریر کے وہ چند الفاظ ہیں۔ اصولی طور پر میں ذاتی حیثیت سے قرآن کے ہر لفظ کو اسی جگہ پر سمجھتا ہوں، جہاں پر اس کو ہونا چاہئے کہ تعبیر کی قوت وقدرت جسمیں علی وجہ الکمال ہے۔ قرآن پاک اسی کی تعبیر اور اسی کا کلام ہے۔ عربی فصاحت کا اہم رکن سجع وقافیہ ہے۔ اس کے لئے جو مناسب ترین لفظ ممکن تھا، قرآن نے اس کو استعمال کیا۔ اور فصیح کامل کو یہی کرنا چاہئے۔ اب اگر کسی اور پہلو سے اس لفظ کو غیر انسب کہا جائے تو غیر انسب نہیں ہے بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ قرآن نے اظہار مدعا کے مقصد کو باقی رکھتے ہوئے کمال فصاحت کی رعایت اپنے بیان میں کی ہے۔ کہ یہی صداقت قرآن کی ایک آیۃ اور اس کا برہان ہے جس کو عام طور پر معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت کو متعدد مقامات میں بطور تحدی کے پیش کیا ہے۔

ایسی صورت میں اگر "غیر انسب" کے لفظ کو اردو زبان کے محاورہ کی رو سے بھی استعمال کیا جائے تو اس میں

بظاہر کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ چہ جائے کہ اس کے قائل پر کفر کا فتویٰ لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ا
وانتشار پیدا کیا جائے فنعوذ باللہ من شرور انفسنا یہی حال اسماء سور اور رکوع وغیرہ مصطلحات کا ہے۔ یقیناً
اس قسم کے اختلاف حد کفر کو نہیں پہنچتے۔ تو حضرت الاستاذ الامام مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی نے پڑھ لاہ
کے ان مضامین کو ملاحظہ فرما کر یہی رائے قائم فرمائی ہے فکفی بہ قدوۃ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

نقل تحریر حضرت مولانا عبد الماجد صاحب مدظلہ مدیر "صدق"

مولانا "اسمائے سور" کے متعلق ایک مستفسر کا جواب دیتے ہوئے "صدق" میں تحریر فرماتے ہیں۔ (الاصلاح)

صاحب مراسلہ کا شکریہ کہ انھوں نے ایک نہایت ضروری فروگذاشت کی طرف توجہ دلادی۔ مولانا مرحوم کا یہ مضمون صدق میں نقل ہونے کے لئے دیا گیا تو چاہیے یہ تھا کہ اسی وقت اس پر بعض ضروری حواشی لکھدئے جاتے، جنکے بغیر شدید غلط فہمیوں اور الجھنوں کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس وقت دوسری مصروفیتوں میں یہ بات بالکل ذہن سے اتر گئی۔ قصور اس میں صرف مدیر صدق کا ہے۔ کسی دوسرے کا نہیں ——— مولانا کا وہ مضمون، درحقیقت بجنسہ اشاعت کے لئے تھا بھی نہیں۔ وہ تو محض ان کے اپنے ذاتی کام کے لئے ایک یادداشت تھی جسمیں قدرۃً بہت سی عبارتیں ناتمام تھیں اپنی "یادداشت" میں انسان جو کچھ مختصراً واشارۃً ٹانک لیتا ہے، اکثر تو وہ دوسروں کے لئے سر تا پا ناقابل فہم ہی رہتا ہے

کریما، مامقیماں گلستان وغیرہ بھی سرے سے بے معنی نہیں۔ کتابوں کے یہ نام بھی کسی نہ کسی مناسبت ہی کی بنا پر پڑے ہیں، البتہ کتاب کے مضمون کے ظاہر کرنیکا وصف ان میں نہیں۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ سورتوں کے نام گو رسول اللہ صلعم کے فرمائے ہوئے ہیں، وہ دوسری مناسبتوں کی بنا پر ہیں، کبھی اس سورہ کی صفات کا اعتبار ہے مثلاً فاتحہ کا نام فاتحہ یا شفا۔ اور زیادہ تر سورہ کے اندر کسی نمایاں، غریب ونادر لفظ پر ہیں۔ جو عرب کے مذاق تسمیہ کے عین مطابق ہے۔ لیکن عموماً سورہ کے مضامین کے کھولنے کے لحاظ سے نہیں ہیں۔ اس لئے جو شخص، مولانا کی طرح سورتوں کے باہمی نظم کا مدعی، اور اس نظم ونظام کی تفصیل کا جویا ہے۔ اسے سورتوں کے نام سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، اسے اپنی تفسیر کے لئے اسماء سور سے قطع نظر کرلینی ہوگی ——— مولانا کی ایک رائے ہے، اور ہر رائے کی طرح

اس میں بھی خطا و صواب دونوں کے امکانات ہیں اور بعض متقدمین بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کر چکے ہیں۔ لیکن بہرحال اس سے کلام مجید پر کسی قسم کا اعتراض معاذاللہ مولانا کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مولانا نے تو ساری عمر قرآن کی خدمت و نصرت ہی میں گذاردی، کوئی دوسرا اعتراض کرتا تو مولانا اپنی جان اور اس کی جان ایک کر دیتے۔ عبارت ضرور تشنگ رہ جانے کے سبب سے الجھن کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن نیت اعتراض کا تو مولانا کی جانب احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

فاران (ماہانہ) کا دور جدید

فاران ایک علمی، مذہبی اور تاریخی رسالہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ سال سے دفتر مدینہ سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے خدا کا شکر ہے کہ فاران عام طور پر مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ابتک فاران کی جو قیمت تھی گو وہ رسالہ کی خوبیاں دیکھتے ہوئے زیادہ نہ تھی لیکن اب اس کے حلقۂ اشاعت کو ترقی دینے اور عام مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ رسالہ کی عام افادی خوبیوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ ابتک قیمت سالانہ تین روپیہ اور بیرونی ممالک سے چار روپیہ تھی۔ اب ماہ جون سے ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) اور دو روپیہ آٹھ آنے (عہ) کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ مسلمان اسکی اشاعت کو اشاعت علم دین تصور کر کے توسیع کی کوشش فرمائیں گے نمونہ مفت۔ پتہ:- محمد مجید حسن مالک رسالہ فاران بجنور، یوپی۔

تفسیر سورہ اخلاص (اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت:- ۵ر

منیجر

تقریظ وتبصرہ

تاریخ اسلام :- از مولوی برکت اللہ صاحب فاروقی اصلاحی، حجم ۹۸ صفحے سائز ۲۰×۳۰/۱۶

پتہ :- کتب خانہ نمبر ۵۹ بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳ قیمت ۸ر

یہ کتاب اردو پرائمری مدارس اور مکاتب اسلامیہ کی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے لکھی گئی ہے، زبان نہایت سہل اور آسان ہے، اگر کہیں کوئی مشکل لفظ آگیا ہے، فٹ نوٹ میں اسکی تشریح کردی گئی ہے

ابتدا میں عرب اور قوم عرب پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ولادت نبوی (صلعم) سے لیکر خلیفہ رابع تک کے تمام اہم حالات جمع کئے گئے ہیں خلفائے راشدین کی سیرتوں پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب اسقدر طویل ہے کہ بچے گھبرا جائیں یا ان پر بار ہو اور نہ اسقدر مختصر ہے کہ معمہ ہوکر رہ جائے۔ اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت کا پوری طرح خیال کیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے تمام واقعات اردو اور عربی کی مستند کتابوں سے نہایت محنت اور احتیاط سے جمع کئے ہیں۔ جابجا نقشے اور مکہ معظمہ وغیرہ کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے نصابوں میں داخل کیجائے، کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

القول المحکم فی تبدیل الخطبۃ بلسان العجم }
مساوات اسلام اور اچھوت اقوام۔ انجیل برنباس۔ } از مولوی عبدالباطن صاحب۔ جونپوری۔ حجم بترتیب ۲۸، ۱۵، ۳۲ صفحات قیمت :- ۳ر، ۱ر، ۲ر

پہلے رسالہ میں، یہ ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے کہ خطبہ جمعہ عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں پڑھنا جائز نہیں رسالہ کے آخر میں چند علماء کے فتاوے بھی درج ہیں۔

افسوس ہے کہ اس رسالہ کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں۔ جابجا سے دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مصنف کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں پوری کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ تاہم جو لوگ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہوں

ان کو یہ رسالہ پڑھنا چاہئے - کاغذ اور لکھائی چھپائی معمولی ہے ۔

۲- ابھی حال میں اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبدکر نے مساوات کی تلاش میں تبدیل مذہب کا اعلان کیا تھا۔ دوسرے رسالہ میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ اچھوتوں کی یہ خواہش صرف اسلام پوری کر سکتا ہے ۔

فاضل مولف نے نہایت کاوش سے ہندو دھرم اور عیسائی مذہب کی تعلیمات کا اسلامی تعلیمات و احکام سے مقابلہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں مساوات کا وجود نہیں۔ یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے کہ کالے گورے، امیر و غریب، شاہ و گدا، محمود و ایاز سب برابر ہیں ۔ یہ رسالہ اچھا اور مفید ہے ۔

۳- تیسرا رسالہ انجیل برناباس کا انتخاب ہے۔ شروع میں ۲ صفحے کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں توحید کا بیان ہے۔ جسمیں حضرت مسیحؑ کے وہ اقوال درج ہیں جن سے ان کا الوہیت یا ابنیت سے صاف انکار معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا باب آنحضور صلعم کی بشارت کے متعلق ہے۔ اسمیں حضرت مسیحؑ کے وہ اقوال ہیں جنمیں آنحضور صلعم کی بشارت موجود ہے۔ تیسرا باب حضرت مسیحؑ کو سولی نہ دیئے جانے کے بیان میں ہے۔ کاغذ اور طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

یہ تینوں رسالے منیجر کتبخانہ کرمنتیہ، ملاٹولہ، جونپور سے مل سکتے ہیں ۔

صوت الشبان۔ Shubban's Voice ماہوار مصور، حجم ۲۴ صفحے سائز $\frac{20 \times 26}{8}$

سالانہ چندہ عہ پتہ:- جمعیۃ الشبان المسلمین بمبئی ۔

قاہرہ (مصر) میں جمعیۃ الشبان المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم ہے، جس کی ایک شاخ تقریباً چار سال سے بمبئی میں بھی قائم کی گئی ہے۔ اس انجمن کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱- مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارگی پیدا کرنا۔

۲- اسلامی لٹریچر سے شغف و محبت پیدا کرنا۔

۳ سوشل خرابیوں کے خلاف بہتر طریقہ پر، احتجاج بلند کرنا۔

۴۔ نیکی کی اشاعت۔

صوت الشباب اس انجمن کا ترجمان ہے، جو انگریزی میں ایک سال سے ماہ بماہ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ مضامین مختصر مگر پرجوش اور نہایت مفید ہوتے ہیں، قرآن مجید کی آیات کے عموماً ترجمے بھی شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ کی طرف سے معین عنوانات پر، بہترین مضامین لکھنے والوں کو انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ مضامین کی زبان انگریزی ہونی ضروری ہے۔

شاہکار۔ ماہوار (مصور) اڈیٹر پروفیسر تاجور معاون ناصر و حافظ جاوید اللہ کام۔ اے حجم ۴۷ صفحے سائز $\frac{20 \times 26}{4}$ سالانہ چندہ ۶ روپے / ششماہی پتہ:۔ مزنگ روڈ، لاہور۔

پروفیسر تاجور کامیاب اور کہنہ مشق اڈیٹر ہیں۔ متعدد رسالوں کے اڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دو سال سے اپنا ایک ذاتی رسالہ شاہکار کے نام سے جاری کیا ہے جس میں زیادہ تر ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ تعلیمات کا بھی ایک مستقل باب ہے جس میں تعلیم کی ترقی و اصلاح کے لئے مفید باتیں ہوتی ہیں۔

کاغذ اور کتابت و طباعت متوسط ہے۔ ٹائٹل پیج آرٹ پیپر اور رنگین ہے۔

الفلاح ۔ ماہوار (مصور) اڈیٹر محمد عبدالکریم گدا حجم ۸۰ صفحے سائز $\frac{20 \times 29}{8}$ سالانہ چندہ ۵ افغانی، خارج سے ۱ شلنگ پتہ :۔ ریاست جمعیۃ العلماء افغانستان۔

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے جو جمعیۃ العلماء افغانستان سے فارسی میں، ملا بزرگ صاحب تہذیب کی نگرانی میں نکلتا ہے، شروع میں تفسیر کا حصہ ہوتا ہے، اس کے بعد احادیث کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے اس کے علاوہ بعض عمدہ مضامین مذہب سے متعلق درج ہوتے ہیں۔ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے اگر ٹائپ اور جلی ہوتا تو بہتر تھا۔

دور جدید (ہفتہ وار) اڈیٹر ملک محمد حسن، رتاسی حجم ۱۲ صفحے سائز $\frac{22 \times 30}{4}$ سالانہ چندہ ۵ ششماہی ۳ پتہ :۔ دفتر دور جدید لاہور۔

اس اخبار کے دو نمبر ہماری نظر سے گزرے ہیں محنت سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اڈیٹوریل کے علاوہ ہفتہ بھر کی اہم خبروں پر نوٹ لکھے جاتے ہیں۔ عجائب عالم کے ماتحت مسلسل ایک مضمون شائع ہوتا ہے۔ عام دلچسپی کیلئے افسانے کے علاوہ تراجم درج کیے جاتے ہیں۔

(ع۔ ل)

جلد ۱	ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء	نمبر ۹

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	
باب التفسیر		
تفسیر سورۃ الکافرون	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی	۹ - ۱۶
معارف قرآن		
تدبر قرآن	امین احسن اصلاحی	۱۷ - ۳۱
سورہ حج کی ایک آیت کی صحیح تاویل	مولوی اختر احسن اصلاحی	۳۲ - ۴۵
موعظۂ حسنہ		
پاداش عمل	جناب مولوی بدر الدین صاحب اصلاحی	۴۶ - ۵۴
ادبیات		
غزل	استاذ امام کی ایک غیر مطبوعہ غزل	۵۵
تلخیصات		
مدرسۃ الاصلاح	ع ۔ ل	۵۶ - ۶۰
تقریظ و تبصرہ	ع ۔ ن	۶۱ - ۶۴
"چڑیوں کا گھونسلا"	ع ۔ ر ناصر	۶۴

شذرات

تکفیر سے رجوع

حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی (رحمہما اللہ) کی تکفیر کا جو فتویٰ تھا۔ اس پر دوسرے دستخطوں کے ساتھ، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ہوگئے تھے۔ اب مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے بعض گرامی ناموں اور ان کے اخبار صدق سے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ان دونوں بزرگوں نے تکفیر سے رجوع فرمالیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک

اسی سلسلہ میں ایک بزرگ، بمبئی سے، مدیر الاصلاح کو لکھتے ہیں:-

مکرمی جناب مدیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بدقسمتی سے اس استفتاء پر جس میں مولانا شبلی و مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر کی گئی تھی، دوسرے دستخطوں کے ساتھ میرے دستخط بھی موجود تھے۔ استفتاء میں چونکہ سوالات ایسے عنوانات پر مشتمل تھے جو موجب کفر ہونا بدیہی تھا اس لئے میں نے بھی دستخط کر دیئے۔ بعد میں مولانا سید سلیمان صاحب کے اعلان سے اس امر کی تصدیق ہوئی کہ وہ حضرات ان عقائد سے قطعاً مبرا تھے اس لئے میں اپنے فتویٰ سے رجوع کرتا ہوں تاکہ تکفیر مسلم کے عذاب میں ماخوذ نہ ہوں۔

اگر آپ چاہیں تو اس کو اپنے رسالہ الاصلاح میں شائع کر سکتے ہیں۔ فقط والسلام

احقر

لطف اللہ غفر لہ شاہجہاں پوری۔ مدرس عربی

مدرسہ ہاشمیہ زکریا مسجد بمبئی

خدا کرے اس مسئلہ سے متعلق الاصلاح کی یہ آخری سطریں ہوں اور مزید لکھنے کے اسباب و محرکات پیدا نہ ہوں۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اگرچہ اس کا تعلق تمام تر نفس مسئلہ سے علمی حیثیت سے تھا، اللہ تعالیٰ نے روش عام کی تقلید سے بچایا ہے لیکن نفس خادع نے نہ جانے زبان قلم کو کہاں کہاں آلودہ کیا ہوگا؛ معاملات پیش آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں اور آزمائش کی گھڑیوں میں زبان و قلم کے احتساب کا ہوش کم ہی خوش نصیبوں کو رہتا ہے۔ پس اگر اس فتنہ کے زمانہ میں، جذبات اور اصول میں کوئی تصادم ہوا ہو، اور قلم نے کوئی لفظ جذبۂ انتقام میں لکھا ہو تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے خواستگار معافی ہوں اور ان لوگوں سے بھی جن کو الاصلاح کے کسی فقرہ سے رنج پہنچا ہو، عام اس سے کہ وہ مخالف ہوں یا موافق۔

الاصلاح کے قارئین سے.....

الاصلاح کے بعض قارئین نے عتاب آمیز خطوط لکھے ہیں کہ "تم قرآن مجید کی خدمت کے عہد کے ساتھ اٹھے تھے یہ مولویوں کے جھگڑے میں کہاں پھنس گئے"؛ جواب میں اظہار ندامت کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے؟ الاصلاح کے تخیل کے ساتھ جو آرزو سب سے پہلے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہی تھی کہ کبھی اس کے صفحات مولویانہ انداز گفتگو اور لاطائل مباحث سے آشنا نہ ہوں گے۔ خاموشی اور استقلال کے ساتھ صرف پیش نظر مقصد کی خدمت کیجائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ ادھر دو تین مہینوں سے الاصلاح اور قارئین الاصلاح کا وقت ایک فضول بحث میں ضائع ہو رہا ہے۔ اس بات کو قارئین سے زیادہ میں خود محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے نہایت بے دلی بلکہ کراہیت کے ساتھ محض بعض بزرگوں اور ہمدردوں کے اصرار سے لکھا گیا ہے ورنہ شاید الاصلاح کے صفحات اس قصہ سے ناآشنا ہی رہتے۔ ہمارا مسلک تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں آدمی کو ردّ دفاع کے سب سے زیادہ صحیح اور جائز حق کو بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ کہ اس میں بھی فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ بس خاموشی کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔ جو وقت مفید کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے اس کو لاحاصل سوال و جواب میں کیوں ضائع کیا جائے۔ مگر مصالح

و حالات نے افسوس ہے کہ کسی قدر ہم کو اپنے اس مسلک سے ہٹنے پر مجبور کیا
اگرچہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس تمام ہنگامہ میں زبان قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں
نکلا جس سے آج ندامت ہو۔ و لا فخر

ہم دو لفظ ان قارئین اور ہمدردوں کی خدمت میں بھی عرض کریں گے جنھوں نے اس تکفیر و تفسیق
پر ہم کو مبارکباد کے خطوط لکھے ہیں کہ ان کی نگاہ صرف معاملہ کے ظاہر پر ہے باطن تک نہیں پہنچی ہے۔
ورنہ یہ حالت ہنسنے کی نہیں رونے کی ہے۔ یہ کس قدر دردانگیز حالت ہے کہ ہمارے علماء نے اپنی بے احتیاطی
اور سوءِ استعمال سے اپنی سب سے بڑی طاقت بالکل کھو دی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ خدا کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
اور اس کے صحابہ (رض) جس سے آنکھیں پھیر لیتے تھے اس سے آسمان و زمین آنکھیں پھیر لیتے تھے۔ احادیث و سیر
میں نہ جانے کتنے واقعات اس قسم کے مذکور ہیں۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ ہمارے علماء کے تکفیر کے فتووں پر
لوگ ہنستے ہیں اور جن کی تکفیر کی جاتی ہے ان کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہم اس معاملہ کو صرف شخصی پہلو سے نہیں
دیکھتے بلکہ اس کے اجتماعی انجام پر بھی غور کرتے ہیں اور اس انقلاب حالت پر بڑا رنج ہوتا ہے۔ ہماری یہ
خواہش نہیں ہے کہ فتویٰ نویسی یوں بے وقعت ہو جائے۔ بلکہ ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ علماء اپنے صحیح
منصب کو حاصل کریں اور مسلمانوں میں فتویٰ نویسی کا صحیح وقار قائم ہو۔ لیکن جو لوگ ابھی مولانا شبلی اور
مولانا حمید الدین کے کفر و ایمان کا فیصلہ نہیں کر سکے ان سے آئندہ کیا امیدیں کی جا سکتی ہیں؟ اس وقت
اس مسئلہ سے متعلق کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا انشاء اللہ کسی آئندہ فرصت میں ہم کتاب و سنت کی روشنی
میں فتویٰ نویسی اور اس کے لوازم و شرائط پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ فی الحال صرف اتنا عرض
کریں گے کہ علماء اپنے کو عدالت الٰہیہ کا ترجمان سمجھیں اور جو کچھ کہیں اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی
روشنی میں کہیں۔ خدا نے قرآن اور رسول کو حکم ٹھیرایا ہے۔ عالمگیریہ اور تاتارخانیہ کی پیروی کا حکم نہیں
دیا ہے! اس سلسلہ کی صرف ایک بات اور رہی جاتی ہے یعنی نفس خادع کی تہنیت۔ لیکن اسکی

نسبت ہم بے خبران حال و مقام کیا عرض کرسکتے ہیں! اور اگر کچھ عرض کرنے کی جرأت بھی کریں تو اس شورہ کو قبول کرنا تو الگ رہا، ہمارے اس حق کو تسلیم کون کرے گا؟

معاونین دائرہ حمیدیہ

پچھلے دو مہینوں میں معاونین کا اعلان نہ ہوسکا، حالانکہ فہرست اعانت برابر بڑھتی رہی ہے۔ یک دوست نے ماہانہ ۱۲۵ بھجوادئے ہیں اور مصر ہیں کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ ۵ ہمارے مخدوم جناب شیخ شاہ محمد صاحب (ساکن کوٹلہ) نے عنایت فرمائے ہیں۔

عام معاونین کی فہرست میں مندرجہ ذیل نام اضافہ ہوئے۔

(۱) جناب ڈاکٹر امیر الدین صاحب اسٹنٹ سرجن پرتاب گڈھ۔

(۲) جناب مولوی عبد الرزاق صاحب اصلاحی (ساکن بکھرا)

(۳) جناب مولوی عبد الشکور صاحب ترپ بازار شفا خانہ رحمانی (حیدرآباد دکن)

ان معاونین کا نہایت شرمندگی اور ندامت کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ "شرمندگی اور ندامت" کے ساتھ اس لئے کہ سال کے ۹ مہینے گذر گئے اور اب تک استاذ امام کی تصنیفات میں سے ایک تصنیف بھی جناب کران ہمدردوں کی خدمت میں نہ پیش کرسکا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس حالت نے مجھے اور دوسر رفقا کو کس درجہ مضطرب کر رکھا ہے لیکن غیر متوقع موانع اور مشکلات کا کیا علاج! ان مشکلات کو بطور عذر پیش کرنے کی بھی ہمت نہیں، حتی کہ مجھے اپنی ناتجربہ کاریوں کی وجہ سے دوسروں کو حالت انتظار میں رکھنے کا کیا حق حاصل ہے، اور بہتوں کو تو صرف انتظار ہی نہیں بلکہ شوق و اضطراب ہوگا، ان سے بجز اس کے کہ معافی مانگوں اور کیا عرض کرسکتا ہوں۔ ایک اور پریس منگا کر ماہ رواں سے مولانا کی تصنیفات کی طباعت کا کام مستقلاً شروع کردیا گیا ہے اگر کوئی خاص مانع پیش نہ آیا تو انشاء اللہ کم از کم سورہ لہب اور سورہ کوثر تو بہت جلد معاونین کی خدمت میں پہنچ سکیں گی۔ والسلام بین اللہ

مدرسہ کا کتبخانہ

مدرسۃ الاصلاح کا کتبخانہ نہایت مختصر ہے۔ نہ طلبہ کی ضرورت کے لئے کافی ہے نہ اساتذہ کی۔ اساتذہ کے ذوق و شوق کو تو خیر فی الحال نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے لیکن غیر مستطیع طلبہ کی زحمتیں ناقابل برداشت ہیں۔ بعض غریبوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ پورا سال گذرجاتا ہے اور وہ مطالعہ و مذاکرہ کے لئے اپنے دوسرے ساتھیوں ہی کی کتابوں کے محتاج رہجاتے ہیں۔ خود غربت کی وجہ سے خرید نہیں سکتے اور مدرسہ کا کتبخانہ اپنی بے مائگی کی وجہ سے ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ یہ حالت نہایت تکلیف دہ ہے۔ ملک میں صدہا مکتبے اور مطابع ہیں جہاں سے دینی کتابیں بکتی اور شائع ہوتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کی اس مشکل کی طرف توجہ کریں گے۔ ان کے علاوہ بہت سے علمی خاندان ایسے ہوں گے جن کے علمی اندوختے کس مپرسی کی حالت میں ہوں گے۔ ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہوگا۔ اگر یہ ذخیرے مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کو مل جائیں تو ان کا فیض ہمیشہ جاری رہے۔ امید ہے ارباب ہمت اس اپیل پر توجہ کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہم اس امر کا ذکر نہایت مسرت سے کرتے ہیں کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی تمام قیمتی مطبوعات مدرسہ کے کتبخانہ کو ہدیۃً مل چکی ہیں اور ان کے علمی عطیئے سال بسال وصول ہوتے رہتے ہیں۔

مدرسہ کی مسجد

مسجد کی بھی شان اب پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ اندر اور باہر کے تقریباً تمام اہم کام پورے ہوچکے ہیں۔ صرف چہار دیواری اور صدر دروازہ کی تعمیر و تکمیل اور پشت کے حصہ کا پلاسٹر باقی ہے۔ کام پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ جوار کے مسلمان الحمد للہ متوجہ ہیں۔ پڑوس کی بستیوں میں سے راجہ پور سکرور کے مسلمانوں نے پوری فیاضی اور فراخ دلی سے مسجد کا چندہ فراہم کیا۔ اب ہمدردان مدرسہ کی تھوڑی سی توجہ سے مسجد مکمل ہوجائے گی۔ انشاءاللہ عنقریب ہم مسجد کا فوٹو الاصلاح میں شائع کریں گے۔ اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ

ن کی تھوڑی تھوڑی اعانت سے، کتنی شاندار، خوبصورت اور پائیدار مسجد بن گئی ہے۔

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ابھی مدرسہ کے نہ جانے کتنے مخلص ہمدرد ہیں جن کی اعانتوں
ناظم صاحب قبلہ کو انتظار ہے۔ اب صرف تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اس کو ناقص چھوڑ دینے کے خیال سے
لیف ہوتی ہے۔ کم سے کم مدرسہ کی ایک چیز تو مکمل ہو جائے۔ مسجد کی تعمیر ایک خالص دینی خدمت ہے جس
ں دنیا کا کوئی شائبہ نہیں پھر یہ مسجد تعمیر کے آخری مرحلے سے گذر رہی ہے۔ جن کی جیبوں سے اس کے لئے
روں روپئے نکلے ہیں ان کی صرف ایک توجہ اور مطلوب ہے۔ امید ہے ہمارے یہ الفاظ ضائع نہ جائینگے۔

ستفسرین سے

جن مستفسرین نے استفسارات بھیجے ہیں، ان کو تاخیر جواب سے قدرۃً شکایت ہوگی
ن سے عرض ہے کہ ادھر کئی مہینہ سے الاصلاح کے بیشتر صفحات فتنۂ تکفیر کی مدافعت کی نذر ہوجاتے
تھے اس لئے رسالہ کے ابواب و مضامین کا تمام نظام بالکل درہم برہم رہا۔ اب حالات، امید
ہے، اپنی معمولی رفتار پر آجائیں گے۔ اور انشاء اللہ بالترتیب تمام استفسارات کے جوابات شائع
ں گے۔ مستفسرین سے بادب گذارش ہے کہ سوالات ہمیشہ طالب العلمانہ ہوں، مناظرانہ مباحث
ن پر جدال و قتال کے معرکے گرم ہیں، ان پر کچھ لکھنا تضیع اوقات ہوگا۔ بعض چیزیں بالکل نزاعی
ن گئی ہیں ان پر بحث کرنا اگرچہ عام دلچسپی اور تجارت کے پہلو سے کسی رسالہ کے لئے نہایت
ید ہو سکتا ہے لیکن غالباً الاصلاح کے قارئین الاصلاح کو اس سے بلند دیکھنا چاہتے ہونگے۔
صلاح ایسے مواقع سے بچتا ہے۔ اس کا اصلی مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں قرآن مجید پر غور کرنیکا
وق پیدا ہو اور کچھ ہم سفر ایسے پیدا ہو جائیں جو مشکلات قرآن میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ
ے طریق پر، ایک دوسرے کی رہبری اور دستگیری کریں۔ ایسے مباحث میں الجھنے سے
فائدہ ہوگا جن کی حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے مگر محض کج بحثی اور مخاصمت کے

ذریعہ اس کو گم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بس اصل مقصد کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اگر نیتوں میں خلوص اور ارادوں میں پختگی ہے تو یہی نامانوس صدائیں، آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو محبوب ہوگئی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دل ان کے سننے اور سمجھنے کے لئے کھول دئے ہیں۔ اس فکر میں سر کھپانا کہ کیا چیز لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہے نہایت پست ہمتی کی بات ہے۔ اگر ہم پبلک کی دلچسپی اور تحسین ڈھونڈتے ہیں اور قرآن کی خدمت کو بھی تجارت اور نفع اندوزی سے الگ نہیں کر سکتے تو رسالہ نکالنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اور مشغلہ اختیار کیا جائے۔ الاصلاح کے خریدار وہی ان تمام مشوروں کو میں نہایت قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جو وہ وقتاً فوقتاً درباب ترقی اشاعت لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن خدارا وہ الاصلاح کے مقصد کو نہ فراموش کردیں۔ اصل چیز تو مقصد ہی ہے، اس کو ضائع کردینے کے بعد اگر کونین کی دولت بھی ہاتھ آجائے تو کس کام کی۔

قصورِ خدمت

ایک چھوٹا سا قصورِ خدمت ہوا ہے، جس کی معافی چاہتا ہوں۔ اب کے تفسیر کے فارم چھپ کر سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ کاتب نے آیات پر اعراب نہیں لگائے۔ افسوس ہوا کہ عام قارئین کو آیات کی تلاوت میں زحمت ہوگی۔ مگر فارم چھپ جانے کے بعد تلافی مافات کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔

باب التفسیر

تفسیر سورۃ الکافرون

۲

مصنفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

مترجمہ

امین احسن اصلاحی

پیغمبر امت کیلئے امان اور برأت، توبہ کی مہلت ہے

(۵) اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں برأت وہجرت کی تصریح نہیں ہے لیکن "لنھلکن الظالمین...... وخاب کل جبار عنید" کے سیاق پر غور کرو۔ یہ مضمون اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ انبیاء کے قصوں میں، یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ظالموں کی بربادی ہجرت کے بعد واقع ہوتی ہے۔ جب تک رسول قوم کے اندر رہتا ہے وہ قوم کے لئے سپر ہے۔ خدا کا قہر وغضب اس وقت تک نمودار نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ مایوس ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کو ہجرت کی اجازت مل جاتی ہے وہ برأت کا اعلان کر کے ہجرت کا عزم فرماتا ہے۔ یہ توبہ وانابت کی آخری مہلت ہوتی ہے جو قوم کو ملتی ہے۔ حضرت یونسؑ اور انکی قوم کا معاملہ اس کی بہترین مثال ہے۔ پیغمبر کی ہجرت کے بعد اگر قوم توبہ واستغفار کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، فتح وعذاب کی گھڑی

نمودار ہوجاتی ہے۔ سورہ انفال میں اس حقیقت کی تصریح ہے۔

وما كان الله ليعذبهم وانت فيهم وما كان الله معذبهم وهم يستغفرون وما لهم الا يعذبهم الله وهم يصدون عن المسجد الحرام وما كانوا اولياءه ان اولياءه الا المتقون ولكن اكثرهم لا يعلمون ○

اور اللہ ایسا کرنیوالا نہ تھا کہ تو ان کے درمیان موجود ہو اور پھر ان کو عذاب میں ڈالے اور ایسا بھی کرنیوالا نہیں کہ انھیں عذاب میں ڈالے حالانکہ وہ معافی مانگ رہے ہوں۔ لیکن اب کونسی بات رہ گئی ہے کہ انھیں عذاب نہ دے حالانکہ وہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں، باوجودیکہ وہ اس کے متولی نہیں ہیں، اس کے متولی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں لیکن اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس بات کے مستحق ہو چکے تھے کہ بیت اللہ کی تولیت سے معزول کردئے جائیں اور عذاب الٰہی نمودار ہو کر ان کو تباہ کردے۔ لیکن جب تک پیغمبر کا مقدس وجود صلحاؤ ابرار کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے اندر موجود رہا اس وقت تک وہ عذاب سے محفوظ رہے۔ یہانتک کہ پیغمبر نے ہجرت کی اور ان کو توبہ کی توفیق نہ ہوئی۔ اس وقت خدا کا قانون ظاہر ہوا۔

اس باب میں نہایت بلیغ اور پر اثر کلمات حضرت عیسی علیہ السلام کے ہیں۔ انھوں نے جب یروشلم کی عورتوں کو روتے دیکھا فرمایا۔ "اے یروشلم کی بیٹیو! میرے حال پر مت روؤ، اپنے اور اپنی اولاد کے حال پر ماتم کرو۔"

حضرت عیسی علیہ السلام کی دنیا سے ہجرت یہود کی بدبختی کا پیغام تھی اور حضرت عیسیٰ نے اس کی خبر بھی دیدی تھی لیکن یہود متنبہ نہیں ہوئے بالآخر چالیس برس کی مہلت کے بعد خدا کے عذاب نے انکو پکڑلیا۔

سورہ برات کی ابتدائی چھ آیتیں پڑھو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ آخری برات بھی مہلت اور توبہ کی امید سے خالی نہیں ہوتی۔

سورہ کے الفاظ کی شہادت کہ یہ اعلان براءت ہے

(۲) اگر اس سورہ کے الفاظ پر غور کروگے اور جو آیتیں پچھلی فصلوں میں ہم نقل کر چکے ہیں ان کو سامنے رکھو گے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ سورہ، براءت اور ہجرت کی سورہ ہے۔ لیکن مزید توضیح کے لئے اس مضمون کی دوسری آیات بھی ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں تاکہ کسی طرح کا اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ اقوال ہیں جو انھوں نے اپنی قوم سے علیحدہ ہوتے وقت فرمائے ہیں۔ اگر وہ اقوال پوری طرح اس سورہ کے الفاظ سے ہم آہنگ ہو جائیں تو بس سمجھ لینا چاہئے کہ دونوں ایک ہی حالت میں کہے گئے ہیں۔

(الف) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت کا یہ حصہ قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے۔

قد كانت لكم اسوة حسنة فى ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم انا براء منكم ومما تعبدون من دون الله، كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابدا حتى تومنوا بالله وحده الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شئ ربنا عليك توكلنا واليك انبنا واليك المصير

تمھارے لئے ابراہیم اور اسکے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا ہم تم سے اور ان چیزوں سے جنکی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لئے نفرت و عداوت آشکارا ہو گئی یہانتک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لاؤ۔ ہاں مگر ایک بات اس عام اعلان سے مستثنیٰ حکم رکھتی ہے) ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا کہ میں آپکے لئے خدا سے مغفرت چاہوں گا اور میں اللہ کی طرف سے آپکے لئے کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا

یہ "بدا بيننا وبينكم العداوة" الخ ہجرت اور جنگ کا اعلان ہے اور "ربنا عليك توكلنا" الخ بوقت ہجرت دعائے فتح و نصرت ہے۔

(ب) اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے اصنام سے بھی اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی مشرکین کے تمام اجتماعی رشتے انہی فرضی دیوتاؤں کی بدولت قائم تھے۔ پس ان سے علیحدہ ہو جانا، صرف ان سے علیحدہ ہونا نہ تھا، تمام مشرکین سے کٹ جانا تھا۔ آگے ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ سورہ شعراء میں جہاں اس معاملہ کا ذکر آیا ہے حضرت ابراہیمؑ نے اعلان برأت کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ فرمایا

افرایتم ماکنتم تعبدون انتم وآباءکم الاقدمون فانھم عدولی الا رب العالمین	دیکھو تو سہی ان چیزوں کو جن کو تم پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے اگلے باپ دادا۔ یہ سب چیزیں میری دشمن ہیں۔ مگر اللہ رب العالمین

اظہار نفرت وعداوت اور اعلان برأت کے لئے یہ اسلوب کلام سخت ترین تھا۔

(ج) سورہ زخرف میں فرمایا ہے۔

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ اننی براء مما تعبدون ۝ الا الذی فطرنی فانہ سیھدین وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ لعلھم یرجعون	اور یاد کرو، جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا میں ان چیزوں سے بری ہوں جنکو تم پوجتے ہو۔ ہاں وہ ذات میری معبود ہے جس نے مجھکو پیدا کیا ہے بیشک وہ میری رہبری کریگی اور اس بات کو اللہ تعالٰے نے اس کے بعد ایک باقی رہنے والا کلمہ

(زخرف ۲۶-۲۸)

"وہ میری رہبری کریگی" یعنی مقام ہجرت کی طرف۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ "فی عقبہ" یعنی بعد اس کے کہ وہ تہدید و نصیحت کے طور پر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تاکہ لوگ شرک سے توبہ کریں۔ عموماً مفسرین نے "کلمہ باقیۃ" سے کلمہ توحید کہا ہے۔ اور بعضوں نے "مسلم" کا لقب جو انھوں نے اپنے پیرؤوں کو بخشا۔ لیکن یہ دونوں تاویلیں بعید ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے جو بات کہی تھی "کلمہ باقیہ" سے وہی بات مراد ہے۔ "فی عقبہ" سے عموماً لوگوں نے اولاد ابراہیم مراد لی ہے۔ یہ غلطی درحقیقت پہلی غلطی کا نتیجہ ہے۔

(د) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا اعلان اس وقت ہوا جب وہ حق تبلیغ پوری طرح ادا کر چکے سورہ عنکبوت میں ہے۔

وابراهيم اذ قال لقومه اعبدوا الله و
اتقوه ذلكم خير لكم ان كنتم تعلمون
انما تعبدون من دون الله اوثانا وتخلقون
افكا ان الذين تعبدون من دون الله
لا يملكون لكم رزقا فابتغوا عند الله
الرزق واعبدوه واشكروا له اليه ترجعون
وان تكذبوا فقد كذب امم من قبلكم
وما على الرسول الا البلاغ المبين (ثم
ذكر الله سنة من استبدال قوم بعد قوم
كالجملة المعترضة حتى عاد فقال) فما كان
جواب قومه الا ان قالوا اقتلوه او حرقوه
فانجاه الله من النار ان في ذلك لايات
لقوم يؤمنون ۰ وقال انما اتخذتم من دون
الله اوثانا مودة بينكم في الحيوة الدنيا
ثم يوم القيمة يكفر بعضكم ببعض ويلعن
بعضكم بعضا ومأواكم النار وما لكم من
نصرين فامن له لوط وقال اني مهاجر الى
ربي انه هو العزيز الحكيم ۰ ووهبنا له اسحق
ويعقوب وجعلنا في ذريته النبوة والكتب

اور ابراہیم کو جب اس نے اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ
کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر
تم سمجھ رکھتے ہو۔ تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوا بس بتوں کے تھان
اور بناتے ہو جھوٹی باتیں جنکو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یقیناً
تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔ پس اللہ کے پاس
اپنی روزی ڈھونڈھو، اور اس کی بندگی کرو۔ اور اس کا
حق مانو، اسی کی طرف پھر جاؤگے۔ (اس کے بعد کلام بطور جملہ معترضہ
استدلال اقوام امم کی سنت الہیہ کے بیان کی طرف متوجہ ہو گیا ہے
پھر اصلی سلسلہ کلام نمودار ہو جاتا ہے۔) پھر کچھ جواب نہ تھا اسکی
قوم کا مگر یہ کہ بولے اسکو مار ڈالو یا جلا دو پھر اسکو بچا دیا اللہ نے
آگ سے بلاشبہ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لئے
اور ابراہیم نے کہا تم نے اللہ کے سوا جو بتوں کے تھان ٹھہرائے
ہیں، سو آپس کی دوستی کے لئے دنیا کی زندگی میں۔ پھر قیامت کے
دن ایک دوسرے کا منکر ہو جائیگا اور ایک دوسرے پر لعنت کریگا
اور تمہارا ٹھکانا آگ ہوگا۔ اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔ پھر لوط نے
اس کی تصدیق کی اور اس نے کہا میں تو وطن چھوڑ کر اپنے رب
کی طرف جاتا ہوں بیشک وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اور دئیے
ہم نے اس کو اسحق اور یعقوب اور رکھا اسکی ذریت میں
نبوت اور کتاب اور بخشا ہم نے اس کا اجر دنیا میں اور بیشک

واتینه اجره فی الدنیا وانه فی الاخرة لمن الصالحین۔

وہ آخرت میں نیکوکاروں میں سے ہوگا

(۱) بعینہ یہی دعوت انھوں نے اس وقت بھی بلند کی تھی جب بتخانہ میں قوم کے تمام بتوں کو توڑ ڈالا تھا۔ سورہ والصّٰفّٰت میں ہے۔

قال اتعبدون ما تنحتون ۝ والله خلقكم وما تعملون ۝ قالوا ابنوا له بنيانا فالقوه في الجحيم ۝ فارادوا به كيدا فجعلنٰهم الاسفلين ۝ وقال اني ذاهب الى ربي سيهدين ۝ رب هب لي من الصالحين ۝ فبشرنٰه بغلٰم حليم (ثم ذكر قصة اسمٰعيل ثم قال) وبشرنٰه باسحٰق نبيا من الصّٰلحين ۝

کہا کیا اپنی ہی گڑھی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے تم کو اور ان چیزوں کو جنکو تم بناتے ہو۔ بولے اس کے واسطے ایک گھر بناؤ اور ڈالدو اسکو آگ کے ڈھیر میں۔ انھوں نے اس کے ساتھ داؤ کرنا چاہا لیکن ہم نے اسی کو نیچے ڈالا۔ اس نے کہا میں اپنے رب کیطرف جاتا ہوں وہ مجھکو راہ دیگا (اس نے پروردگار سے دعا کی) اے رب مجھکو کوئی نیک بیٹا عنایت فرما۔ پس ہم نے اسکو ایک حلیم بیٹے کی بشارت دی (یہاں چند آیات میں حضرت اسمٰعیل کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا) اور ہم نے اس کو خوشخبری دی

(۲) واقعہ کی تفصیل اور ہجرت کا اعلان سورہ انبیاء میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قوم کی مخالفت انتہا کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت فرمائی چنانچہ فرمایا۔

اف لكم ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون ۝ وقالوا حرقوه وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين (ثم ذكر كيدهم به وخسرانهم ثم قال) ونجينه ولوطا الى الارض التي بٰركنا فيها للعالمين ۝ ووهبنا له اسحٰق ويعقوب نافلة

افسوس ہے تم پر اور ان چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو کیا تم لوگ سمجھتے نہیں ہو بولے اسکو جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تمہیں کچھ کرنا ہے (چند لفظوں میں مخالفین کی ایک چال اور انکی ناکامی کے بیان کے بعد فرمایا) اور ہم نے اسکو اور لوط کو اس سرزمین کیطرف نجات دی جسکو ہم نے دنیا والوں کے لئے بابرکت بنایا

وکلا جعلنا صٰلحین — اور ہم نے اس کو عنایت کئے اسحٰق، اور یعقوب، بطور عطیہ اور ہم نے ہر ایک کو نیکو کاروں میں سے بنا یا۔

ان آیات پر غور کرو، ان سے ہجرت کے وقت کی تعیین بھی ہو جائیگی۔ کیونکہ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت سنائی گئی ہے اور ہجرت سے پہلے کی حالت معلوم ہے کہ وہ تکلیف اور پریشانی کی حالت تھی۔ ان دونوں حالتوں کے بیچ میں جو نقطہ حد فاصل نظر آئے وہی ہجرت کا زمانہ ہے۔ سورہ مریم میں یہ معاملہ بالکل صاف ہو گیا ہے۔

قال اراغب انت عن الهتی یا ابراهیم لئن لم تنته لارجمنك واهجرنی ملیا ٭ قال سلام علیك ساستغفر لك ربی انه کان بی حفیا ٭ واعتزلکم وما تدعون من دون الله وادعو ربی عسیٰ الا اکون بدعاء ربی شقیا ٭ فلما اعتزلهم وما یعبدون من دون الله وهبنا له اسحٰق ویعقوب وکلا جعلنا نبیا ٭

باپ نے کہا، ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا (اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر) مجھ سے الگ ہو جا۔ ابراہیم نے کہا اچھا میرا سلام قبول ہو (میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا، وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور انھیں بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، امید ہے اپنے پروردگار سے دعا مانگ کر محروم نہیں رہوں گا۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کا یہ معاملہ بالکل متفق علیہ ہے۔ یہود نے واقعہ کی تفصیلات میں بعض تبدیلیاں کر دی ہیں، لیکن نفس واقعہ سے ان کو بھی انکار نہیں ہے۔ پیدائش ۱۲ میں ہے۔

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکلکر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا ۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہو"۔

چونکہ واقعہ مشہور و معلوم تھا اس لئے قرآن مجید نے تذکار و موعظت کا اسلوب اختیار کیا۔ تفصیل کو نہیں دی۔

یہ تمام آیات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ ان کو یکجا کرکے دیکھنے کے بعد، حاصل یہ نکلتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مدت تک قوم کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول رہے۔ انذار و تبشیر کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا۔ تلقین و دعوت کی پوری طاقت صرف کر ڈالی۔ لیکن قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بالآخر مایوس ہوگئے۔ اور چاہا کہ ایک مرتبہ کھول کر دکھا دیں کہ جن بتوں کو لوگ پوجتے ہیں بالکل بے جان و بے اختیار ہیں۔ نفع و نقصان کی کوئی بات بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ تنبیہ اور اتمام حجت کی آخری شکل تھی، جو انھوں نے اختیار کی اور نتیجہ وہی نکلا جو ان کا خیال تھا۔ انھوں نے جب تمام بت توڑ پھوڑ کے رکھدئے، قوم کو تنبہ ہوا کہ درحقیقت یہ ہماری انتہائی نادانی تھی کہ ہم ان بے جان پتھروں کی پرستش کر رہے تھے۔ جو خود اپنی حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس واقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ملامت کی لیکن اس ملامت سے ان کی حمیت جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ چلا اٹھے کہ اس کو آگ میں جھونک دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ اس کے علاوہ انھوں نے سنگسار کر دینے کی بھی دھمکی دی۔ بس اس کے بعد فریضۂ تبلیغ و دعوت کی آخری منزل نمودار ہوگئی۔ یعنی ہجرت کا حکم آگیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام آخری دو ٹوک بات کہکر علحدہ ہوگئے۔

تفسیر سورۂ اخلاص (اردو)

معارف قرآن

تفسیر قرآن

۶

امین احسن اصلاحی

ولقد یسرنا القرآن الآیہ کی صحیح تاویل اب اس راہ کی صرف ایک مشکل اور باقی رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر توقف کرکے اس پر بھی غور کرلینا چاہیئے۔ جو لوگ قرآن مجید کو محل تدبر نہیں سمجھتے، وہ عموماً آیت مندرجہ عنوان سے حجت پکڑتے ہیں کہ قرآن مجید ایک سیدھی سادی کتاب ہے۔ پند و موعظت کی ضروری باتیں ایک نہایت آسان لفظوں میں بیان کردی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعریف میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے نہایت آسان بنایا۔ پھر اس کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہر شخص جو عربی جملوں کا مطلب سمجھ سکتا ہے، بے تکلف قرآن مجید کی آیتوں کے معانی و مطالب بھی سمجھ سکتا ہے، وہ روایات، تفاسیر، شان نزول وغیرہ کا ممنون احسان کیوں ہو؟ اس خیال کی بعض غلطیاں واضح ہوچکی ہیں اور بعض آگے چلکر بے نقاب ہونگی۔ اسوقت اس آیت پر غور کرنا ہے۔

لوگ قرآن مجید کے سہل ترین کتاب ہونے کے ثبوت میں عموماً یہی آیت پیش کرتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے خود اس آیت کی اصل حقیقت پر غور نہیں کیا۔ اس آیت کا عام طور پر یہ مطلب مشہور ہے کہ قرآن مجید نصیحت حاصل کرنے کیلئے نہایت آسان کتاب ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر نہایت صحیح ہے لیکن اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ بلاشبہ تفسیر کی کتابوں میں اس کی تاویل میں بعض ایسے اقوال

بھی نقل ہوگئے ہیں جو آیت کی اصل حقیقت سے دور کرنے والے ہیں۔ مثلاً بعضوں نے کہا ہے کہ "قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے نہایت آسان کتاب ہے" لیکن معتبر کتب مثلاً تفسیر کبیر وغیرہ میں ایسے اقوال بھی ملتے ہیں جو اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ البتہ اردو مترجمین کو اس تعبیر حقیقت میں دقتیں پیش آئی ہیں جس کا سبب زیادہ تر اردو زبان کی بے مائگی ہے بسا اوقات عربی زبان کا ایک چھوٹا سا لفظ جن وسیع معانی پر مشتمل ہوتا ہے، اردو زبان کا ایک پورا فقرہ ان کو نہیں سمیٹ سکتا۔ ایسے مواقع پر مترجمین مجبوراً تعبیر حقیقت کے لئے کوئی ایسا لفظ اختیار کر لیتے ہیں جو مفہوم کو ایک حد تک تعبیر کردے۔ یہ ترجمہ وتعبیر کی عالمگیر مشکل ہے جو ہر زبان کے مترجم کو پیش آتی ہے۔ لیکن عربی زبان اور بالخصوص قرآن مجید کے مترجم کے لئے تو اس معاملہ کی پیچیدگی بعض اوقات بالکل عاجز و درماندہ کردینے والی ہوتی ہے۔

اسی قسم کی مشکل اس آیت میں بھی ہے۔ اس کے دو لفظوں "یسرنا" اور "ذکر" پر لغت، کلام عرب اور قرآن مجید کی روشنی میں غور کرنا چاہئے۔

ارباب تاویل نے "یسرنا" کا مفہوم مختلف لفظوں سے ادا کیا ہے۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں ھوناہ ابن زیدؒ فرماتے ہیں بیناہ۔ ہمارے اردو مترجمین اس کا ترجمہ کرتے ہیں "ہم نے آسان بنایا"۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اصل لفظ کی قریب ترین تعبیریں ہیں، جن سے فی الجملہ لفظ کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کے تمام اطراف وجوانب روشنی میں آگئے ہوں۔ "یسر" کے معنی اصل لغت میں لین وانقیاد کے ہیں۔ اسی سے تیسیر ہے۔ تیسیر کے معنی ہیں کسی شئے کو کسی مقصد کے لئے بالکل موزوں، صالح، موافق، ٹھیک بنا لینا۔ مثلاً کہیں گے، یسّر الفرس اس کے معنی ہوں گے گھوڑے کو زین ورکاب اور لگام سے آراستہ کرکے سواری کے لئے بالکل تیار کرلیا۔ یسّر ناقتہ للسفر اذا رحلھا ویسر الفرس للغزو اذا اسرجہ والجمہ۔ اعرج معنی کا شعر ہے۔

وقمت الیہ باللجام میسرا   ھنالک یجزینی الذی کنت اصنع

یعنی جس چیز سے جو کام لینا ہی، جو مقصد حاصل کرنا ہے اس مقصد کیلئے اسکو اسقدر موزوں اور مناسب بنا لیا جائے کہ اگر کوئی شخص اس سے وہ مقصد حاصل کرنا چاہے۔ تو بہتر سے بہتر طریقہ پر حاصل کر سکے۔ یہانتک کہ اس مقصد کے حصول کیلئے اس سے زیادہ قریب اور آسان راہ کوئی دوسری نہ ہو۔ یہیں سے اہل صالح بنانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ مضرس بن ربعی کا شعر ہے۔

ونعين فاعلنا على ما نابه حتى نيسّره لفعل السيد

"للذکر" کا ترجمہ بعض مترجمین نے "نصیحت حاصل کرنے کیلئے" کیا ہے اور بعض نے "سمجھنے کیلئے"۔ ہمارے نزدیک دوسرا ترجمہ لفظ کی روح سے زیادہ قریب ہے۔ گو اصل لفظ کا پورا قائم مقام یہ بھی نہیں۔ ذکر کے معنی یاد کرنے اور بیان کرنے کے ہیں یہ لفظ کتاب آسمانی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ۔ اہل کتاب سے پوچھو۔ قرآن مجید کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اور یہ مبارک ذکر ہے جس کو ہم نے اتارا ہے قرآن مجید کے لئے بطریق صفت بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ

قرآن مجید کو "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کرنے میں ایک خاص حکمت ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ تعلیم الٰہی سرتا سر فطرت انسانی کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور آسمانی صحیفوں کے ذریعہ جو تعلیم دی ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان پر اس کے اوپر سے چپکا دی گئی ہو بلکہ یہ اس کے باطن کی صدا ہے، اس کی روح کا نغمہ ہے، اس کی فطرت کا اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام تعلیمات کے مبادی انسان کے اندر ودیعت کر دئے ہیں۔ اسی لئے اسلام کو دین فطرت کہا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ انسان کی اسی فطرت کو جگانے اور ہوشیار کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے اسی لئے انبیاء کو مذکر کہا فَذَكِّرْ فَاِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ اور ان کی تعلیم و دعوت کو تذکیر و ذکری کے لفظ سے تعبیر فرمایا فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى کیونکہ حقیقت میں تعلیم الٰہی تذکیری ہے۔ دین و مذہب کا یہ پورا نظام کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان پر ایک بوجھ کی طرح لاد دیا گیا ہو۔ اس کا تخم اسکی فطرت کے اندر ودیعت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعہ اس کی آبیاری کا سامان فرمایا۔ اور وہ ایک تناور درخت

ہو گئی جس طرح زمین نمو اور روئیدگی کے تمام خزانوں سے معمور ہے لیکن بارش کی محتاج ہے کہ وہ نازل ہو کر اسکے ان تمام خزانوں کو ابھار کر سطح پر پھیلا دے اسی طرح فطرت انسانی بھی علم و حکمت کے تمام خزانوں سے معمور ہے لیکن اپنی شادابی اور زرخیزی کیلئے ایک آسمانی بارش کی محتاج ہے جب وہ بارش ہو جاتی ہے اسکی گود لعل و گہر سے بھر جاتی ہے۔ اگر یہ بارش نہ ہوتی، انسانی فطرت ایک مردہ زمین کے مانند ہوتی جو زندگی اور حیات کے آثار سے یکقلم محروم ہوتی۔ اسی لئے بعض جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو بارش سے تشبیہ دی۔

قرآن مجید کے مختلف ناموں میں سے "تذکرہ" اور "نور" دو نام ایسے ہیں جو نہایت واضح طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ تذکرہ کے معنی یاد دہانی کے ہیں یعنی قرآن مجید جو کچھ تعلیم دیتا ہے وہ بالکل مطابق فطرت ہونے کی وجہ سے ایسی دلنشین ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ ہم کو ہمارا بھولا بسرا سبق یاد دلا رہا ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا ہے جو ہمارے لئے اجنبی اور بیگانہ ہو

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور نور کے معنی روشنی کے ہیں۔ روشنی اشیاء کو اجاگر کر دیتی ہے۔ یعنی انسانی فطرت کے تہ بہ تہ پردوں کے اندر علم و حکمت کے جو لعل و گہر چھپے ہوتے ہیں کتاب الٰہی کی روشنی نمودار ہو کر ان کو آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ذکر کا لفظ نہایت اہم ہے۔ یہ تمام علم کی اصل ہے۔ علم کے حصول کی راہ یہ ہے کہ انسان ذکر کرے۔ یعنی یاد کرے۔ علم و حکمت کے تمام اسرار اس کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ لیکن وہ ان کو بھول گیا ہے اور ایک بھولی ہوئی چیز کے معلوم کرنے کا راستہ یاد کرنا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ یہی راہ کھولنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء مبعوث فرمائے اور اسی مقصد کے لئے اس نے کتابیں نازل فرمائیں اور پھر سب سے آخر میں قرآن مجید اتارا جو اس مقصد ذکر کے لئے سب سے زیادہ موزوں، صالح اور آخری کتاب ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نہایت آسان ہے یعنی علم و حکمت کی بلندیوں تک پہنچنے کا اس سے زیادہ سہل اور آسان رستہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سب سے زیادہ قریبی، سب سے زیادہ ہموار، سب سے زیادہ مامون راہ یہی ہے۔ دوسری راہوں میں گمراہیاں ہیں، فتنے ہیں، دشوار گذار گھاٹیاں ہیں، ناقابل عبور سمندر ہیں، ہولناک بیابان

وصحرا ہیں۔ مگر قرآن مجید کی راہ بالکل بے خطر ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لئے اللہ کی کھولی ہوئی راہ یہی ہے اس لئے
اس میں کوئی کجی نہیں ہے یہ صراط مستقیم ہے۔ دین قیم ہے اور انسانی وشیطانی تصرفات اس کی سیدھائی
کو کج نہیں کرسکتے ہیں۔ جو اس راہ کو اختیار کرے گا وہ خدا تک ضرور پہنچے گا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
اس راہ کے رہرو کو قطع مسافت اور زاد و راحلہ کی تمام ذمہ داریوں سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہو کل
تک یورپ اور ہندوستان کے درمیان کا راستہ کتنا لمبا اور دیر طلب تھا۔ آج کسقدر مختصر ہوگیا ہے؟
لیکن کیا اب سفر کی تمام مشکلات بکلیہ ختم ہوگئیں؟ کل تک سمندروں میں بادبانی کشتیاں چلتی تھیں۔
اب ان کی جگہ دخانی جہازات نے لے لی۔ بحری سفر کی بے پایاں مشکلات کتنی قابو میں آگئی ہیں؟
لیکن سمندر سمندر ہی رہے خشکی نہیں بنگیا ہے یہی حال ہماری روحانی دنیا کا ہے علم حقیقی کی مثال ایک بحر
ناپیدا کنار کی ہے جس کو کسی زمانہ میں بادبانی کشتیوں کے ذریعہ پار کرنیکی کوشش کی جاتی تھی لیکن جب
اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی، اس سمندر کے لئے، اس نے وہ سفینہ بھیج دیا جو تکمیل کار کا بالکل آخری
نمونہ ہے۔ اس نے تمام براعظموں کی سرحدیں ملادیں، سمندر کی ہولناکیاں مسخر کریں۔ موجوں اور پہاڑوں
کو زیر کرلیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن سمندر سمندر ہی رہا، باغ وچمن نہیں بنگیا ہے۔

پس قرآن مجید حصول علم کے لئے نہایت موزوں اور صالح کتاب ہے۔ اگر کوئی طالب علم اسکی
رہنمائی میں حقیقت تک پہنچنا چاہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوگی کیونکہ اس نے وہ
راہ اختیار کرلی جس سے زیادہ سیدھی اور ہموار راہ کوئی دوسری نہیں ہے۔ حضرت قتادہؓ نے فھل من
مدکر کی تاویل میں فرمایا ھل من طالب علم فیعان علیہ۔ یہ قول اسی حقیقت کی طرف اشارہ
کررہا ہے۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں ویجوزان یکون المعنی ولقد ھیّاناہ للذکر من یسرنا قتہ
للسفر اذا رحلھا ویسرفرسہ للغزو اذا اسرجہ والجمہ۔ یعنی یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ”ہم نے
ذکر (یعنی حصول علم) کے لئے قرآن مجید کو تیار کر دیا ہے جیسا کہ محاورہ ہے یسرناقتہ للسفر ویسرفرسہ

للغزد۔ حضرت امام رازی نے اس آیت کے تحت جو مختلف اقوال نقل کئے ہیں ان میں سے ایک قول اس تاویل کی تائید کرتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس آیت کا عام طور پر جو مطلب لوگ سمجھتے ہیں اور پھر اس سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ جس سورہ میں یہ آیت وارد ہے اس پر غور کرنے سے بھی وہی حقیقت سامنے آتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یہ آیت سورہ قمر کی ترجیعات میں سے ہے۔ سورہ قمر میں یہ بیان ہوا ہے کہ کفار وعدۂ قیامت کی تکذیب کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر عذاب کو واقعی آنا ہے تو اس کی کوئی نشانی ہمارے پاس آجائے ورنہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اسکے بعد ایمان لائینگے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے پہلے بہت سی قوموں نے اسی طرح آیتہ عذاب کا مطالبہ کیا اور وہ ہلاک کردی گئیں کیونکہ آیتہ عذاب دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان وہدایت کی راہ نہیں کھلی۔ ایمان وہدایت کی راہ عقل ودلیل کی راہ ہے۔ جب عقل اور سمجھ کی رہنمائی قبول کرنے سے انھوں نے انکار کردیا تو ایمان وتصدیق تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ عقل کو معطل کر دینے کی وجہ سے انھوں نے آسمان وزمین کی بیشمار نشانیوں کی تکذیب کردی ہے بے شمار صحیفوں کو جھٹلا دیا، لاتعداد معجزات سے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ جنھوں نے ہزاروں کا انکار کردیا وہ ایک کو مان لیں گے جس دلیل سے انھوں نے سب کا انکار کیا اسی سے وہ اس ایک کا بھی انکار کردیں گے۔ پس آیات ومعجزات کا مطالبہ بالکل فضول ہے۔ اگر وہ ایمان لانا چاہتے ہیں اور یہ وعدہ محض استہزاء اور شرارت نہیں بلکہ سچائی کے ساتھ ان کے دل کا اقرار ہے تو علم اور عقل کی راہ اختیار کریں اور علم کے حصول کے لئے ہم نے قرآن مجید کو نہایت مکمل اور موزوں بنادیا ہے۔ اس میں ہر سوال کا جواب ہے۔ ہر شبہہ کا اطمینان ہے۔ ہر خلش کے لئے تشفی ہے۔ بس اس کو اختیار کرلیں وہ ہر منزل میں رہنمائی کریگا اور زمین وآسمان کے تمام گوشوں کو بے نقاب کردیگا۔

تیسیر کے بعض پہلو | تیسیر قرآن کی اصل حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب اس کے بعض ان پہلوؤں پر

ہیے جن کی طرف خود قرآن مجید نے اشارہ فرمایا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ درحقیقت حصول علم کے لئے
ید سے بڑھکر کوئی کتاب صالح اور موزوں نہیں ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات قرآن مجید کا عربی مبین میں نازل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے
مجید کی اس خصوصیت کا ایک سے زیادہ مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف)
ہٗ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (طٰہٰ) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (فصلت) وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (نحل)
قرآن مجید کے اولین مخاطب عرب تھے۔ ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ قرآن مجید
میں ہو بصورت دیگر اس کے ان کے لئے تیسیر نہ ہوتی۔ ان کو اعتراض ہو سکتا تھا کہ قرآن مجید ان کے لئے پوری
نہیں کھولا گیا۔ اسکی زبان عجمی ہے اور ہم عرب ہیں۔ عربی اور عجمی کا کیا جوڑ؟ لَقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ
ءٌ وَّعَرَبِيٌّ (فصلت) اس لئے قرآن مجید عربی میں نازل ہوا۔ پھر عربی بھی وہ جو مبین ہے۔ بالکل واضح اور
ف، مغلق اور پیچیدہ نہیں جس کو ہر طبقہ بآسانی نہ سمجھ سکے، محدود اور تنگ نہیں جس کے اسالیب
اعد اور الفاظ قبیلوں اور جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہوں۔ وہ عربی جو فصحائے عرب کی بولی تھی جسکو
ب سمجھتے تھے اور جس کی فصاحت پر سب کا اتفاق واجماع تھا۔ پس عربی زبان میں قرآن مجید کا اترنا
بوں کے لحاظ سے نہایت واضح تیسیر تھی۔ چنانچہ بعض آیات میں اسکی تصریح ہے۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ
لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (مریم، ۹۷) فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (حاشیہ ۵۸)
ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ تیسیر عربوں کے لئے ہوئی۔ عربی زبان میں، قرآن کے اترنے سے اہل عجم
کو کیا فائدہ ہوا؟ یہ بات صحیح ہے۔ تیسیر کا یہ پہلو عرب کے لئے مخصوص ہے۔ سب کے لئے عام نہیں ہے۔ لیکن
اس مسئلہ پر ایک دوسرے اعتبار سے غور کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کے لئے کسی خاص قوم پر کسی خاص زبان
میں اترنا ناگزیر تھا۔ تمام قوموں پر تمام زبانوں میں اترنا حکمت الٰہی کے خلاف ہوتا۔ اسلام ایک عالمگیر
وحدت کی دعوت ہے۔ اس کیلئے ضروری تھا کہ دنیا کو جو آخری پیغام دیا جائے، اس کا مرکز، ایک قوم، ایک مقام

ایک وجود، ایک زبان ہو۔ حکمت الہیہ نے بحیثیت قوم کے بنی اسماعیل کو بحیثیت مقام کے خانہ کعبہ کو بحیثیت وجود کے محمد بن عبداللہ (علیہ الف الف تحیۃ) کو بحیثیت زبان کے عربی مبین کو برگزیدہ فرمایا۔ اور آج کون کہہ سکتا ہے کہ یہ انتخاب بہترین انتخاب نہ تھا۔ مذہب کے حقایق، حکمت کے نکات و رموز، عالم غیب کے اسرار و حکم بیان کرنے کے لئے عربی زبان سے بڑھکر اور کون زبان موزوں ہو سکتی تھی، پس اس اعتبار سے یہ تیسیر تمام عالم کے لئے ہوئی۔ یہاں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) تیسیر کا دوسرا پہلو قرآن مجید کا نجماً نجماً نازل ہونا ہے۔ اگر پورا قرآن مجید جملۃً واحدۃً نازل ہو جاتا تو اس کی تعلیمات دلوں میں راسخ نہ ہوتیں۔ عمیق تعلیمات کے لئے بالخصوص جبکہ ان کو عمل اور عقیدہ بنانا ہو، ضروری ہے کہ آہستہ آہستہ، سبق سبق کر کے، سکھا جائے تاکہ وہ دل و دماغ میں پوری طرح سرایت کر جائیں اور ایک ایک بات عمل میں آکر بالکل متشہود ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے معاملہ میں ایسا ہی کیا، اس کو یک دفعہ نہیں نازل فرمایا۔ بلکہ آہستہ آہستہ، حالات کے تقاضہ اور ضروریات کے مطالبہ پر نازل فرمایا۔ اور جب کفار نے اعتراض کیا کہ قرآن مجید تورات کی طرح یک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا، جستہ جستہ کیوں اترتا ہے؟ ان کے جواب میں فرمایا کَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۳۲ الفرقان) ایسا اس لئے ہے کہ ہم اس طرح تمھارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اتارا۔ دوسرے مقام پر فرمایا لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (بنی اسرائیل) تاکہ تو اس کو لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ سنائے۔ حصول علم (ذکر) کا سب سے زیادہ صحیح اور آسان طریقہ یہی ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو اختیار فرمایا۔ تیسیر کا یہ پہلو سورہ قمر کے عمود سے ایک نہایت لطیف مناسبت رکھتا ہے لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں پڑنے کا نہیں ہے۔

(۳) سورہ ہود کے شروع میں قرآن مجید کی تعریف میں فرمایا ہے۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں

من لدن حکیم خبیر — پھر ایک حکیم وخبیر کی طرف سے انکی تفصیل کی گئی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ابتداء میں محکمات اور کلیات کی تعلیم دی، اس کے بعد جزئیات کی تفصیل کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ طریقہ تعلیم فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے۔ اس لئے قرآن نے یہی اختیار فرمایا۔ کی سورتوں میں دین کی تمام اصولی تعلیمات، توحید، رسالت، معاد وغیرہ نہایت مختصراً اور جامع لفظوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیلات سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ محکمات وکلیات کو اچھی طرح راسخ کر لینے کے بعد جزئیات کی تفصیل کی طرف توجہ فرمائی اور مدنی سورتوں میں تمام تفصیلات بیان ہوئیں۔ قرآن مجید کا یہ طریقہ اجمال وتفصیل، انسانی فطرت کے بالکل مطابق ہونیکی وجہ سے منجملہ وجوہ تیسیر کے ہے۔

(۴) تیسیر کا ایک نہایت اہم پہلو تصریف آیات ہے۔ قرآن مجید نے تصریف آیات کا ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر فرمایا ہے انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصدفون۔ (انعام ۴۶) دیکھو کیسے ہم پھیر پھیر کر اپنے دلائل بیان کرتے ہیں پھر وہ اعراض کرتے ہیں۔ انظر کیف نصرف الآیات لعلھم یفقھون (انعام) دیکھو کیسے ہم اپنی دلیلیں پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ تصریف آیات کا مطلب قرآن مجید کے تدبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی بات مختلف اسلوبوں اور مختلف دلیلوں سے بیان ہوتی ہے۔ ایک ہی دلیل مختلف دعاوی پر حجت ہے۔ ایک ہی چھوٹی سی آیت اسرار وحکم کا ایک پورا عالم بے نقاب کر رہی ہے۔ یہ لفظ آیات کے لئے تصریف ریاح سے لیا گیا ہے۔ تصریف ریاح کی حقیقت کیا ہے؟ ایک ہی ہوا ہے لیکن اس کے تصرفات کی گوناگونی کا کیا عالم ہے! وہ رحمت بھی ہے اور نقمت بھی۔ کبھی آہستہ چلتی ہے اور چمن میں پھولوں کو کھلاتی اور کھیتوں میں فصلوں کو پکاتی ہے۔ کبھی سموم بنکر نمودار ہوتی ہے اور چمنستانوں اور باغوں کو دشت وصحرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ کبھی بادلوں کو اپنے کاندھے پر لاد کر لاتی ہے جو تمام زمین کو جل تھل کر دیتے ہیں۔ کبھی ان کو ہنکا کر لیجاتی ہے کہ ان کو ہنکا کر لیجانے ہی میں زمین والوں کے لئے خیر وبرکت ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک اور پھر سال کے مختلف مہینوں میں جانے وہ

کتنے بھیس بدلتی ہے اور اسکا ہر بھیس اس کائنات کی زندگی اور نشو و نما کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ وہ کبھی گرم ہوتی ہے، کبھی سرد، کبھی خشک ہوتی ہے کبھی تر، کبھی آندھی اور طوفان کی ہولناکی بنکر نمودار ہوتی ہے۔ کبھی نسیم صبح کی جاں نوازی اور عطر بیزی کا پیام بنکر۔ اللہ تعالیٰ نے اس تصریف ریاح کا مختلف مقامات میں ذکر فرمایا ہے۔ سورہ ذاریات اور مرسلات میں اسکے عجائب تصرفات کی قسم کھائی ہے۔ بعینہ یہی حال قرآن مجید میں آیات الٰہیہ کا ہے بعض اوقات ایک ہی آیت اتنے گوناگوں پہلو رکھتی ہے کہ ان سب کا احاطہ ناممکن، اور ایک ہی مضمون اتنی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہو کہ اسکا احصاء دشوار۔ اسی بات کو تصریف آیات سے تعبیر فرمایا ہے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے، سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ بارش کی مثال بیان فرمائی ہے۔

وھو الذی یرسل الریاح بشرا بین یدی رحمتہ الایہ (۵۶) — اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری بناکر اپنی رحمت سے پہلے

اس مقام پر بارش کی مثال چند نہایت اہم حقایق پر روشنی ڈال رہی ہے۔ مثلاً

(۱) خوف اور طمع ہر حال میں اللہ ہی کو پکارنا چاہئے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی رحمت ہمیشہ اس کے بندوں سے قریب ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عرصہ تک بارش نہیں ہوتی ہے، تمام زمین جل جاتی ہے۔ تم آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہو، بارش کا کوئی نشان نہیں پاتے۔ لیکن دفعتہً کسی کونے سے ابر کا کوئی ٹکڑا نمودار ہوتا ہے اور آناً فاناً دیکھتے ہو کہ تمام زمین جل تھل ہوگئی اور تمہاری مایوسیاں امید سے بدل گئیں

ادعوہ خوفا وطمعا ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین۔

(۲) تم کو قیامت پر تعجب ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ جب لوگ سڑگل جائیں گے تو قبروں سے جی اٹھیں گے حالانکہ اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اس کا مشاہدہ تم برابر کرتے ہو۔ تمام زمین جل گئی ہے۔ گھانس کا ایک تنکا بھی کسی گوشہ میں نظر نہیں آرہا ہے کہ دفعتہً بارش ہوتی ہے اور چند دنوں کے اندر دیکھتے ہو کہ تمام سطح زمین پر سبزہ کی بانات بچھ گئی ہے سقنٰہ لبلد میت فانزلنا بہ الماء فاخرجنا من کل الثمرات

لا یخرج الموتیٰ۔

(۳) بارش زمین کے ہر حصہ پر ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج و اثرات ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے
نے دیکھا ہوگا کہ جو زمینیں زرخیز تھیں، پانی برستے ہی انھوں نے اپنے تمام مدفون خزانے اگل دیے۔ باقی
ہیں شور تھیں ان میں یا تو کوئی چیز اگی ہی نہیں اور اگر اگی تو وہ چیز نہیں جس کا انسان پھل کھائیگا
وہ چیز جس سے وہ آزار اٹھائے۔ یہی حال آسمان کی روحانی بارش کا ہے۔ زمین کے موسموں کی طرح اس کا
، ایک موسم آتا ہے اور خدا آسمان سے ہدایت نازل فرماتا ہے، جس کا پیام تمام انسانوں کے لئے عام ہوتا ہے
ن فیض بقدر استعداد پہنچتا ہے۔ جو فطرت صالح ہوتی ہے وہ اس بارش سے نمو اور برکت حاصل
تی ہے اور جو فاسد ہوتی ہے، اس بارش سے اس کا فساد ہیجان میں آتا ہے۔ والبلد الطیب یخرج
ته باذن ربه والذی خبث لا یخرج الا نکدا

دیکھو بارش کی ایک ہی حکایت سے کیا کیا دلیلیں روشنی میں آئی ہیں۔ ان سب نتائج کی طرف
ارہ کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کذلک نصرف الآیات لقوم یشکرون (۵۸ مائدہ) اس تصریف
تعلیم یا تیسیر قرآن میں جس قدر دخل ہو سکتا ہے۔ اس بحث کرنے کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے
س موقع پر صرف اسقدر یاد رکھنا چاہئے کہ تصریف آیات کا مقصد خود قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق
ہے کہ لوگ تذکر کریں اور سمجھیں۔ ولقد صرفنا فی هذا القرآن لیذکروا ومایزیدهم الا نفورا
ر ہم نے اس قرآن میں اپنے دلائل پھیر پھیر کر بیان کئے کہ لوگ تذکر کریں لیکن یہ چیز ان کی نفرت ہی بڑھاتی ہے
نظر کیف نصرف الآیات لعلهم یفقهون۔

تیسیر قرآن کے یہ چند نمایاں پہلو بیان ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جو
رآن سے استنباط کر کے اس ذیل میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی
ہ آیت تیسیر کا جو مطلب عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس میں نہایت سخت غلط فہمیاں ہیں۔ اقلیدس اور ریاضی

کسی کتاب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب اقلیدس اور ریاضی سیکھنے کے لئے نہایت آسان ہے تو اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ فن اقلیدس اور ریاضی میں اب کوئی مشکل نہیں باقی رہ گئی۔ بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ ان فنون کی تعلیم کے لئے جو بہتر سے بہتر اسلوب اور طریقے اختیار کئے جا سکتے تھے یہ کتاب ان تمام کمیل کانٹے سے درست ہے۔ یہی حال قرآن مجید کا ہے۔ بلاشبہ وہ ذکر یعنی حصول علم اور یاددہانی کے لئے نہایت آسان ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم دین فکر و تدبر کی تمام کاوشوں سے مستغنی ہو گیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس عظیم الشان علم کے حصول کے لئے جو اتھاہ سمندر ہے ایک ایسی کتاب نازل ہوگئی جو بہتر سے بہتر طریقہ پر مسلح ہے۔

قرآن مجید کے متعلق پچھلے صفحات میں، ہم نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ درحقیقت استاذ امامؒ کے چند اجمالی اشارات کی تفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کے خیالات خود ان کے الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں

"(۱) قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور نہایت چھپا اور مشکل بھی.... خدائے پاک کو دیکھو کہ ہم سب اسے جانتے ہیں اور پھر کوئی بھی نہیں جانتا جو اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز میں شک ہو تو ہو مگر اپنی ہستی میں کبھی شک نہیں مگر پھر دیکھو تو بقول غالب

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

قرآن خود بھی اپنے تئیں کھلا اور آسان بتاتا ہے گو دوسرے لحاظ سے مستور و عمیق، اسی طرح خدائے پاک کی نسبت کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

(۲) ظاہر ہے کہ دو متناقض باتیں اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں تو ضرور یہ اجتماع النقیضین دو مختلف پہلوؤں سے ہوگا پس قرآن پاک کا آسان اور مشکل دونوں ہونا ضرور دو حیثیت سے ہوگا چنانچہ

ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت آسان ہے مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے لحاظ سے نہایت مشکل ہے اور یہی مناسب ہے کیونکہ جو لوگ اعلیٰ ترقی کی لیاقت تک نہیں پہنچے ان کے لئے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کر دیئے جائیں تو بھی نہ تو وہ اسے سمجھ سکیں گے اور نہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ اون کے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچے گا، یہ اس لئے کہ دین کا راستہ سیر باطن ہے۔ سیر باطن تفکر اور تدبر سے ہوتی ہے، اگر کسی شخص کو وہ باتیں جو وہ غور و فکر سے حاصل کر سکتا ہے پہلے ہی بتا دی جائیں تو اس کی قوتِ فکر ضائع ہو جائے گی، اور اس بتائی ہوئی بات کو بھی اس تیقن کے ساتھ نہ سمجھے گا جیسا کہ چاہئے اور آئندہ کی ترقی سے محروم رہیگا، اسی لئے خدائے تعالیٰ نے نظامِ عالم میں کوشش کو ضروری قرار دیا تا کہ انسان اپنی اعلیٰ ترقی تک پہنچ سکے تعلیم میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ تعلیم ایک لفظ بےمعنیٰ ہوگا کیونکہ قوائے عقلیہ کے بیکار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہوگا۔ یہ بات تو علم ظاہری کی ہے۔ علم باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کر لو کیونکہ اس میں جاننا اسی کا نام ہے جس کو ہونا کہتے ہیں اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا یہ جاننا دین میں مسلم نہیں، حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں تو ایسی ہی سمجھتا ہے۔ سقراط سرگروہ حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا ہے۔

(۳) پس عام حکمت الٰہی کے موافق جس پر مدار ترقی انسانی ہے، قرآن کو محل تدبر اور تفکر ترا یا گیا اور ظاہر کو باطن کی طرف متوجہ کیا گیا، خداوند تعالیٰ ہم کو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کی طرف رہبری کرتا ہے اور پھر جوں جوں ہم کوشش کرتے جاتے ہیں انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور یہی عدل ہے، ورنہ کیوں فرق مراتب ہے۔ پس اسی طرح فہم قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا جائیگا، اس پر اسرار کھلتے جائیں گے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ ان کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا پس درحقیقت یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین

کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے اور اسکا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں، چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے جو لوگ روشنی قبول کرتے ہیں خدا انکی روشنی زیادہ کرتا ہے"۔ عام تعلیم میں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ کیسی ہی صاف تحریر ہو ابجد خواں کیلئے وہ پیچیدہ ہے مگر ایک ماہر کے نزدیک اسکو پیچیدہ کہنا صریح ظلم ہوگا۔ قرآن نے اپنی اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق در مکنون کلام ہے خود بتادیا ہے، پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھ دئے کہ جنکے معنی ابتک باوجود اس قدر کوشش کے ظاہر نہ ہوئے۔ گویا کہ اس معنوی راہ کے اول ہی قدم پر یہ کتابہ لگا دیا گیا ہے ع

ہشدار کہ رہ بر دم تیغست قدم را

اور نہ صرف اول میں بلکہ اور بھی جابجا منزلوں کے سرے پر ایسی ہی کتابہ آویزاں کر دیا کہ مبادا اگر کوئی ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے

(۴) پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا "اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لیلو تمام دریا کو اپنی کلھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو" صحابہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا۔ دریا سے عبور کرکے اپنی منزل مقصود کو پہنچے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیدا کنار جان گئے تھے۔ ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا۔ اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے واقع تھے ان کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے "اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے"

(۵) جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھکر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لئے کافی ہے۔ وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں ان میں بعض اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھے ہیں وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جائے قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھیگا۔

عیسٰی علیہ السلام سے جب ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ آپ بذریعہ تشبیہات کیوں تعلیم دیتے ہیں تو یہی فرمایا "تاکہ یہ بات منکروں پر پوری ہو کہ سنتے ہیں اور نہیں سنتے اور دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے" قرآن اپنی نسبت کہتا ہے کہ "اس سے بدکاروں کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے" چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کے ماننے کے لئے آمادہ تھے انھوں نے بے تکلف اسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ جس نے پس و پیش کیا اس نے اپنی منزل کھوئی اور منھ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا۔ کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام میں اپنا رہنما بناتا تھا جب اسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ اس سے بیزار ہوا اور کہنے لگا کہ اس کلام میں جادو ہے کہ میری سمجھ الٹی ہوئی جاتی ہے۔ پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بیکار حیلے ڈھونڈنے تاکہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈالدے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر ہے کہ جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اسے بھی کھو بیٹھا۔ اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ (دیباچہ تفسیر سورہ اخلاص) (باقی)

تفسیر سورۃ الفیل (عربی)

سورۂ حج کی ایک آیت کی صحیح تاویل

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ الآیۃ

از مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی

اس آیت کے شان نزول میں ایک روایت ہے، جو تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح قریش کے سربرآوردہ اشخاص ایمان لائیں لیکن آپ ان کی طرف سے انکار و اعراض کے سوا کوئی جواب نہ پاتے۔ اس کا آپ کو نہایت قلق ہوتا۔ یہاں تک کہ آپ نے تمنا کی کہ کاش خدا کی جانب سے، کوئی ایسا پیام نازل ہو جو بجائے نفرت پیدا کرنے کے ان کو اسلام کی طرف مائل کر دے۔ ایک روز آپ قریش کی کسی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ سورہ والنجم نازل ہوئی۔ جب آپ نے لوگوں کے سامنے یہ آیت پڑھی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ، شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ کہلا دیئے "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی" یعنی (یہ بت معظم و محترم ہیں۔ اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔) اس کے بعد جب آپ نے آیت سجدہ پر پہنچکر سجدہ کیا تو تمام کفار نے آپ کی متابعت کی۔ ولید ابن مغیرہ اور سعید ابن العاص بڑھاپے کی وجہ سے سجدہ نہ کرسکے۔ انھوں نے مٹی لیکر پیشانی پر مل لی پھر جبریل علیہ السلام نے آکر آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ جملے کہاں سے بڑھا دیئے میں تو اسے نہیں لایا تھا؟ تو آپ کو اس کا سخت غم ہوا اس وقت آپکی تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی "وما ارسلنا من قبلک" الآیہ

یہ روایت مختلف طرق سے مروی ہے۔ اوران میں باہم کسی قدر اختلاف بھی ہے۔ بعض میں ہے کہ یہ واقعہ نماز کی حالت میں پیش آیا لیکن نتیجہ کے لحاظ سے سب کا قدر مشترک ایک ہی ہے۔

ہرچند کہ یہ روایت عقلاً، نقلاً لائق اعتنا نہیں لیکن اکثر تفسیر کی کتابوں میں اس نے جگہ پالی ہے۔ علامہ ابن جریرؒ کی مشہور تفسیر میں بھی یہ روایت نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ یہ بات چنداں تعجب انگیز نہیں کہ یہ روایت ان کی کتاب میں آگئی کیونکہ انھوں نے تنقید روایات کا التزام نہیں کیا ہے۔ صرف جمع کی خدمت انجام دی ہے۔ البتہ یہ امر ضرور تعجب انگیز ہے کہ اس آیت کی تاویل میں وہ صرف اسی روایت پر قانع ہوگئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کا اعتماد بھی اسی پر ہے۔ حالانکہ وہ روایات پر اعتماد کرنے میں بہت بے پروا نہیں ہیں۔ ان کا عام طریقہ یہ ہے کہ تمام روایات نقل کرنے کے بعد، آخر میں اپنی رائے اور وجوہ ترجیح بیان کرتے ہیں۔ بعض مواقع پر تو سلف کے اقوال بھی چھوڑ دیتے ہیں اور آیت کا وہ مطلب لیتے ہیں جو نظم کلام اور سیاق و سباق سے نکلتا ہوا ہوتا ہے حالانکہ وہ ایسے مواقع ہوتے ہیں جن میں ان اقوال کی پابندی میں بھی بظاہر کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ پھر تعجب ہے کہ انھوں نے اس روایت پر کیونکر اعتماد کرلیا جو ایک طرف اسلام کے بعض بنیادی اصولوں کے مخالف ہے، اور دوسری طرف قرآن پاک کے صریح نصوص کے۔

اس روایت پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا موضوع ہونا ایک متفق علیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کی نسبت امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں جو کچھ لکھا ہے ہم اس کا خلاصہ پیش کردینا کافی سمجھتے ہیں۔ امام موصوف فرماتے ہیں۔

اما اهل التحقیق فقد قالوا هذه الروایة باطلة موضوعة واحتجوا علیه بالقرآن والسنة والمعقول۔	محققین علماء نے اس روایت کو باطل اور موضوع کہا ہے اور اس کے بطلان پر قرآن، حدیث اور عقلی دلائل سے حجت لائے ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب نے اس روایت کے خلاف سات آیتیں پیش کی ہیں جن میں سب سے زیادہ واضح حسب ذیل ہیں۔

(۱) وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ — اگر وہ اپنی طرف سے گڑھ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اسکا داہنا ہاتھ پکڑ کر اسکی گردن اڑا دیتے۔

(۲) قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحَى اِلَيَّ — کہدو مجھے ایسا مقدور نہیں کہ اسکو اپنی طرف سے بدل دوں میری طرف جو وحی آتی ہے میں تو اسی پر چلتا ہوں۔

(۳) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَى — وہ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں نہیں بناتا ہے بلکہ یہ وحی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

فلوانه قرأ عقیب هذه الآیة تلك الغرانیق العلی لکان قد ظهر کذب الله فی الحال وذلك لا یقوله مسلم — یعنی اگر اس آیت کے بعد آپ نے تلک الغرانیق العلی پڑھا ہوتا تو خدا کا جھوٹ فوراً ظاہر ہو جاتا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا کوئی مسلمان قائل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں "امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ آنحضورؐ نے سورہ والنجم پڑھی، اس وقت تمام مومنین ومشرکین اور جن وانس سجدہ میں گر پڑے۔ لیکن انھوں نے غرانیق کا واقعہ بالکل ذکر نہیں کیا اسی طرح بعض دوسرے طریقوں سے یہ حدیث مروی ہے جن میں واقعہ غرانیق کا کوئی ذکر نہیں ہے"۔ انھوں نے اس روایت کے خلاف متعدد عقلی دلائل بھی قائم کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکے قبول کرنے سے نبی کی عصمت پر دھبہ آتا ہے اور نبی کی عصمت ایک مسلم امر ہے۔

روایت کی لغویت ثابت ہو جانے کے بعد اب سوال یہ ہے کہ اس آیت کی تاویل کیا ہے یوں تو

تابوں میں متعدد تاویلیں مذکور ہیں لیکن اصول تاویل کی کسوٹی پر جانچنے کے بعد ان میں
تاویل بھی قابل اختیار نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ امام رازیؒ نے ان تمام کو رد کرکے ایک نئی تاویل
ہے لیکن جو تاویل انھوں نے اختیار کی ہے وہ بھی کوئی جمتی ہوئی تاویل نہیں ہے۔ ان کی
نغادیہ ہے کہ نبی جب کوئی نیک کام کرنا چاہتا ہے تو شیاطین کی طرف سے اس کے اندر شبہات
س پیدا کئے جاتے ہیں لیکن وہ فوراً ہی اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کا
بہات کو ایک ایک کرکے دور کر دیتا ہے۔ ان کے نزدیک آیت ذیل اسی کے مشابہ ہے۔

زَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ — اگر شیطان کی جانب تمہارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگ لیا کرو۔

لمائے حال میں سے علامہ محمد عبدہٗ سے اس آیت کی دو تاویلیں منقول ہیں اور مفسرین حال زیادہ
ن تاویلوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ تاویلیں بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان
روریاں ہیں جو فکر و تامل کے بعد ظاہر ہوتی ہیں ہم ان دونوں تاویلوں کا خلاصہ پیش کرکے بالاجمال ان کی
کی طرف بھی اشارہ کرینگے۔

یل کا خلاصہ | تمنی کے معنی قرأت و تلاوت کے ہیں جیسا کہ عام طور پر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔
ہیں یہ لفظ کلام عرب میں مستعمل ہے۔ حسان ابن ثابت کہتے ہیں ؎

تمنّی کتاب اللہ اول لیلۃ — واخرہ لاقی حمام المقادر

یک دوسرا شاعر لکھتا ہے ؎

تمنّی کتاب اللہ اول لیلۃ — تمنّی داود الزبور علی رسل

القاء کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی کلام کی ایسی تاویل کی جائے جو متکلم کے منشاء کے خلاف ہو اگرچہ
کا محتمل ہو۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیشہ سے یہ چلا آتا ہے کہ جب کوئی نبی لوگوں کو کلام الٰہی

پڑھ کر سناتا ہے تو جنکے قلوب میں کجی ہوتی ہے اور دوسروں کو بہکانا چاہتے ہیں، اس کلام کے صحیح مفہوم کو بدل دیتے ہیں تاکہ لوگوں کے اندر شبہات پیدا کرکے دین سے برگشتہ کردیں۔ پھر خدائے عزوجل آیات محکمات نازل فرماکر ان شبہات کا ازالہ کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہے کہ برے اور اچھے لوگوں میں امتیاز ہوجائے۔ چنانچہ جو دل کے مریض ہوتے ہیں یا جنکے قلوب سخت ہوجاتے ہیں اس فتنہ میں پڑجاتے ہیں لیکن جنکے دلوں میں علم و یقین کی روشنی ہوتی ہے وہ ان شبہات کی تاریکیوں سے نکل جاتے ہیں۔ اس تاویل کے لحاظ سے یہ آیت سورہ آل عمران کی اس آیت کے مشابہ ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔۔۔۔۔۔۔۔	وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے اور وہ کتاب کی اصل ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ کتاب کے متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑجاتے ہیں اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور انکی حقیقت معلوم کرلیں حالانکہ ان کی حقیقت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پکے ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم ان پر ایمان لائے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہوا اور سچ یہ ہے کہ نصیحت نہیں حاصل کرتے ہیں مگر وہی لوگ صاحب عقل و بصیرت ہیں۔

دوسری تاویل کا خلاصہ تمنی اپنے معروف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نبی کی تمنا اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے۔ چنانچہ تمام انبیاء اس کے متمنی رہے اور آنحضور صلعم کی یہ تمنا تو اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ خدا کی جانب سے اس پر بار بار عتاب نازل ہوا چنانچہ فرمایا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم غم میں ان کے پیچھے آپ کو ہلاک
یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا۔	کرڈالوگے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں گے
وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ۔	اکثر ایسے ہیں جو ایمان نہیں لانیوالے ہیں اگرچہ کتنی ہی آرزو کرو
اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔	کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اس صورت میں القا کے معنی رکاوٹ پیدا کرنے اور نسخ کے معنی اس رکاوٹ کو دور کرنے کے کے ہوں گے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے پیغمبرؐ آپ سے پہلے جتنے انبیاء آئے سب کی یہی تمنا رہی کہ انکی قوم ایمان لائے لیکن شیاطین نے ہمیشہ ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کئے لیکن آخرکار خدانے تمام موانع دور کئے اور ان کی دعوت کو فروغ بخشا اس صورت میں آیت کا مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہوگا۔

یہاں ان تاویلوں پر مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اسقدر اشارہ کرنا ضروری ہے کہ صاحب تاویل نے بعض الفاظ کے غیر معروف معنی لے لئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے حالانکہ قرآن مجید کے الفاظ کے بارے میں ایسا کرنا ایک اصولی غلطی ہے اور سچ یہ ہے کہ اسی چیز نے آیت کے صحیح مفہوم سے دور کر دیا۔ قرآن مجید میں ایسا بہت ہے کہ ایک آیت بظاہر عموم کا اسلوب رکھتی ہے لیکن درحقیقت اس کا رجحان ایک مخصوص مفہوم کی طرف ہوتا ہے جس پر سیاق و سباق اور دوسری متشابہ آیات شہادت دیتی ہیں۔ بلکہ خود اس آیت کے بعض الفاظ بھی اصل حقیقت کی طرف مخفی طور پر اشارے کرتے ہیں لیکن بعض مرتبہ ارباب تاویل کی نظر ان اشاروں کو نہیں سمجھتی اور وہ کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔ پیش نظر آیت کی تاویل میں بھی ایسا ہی ہوا کہ ان مخفی قرائن تک نگاہیں نہیں پہنچیں اس لئے تاویل کا صحیح پہلو بے نقاب نہ ہوسکا ہم آگے چل کر انشاءاللہ ان قرائن کی طرف بالاجمال اشارہ کریں گے۔

اب ہم آیت کی وہ تاویل بیان کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ اس تاویل کی طرف استاذ امامؒ نے متعدد مواقع پر اشارہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس پر کہیں مکمل بحث نہیں فرمائی اس لئے تفصیل ہماری طرف سے ہوگی۔

ہمارے نزدیک یہ آیت معترضین کے شبہ کے جواب میں ہے۔ قرآن حکیم پر جہاں بہت سے شبہات و اعتراضات تھے از انجملہ ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اسکی تعلیم سابق انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہے اور یہ ان احکام کا ناسخ ہے جو اگلی آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن ایک طرف تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ توراۃ و انجیل اور دوسرے اگلے صحائف کا مصدق ہے اور دوسری طرف ان کے اوامر و احکام کے خلاف نئے نئے احکام پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید میں معترضین کا اعتراض مختلف مواقع پر مذکور ہے۔ مثلاً سورہ نحل میں ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ۔ — اور جب ہم ایک آیت کے بدلے دوسری آیت لاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تو افترا پرداز ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — عنقریب احمق لوگ کہیں گے کہ جس قبلہ پر وہ لوگ پہلے تھے اس سے انھیں کس چیز نے پھیر دیا کہہ دو مشرق و مغرب خدا ہی کا ہے جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

اس اعتراض کے دو جواب دیئے گئے ایک جواب وہ ہے جو سورہ بقرہ کی آیت زیر بحث میں ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا یعنی سابق صحیفوں کی جو آیت منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر لاتے ہیں اور جو آیت بھلا دیتے ہیں تو اس جیسی دوسری آیت لاتے ہیں۔ اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ان احکام کی طرف جو اگلی کتب سماویہ میں مذکور تھے۔

لیکن قرآن کے ذریعہ منسوخ ہوگئے۔ ان کے نسخ کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ چونکہ اب دین وشریعت کا ایک مکمل نظام پیش کرنا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ان احکام سے بہتر اور مکمل احکام لائے جائیں۔ دوسرے ان احکام کیطرف جو اہل کتاب نے اپنی شرارت اور نفس پرستی کی بنا پر بھلا دئے تھے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آیت سے مراد اگلے صحیفوں کی آیت ہے، نہ کہ قرآن مجید کی" جیسا کہ مفسرین نے عموماً سمجھا ہے، اس لئے کہ موقع اسی کا مقتضی ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن مجید میں آیت کا لفظ جس طرح آیات قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح توراۃ وانجیل وغیرہ کی آیات کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ سیاق وسباق اور موقع ومحل کے اعتبار سے اس کی تعیین ہوگی۔ مفسرین غالباً اسکو صرف قرآن کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں اور اسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ ایک سے زیادہ آیات میں چوک گئے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دین کے اندر بیشمار ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جو منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ لوگوں نے اپنی اہواء اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنی طرف سے گڑھ لی ہیں قرآن مجید نے مختلف مواقع پر ان کے گڑھے ہوئے احکام کی تردید کی ہے اور ان کی جگہ انبیاء کی صحیح تعلیم پیش کی ہے۔

بہر حال مذکورہ صدر بیان سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں دو قسم کے نسخ کا ذکر ہے۔ ایک احکام کا نسخ دوسرے بدعات کا۔ انہی بدعات کے نسخ کا بیان ان آیات میں ہے، جن پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔

اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے آپ سے قبل جتنے انبیاء بھیجے، جب انھوں نے دعوت حق کی صدا بلند کی۔ تو شیاطین یعنی قوم کے سرداروں نے اس حق کے اندر باطل ملانا شروع کر دیا۔ (ایسا انھوں نے انبیاء کے زمانہ میں بھی کیا اور ان کے بعد بھی) تاکہ عام لوگوں کو اس باطل کے ذریعہ دعوت دین سے برگشتہ کر سکیں۔ چنانچہ علماء یہود اور زعماء مشرکین کا یہی طریقہ رہا۔ اہل کتاب اور مشرکین کی بدعات اور افتراء پردازیوں کا قرآن میں متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ اب جب قرآن نازل ہوا تو اس نے یہ بدعتیں منسوخ کر کے اگلے انبیاء کی اصل تعلیمات ظاہر کر دیں۔

اس نسخ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ کھرے کھوٹے میں تمیز ہو جاتی ہے۔ حق اور باطل کی جماعتیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ ۔ اور جس قبلہ پر تم پہلے تھے ہم نے اسکو اسی غرض سے قرار دیا جو لوگ رسول کی پیروی کریں انکو ہم ان لوگوں سے معلوم

اسی طرح یہاں بھی بتایا ہے کہ اس نسخ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ دل کے کچے ہیں ان کے شیطان کی افترا پردازیاں فتنہ بن جاتی ہیں اور ان کو آڑ بنا کر قرآن پر اعتراض کرتے ہیں لیکن اہل کتاب میں سے مومن ہیں وہ یقین رکھتے ہیں کہ قرآن مجید جو کچھ لایا ہے وہی حق ہے اس لئے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ، وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ . . . .

تاکہ اس (باطل) کو جو شیطان (نبی کے اندر) ملا دیتا ہے لوگوں کے لئے فتنہ بنا دے جو دل کے مریض ہیں اور جن کے دل سخت ہیں اور بلاشبہ ظالم بڑے اختلاف میں ہیں اور جو لوگ جنھیں (صحف سماویہ کا) علم عطا کیا گیا ہے جان لیں کہ حق ہے اور تمہارے رب کی جانب سے ہے تو وہ اس پر ایمان لائیں اور اسکے سامنے ان کے دل جھک جائیں اور خدا اہل ایمان کو سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔

اس موقع پر چار جماعتوں کا ذکر ہے۔ منافقین "الذین فی قلوبهم مرض"۔ یہود "والقاسیۃ قلوبهم"۔ مشرکین "ان الظالمین لفی شقاق بعید"۔ مومنین اہل کتاب "الذین اوتوا العلم" پھر نشر و جمع کے اصول پر صرف دو جماعتیں کر دی ہیں۔ مومنین "ان اللہ لهاد الذین آمنوا الی صراط مستقیم" کفار "لا یزال الذین کفروا فی مریۃ منہ"۔

ایک بات یہ بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ بظاہر اس آیت کے اندر عام بدعات کا ذکر ہے، اس لیے اسلوب بیان عام ہے، لیکن حقیقت میں یہاں پر مخصوص ان بدعات وتحریفات کی طرف اشارہ ہے جو بیت اللہ اور مناسک حج سے متعلق تھیں۔ اس لئے کہ جس سورہ میں یہ آیت وارد ہے اس میں بیت اللہ اور حج ہی کا بیان ہے۔ چنانچہ اس میں تعمیر کعبہ کے مقاصد اور حج کے متعلق صحیح احکام ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ ان کفار نے ان مقاصد احکام کو بالکل ضائع کر دیا اس لئے وہ خائن اور ناشکرگذار ہیں اور اس قابل نہیں کہ یہ مرکز حق ان کے ہاتھوں میں رہے یہی لوگ ہیں جنکو قرآن نے شیاطین کا خطاب دیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ یہود کو بھی شریک کر لیا ہے، اس لئے کہ وہ اس بعثت کے روز اول ہی سے اس کے دشمن تھے اور ہمیشہ کفار ہی کی تائید کرتے تھے۔ ایک جگہ ان سے متعلق فرمایا ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ	کیا تم نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جنہیں آسمانی کتاب کا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ	ایک حصہ عطا کیا گیا ہے کہ وہ جبت اور طاغوت پر ایمان
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	لاتے ہیں اور کفار کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے
اٰمَنُوْا سَبِيْلًا	تو یہی لوگ زیادہ روبراہ ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے وہ تمام باتیں ایک ایک کرکے بدل ڈالی تھیں جن میں اس بعثت کی پیشنگوئی تھی۔ ان کی تحریفات اور کتمان حق کی داستانیں سورہ بقرہ میں نہایت تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ اس تاویل کے اختیار کرنے کے چند وجوہ ہیں۔

(۱) اس تاویل میں الفاظ کو غیر معروف معنی میں لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جیساکہ عموماً مفسرین نے کیا ہے کہ بعضوں نے تمنی کے معنی تلاوت کے لئے ہیں اور نسخ کو ازالہ موانع کے مفہوم میں لیا ہے۔ حالانکہ اصول یہ ہونا چاہیے کہ جب تک معروف معنی بن سکیں غیر معروف معنی نہ اختیار کئے جائیں۔ خصوصاً کتاب الٰہی کی تاویل و تفسیر میں غیر معروف معنی لینا تو کسی طرح جائز نہیں۔ قرآن مجید میں کوئی مجبوری نہیں ہے۔

وہ فصیح ترین زبان میں اترا ہے اسلئے اسکے تمام الفاظ اپنے مواقع کے لئے نہایت فصیح اور مناسب ہیں۔

۲۔ ان آیات کے مشابہ سورہ انعام کی بعض آیات ہیں جن میں مجادلین عرب اور ان کی بدعات کا بیان ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہاں اُن بدعتوں کا ذکر ہے جو حرام و حلال سے متعلق تھیں اور یہاں ان بدعتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا تعلق بیت اللہ سے تھا۔

وہ آیات یہ ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ	اور اس طرح ہم نے ہر نبی کیلئے انسانوں اور جنوں میں سے
الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ	شیطانوں کو دشمن ٹھیرایا جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے
زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ	تاکہ لوگوں کو فریب دیں تو اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو یقیناً وہ ایسی
مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ وَلِتَصْغَىٰ	نہ کرتے تو انھیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو (اے پیغمبر کہدو)
إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ	کہ کیا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو حکم ڈھونڈوں حالانکہ
وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ	وہی ہے جس نے تم پر کتاب (قرآن) نازل فرمائی۔
أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ	جس میں (ہر طرح کی) تفصیل موجود ہے اور جن لوگوں
إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ	کو ہم نے کتاب دی (مومنین اہل کتاب) وہ اچھی طرح جانتے
الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ	ہیں کہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے سچائی کے ساتھ نازل
بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ	ہوا پس ان لوگوں میں نہ جاؤ جو شک کرنیوالے ہیں۔

ان آیات کے اندر چند باتوں کا ذکر ہے۔

۱۔ انسانوں اور جنوں دونوں میں شیاطین ہیں جو ہر نبی کے دشمن ہوتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگوں کو بہکانے کے لئے اپنی طرف سے افترا پردازیاں کرتے ہیں۔

۳۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور دنیا کی ظاہری نمائش پر مرتے ہیں وہ ان کے فریب میں

ں اس لئے کہ وہ ان باتوں میں اپنی ہوائے نفس کی بوبا تے ہیں۔

خدا نے قرآن مجید نازل فرماکر تمام احکام مفصل بیان فرما دئے۔

جو لوگ اہل کتاب میں سے مومن ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اللہ کی طرف

۷۔ وہ ان مزخرفین کے فریب میں نہیں آتے۔

ئیر میں فرمایا کہ مشرکین حرام و حلال کے بارے میں محض اپنے اوہام کی پیر وی کرتے ہیں۔

براہیم کی تعلیم یہ نہ تھی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ آیات عام مفہوم میں ہیں۔ اس لئے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے

ی آیات سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ ان کا تعلق تحریم و تحلیل ہی سے ہے۔

) جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ان آیات کے اندر بعض ایسے الفاظ و کلمات ہیں جو اس تاویل کے اختیا

ور کرتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ کلمات یا اس کے مشابہ الفاظ استعمال ہوئے

) مواقع پر زیادہ تر کفار کے اعتراض و جواب اور ان کی تحریفات وغیرہ کا بیان ہے اس کو مثالوں

چاہئے۔

الشَّیْطَانُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ	شیطان نے اس کی تمنا (حق) کے اندر باطل، ملادیا۔

سورہ انعام کی آیت ۱۱۲ میں ہے۔

کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ	اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو دشمن ٹھیرادیا۔

پھر آیت ۱۲۱ میں ہے

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِہِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ	بلاشبہ شیاطین اپنے یاروں کو سکھاتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلہ کریں۔

آیت ۱۲۴ میں ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا — اور ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں اس کے مجرموں کے سرغنہ بنائے

لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا — تاکہ [illegible] کی چالیں چلیں۔

دوسری جگہ خود سورہ حج کے شروع میں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ — اور بعض ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں بے جانے بوجھے جھگڑتے

وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ — اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔

ان تمام آیات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطین سے مراد قوم کے وہ سرغنہ ہیں جو ان کو صحیح

راہ سے پھیرتے رہتے ہیں۔

(۲) وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ — اور تاکہ وہ لوگ جنہیں علم عطا کیا گیا ہے یہ جان لیں کہ (قرآن)

رَّبِّكَ — [illegible] تیرے رب کی جانب سے ہے۔

اس موقع پر قرآن کو حق اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس نے ہر قوم کو صحیح تعلیم پیش کر دی۔

سورہ انعام میں بھی بالکل یہی صورت ہے۔ چنانچہ وہاں بھی قریب قریب یہی الفاظ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ — اور جن کو ہم نے کتاب دی وہ جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) تیرے

مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ — رب کی طرف سے حق نازل کیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ — یقیناً جنکو کتاب دی گئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ (قرآن)

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ — حق ہے انکے رب کی جانب سے۔

یہاں پر قرآن کو حق اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس نے قبلہ کے متعلق حق ظاہر کر دیا جسے یہود نے

چھپایا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا — جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اس (حق) کو اسی طرح جانتے ہیں

يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۤءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ — جس طرح اپنے لڑکوں کو پہچانتے ہیں، اور البتہ ان میں سے

لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ — ایک جماعت حق کو جانتے ہوئے بھی چھپاتی ہے۔

(۳) وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ — برابر کافر اس پر شک کرتے رہیں گے۔

سورہ بقرہ میں قبلہ کے متعلق جہاں ہے وہیں پر ہے۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ — تو تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

سورہ انعام کی آیت ۱۱۵ میں ہے۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ — تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — بیشک خدا اہل ایمان کو سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

سورہ بقرہ میں قبلہ کے بیان کے موقع پر ہے۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — خدا جسکو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

اس قسم کی مثالیں اگر تلاش کی جائیں تو اور مل سکتی ہیں مگر مسئلہ کے سمجھ لینے کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

فاران کا دور جدید

موعظت حسنہ

پاداش عمل[1]

جو بوؤگے وہ کاٹوگے — اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

از مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی

کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں، خدا کی طرف سے "قانون مجازات" نافذ ہے۔ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا جس طرح پر انجام دیا جائیگا، اسی طرح کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ اعمال سے ان کے لازمی نتائج کا انفکاک ناممکن ہے۔ یہ خدا کی سنت ہے جسمیں رد و بدل نہیں ہو سکتا، لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

سنکھیا قاتل ہے، جو بھی اسے کھانے کی جرأت کرے گا، اس کا نتیجہ یقیناً ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوگا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ سنکھیا کھائی جائے، اور اس کا اثر نہ پیدا ہو۔ پانی پیاس کو بجھاتا ہے جو بھی اس کو پئے گا، اس کی پیاس بجھے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ پانی پینے کے بعد تشنگی اور بڑھ جائے۔ اللہ تعالےٰ نے اشیاء میں جو خواص و تاثیرات رکھی ہیں، ضرور ہے کہ انھیں جو بھی استعمال کرے، ان کے اثرات پیدا ہو کر رہیں۔ خدا کا بنایا ہوا قانون دائمی ہے۔ اس لئے اگر کل سنکھیا قاتل تھی تو آج بھی قاتل ہے اور ہمیشہ قاتل رہے گی۔ زمانوں کے بدلنے سے تاثیرات نہیں بدلا کرتیں۔

جس طرح مادیات میں اثر و موثر کا سلسلہ جاری ہے۔ بالکل اسی طرح اعمال کی دنیا میں بھی اسی قانون کی حکومت ہے۔ کچھ اعمال ہیں جنکو کیجئے تو ہدایت و سعادت نصیب ہوتی ہے اور کچھ

---

[1] اس مضمون میں علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ کے بعض مقالات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے (بدرالدین اصلاحی)

اعمال ہیں جنکو کیجئے تو ضلالت و شقاوت ملتی ہے۔ اچھے اعمال کیجئے تو اس کا نتیجہ ہدایت کی شکل میں رونما ہوگا۔ اور برے کام کیجئے تو اس کی پاداش ضلالت کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ خدا کا یہ عادلانہ قانون ہے جس پر دنیا و آخرت دونوں جہاں کی حکومت قائم ہے۔

کانٹے بو کر، انگور توڑنے کی تمنا کرنی، ہوس ہے۔ اس سے کانٹے کے سوا کچھ اور نہ ملے گا، انگور تو انگور ہی کے درخت سے توڑے جا سکتے ہیں، جس نے انگور کا باغ لگایا ہو، وہ البتہ اپنے۔ امن انگور سے بھر سکتا ہے۔ کیونکہ جو بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے۔ ہم لاکھ چاہیں، ہمارے چاہنے سے خدا کی یہ سنت بدل نہیں سکتی۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ	نہ تمہاری آرزو پر، نہ اہل کتاب کی آرزو پر جو کوئی
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	(بھی) برا (کام) کریگا اس کی سزا پائے گا۔ اور اللہ
وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ	کے سوا نہ پائیگا اپنا حمایتی نہ مددگار۔ اور جو نیک
مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ	عمل کرے گا۔ مرد ہو یا عورت اور ایمان (بھی) رکھتا ہو
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا	سو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا حق
(سورہ نساء)	تل بھر (بھی) باقی نہ رہے گا۔

برے کاموں کا برا بدلہ اور اچھے کاموں کا نیک ثمرہ بھرپور مل کر رہے گا۔ اس لئے کہ یہ ہمارے اعمال ہیں، اور جب اعمال ہیں تو ضروری ہے کہ جیسے کچھ اعمال ہوں، ویسا ہی نتیجہ بھی نکلے۔ اپنی کھیتی میں ہم جو بیج ڈالیں گے۔ اسی کا پھل ہم کو ملے گا۔ جَو بو کر گیہوں کاٹتے کسی کو نہ دیکھا ہوگا؟ پھر ایسا کیوں ہو کہ برائیوں کا بدلہ، برائی اور بھلائیوں کا ثمرہ نیکی نہ ملے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ	جس نے اچھے کام کئے، تو اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ اور
مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ جَآءَ	ان کو اس دن گھبراہٹ سے چین ہے۔ اور جس نے

بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

برے کام کئے، تو ان کے منہ آگ میں اوندھے ڈالے ہیں۔ وہی بدلہ پاؤگے جو کرتے تھے۔

دنیا و آخرت، دونوں جہان کے لئے اعمال کے قانون بنا دیئے گئے ہیں جس طرح کے عمل کرتے جاؤگے، ٹھیک اسی طرح کے نتائج پیدا ہوتے جائیں گے۔ اگر تم نیک اعمال کرتے ہو تو تمہارے لئے دونوں جہان کی خوشحالی ہے اور اگر برے اعمال کرتے ہو تو دونوں جہان کی رسوائی! تم اپنے اندر جس قسم کی تبدیلی پیدا کروگے، خدا بھی اسی قسم کا نتیجہ پیدا کر دے گا۔ جب تک تم کروٹ بدلنی نہ چاہوگے تمہاری کروٹ نہ بدلی جائے گی۔ لیکن جب تم نے خود ہی رخ بدل دیا تو اب کیوں نہ پاداش میں تمہاری حالت بھی بدل دی جائے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُوْنِهِ مِنْ وَّالٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (سورہ رعد)

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے جب تک کہ وہ خود ہی اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے اور (پھر) جب اللہ چاہتا ہے کسی گروہ کو اس کی پاداش میں مصیبت پہنچے تو مصیبت ہو کر ہی رہتی ہے وہ، کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اس کا کارساز ہو۔

جب کوئی قوم اپنی حالت کو بدل دیتی ہے اور بھلائی کی راہ سے ہٹ جاتی ہے تو خدا بھی پاداش عمل میں اس کی حالت کو بدل دیتا ہے۔ پوری کائنات اگر ان نتائج اعمال کے ظہور کو روکنا چاہے تو کسی تدبیر سے نہیں روک سکتی۔

گذشتہ اقوام و ملل کی تاریخ پر ایک نظر ڈالو۔ وہ لوگ جنکی دولت و اقبال کا ستارہ اوج ثریا پر تھا، جن کی فرمانروائی کا پرچم دنیا کے چپہ چپہ پر لہرا رہا تھا، جن کی قوتیں بے پناہ تھیں جن کی دولتوں کا کوئی شمار نہ تھا، جب برائیوں کی طرف مائل ہوئے اور حق کو چھوڑ کر باطل کی طرف جھک گئے۔ تو نتائج

اعمال کے عالمگیر قانون کی زد سے وہ نہ بچ سکے چشم زدن میں ان کا سارا ٹھاٹ جاتا رہا، اور وہ حرف غلط کے مانند صفحہ ہستی سے مٹادیے گئے، اس لئے کہ انھوں نے جو روش اختیار کی، خدا نے اس میں بھی اثر رکھا ہے کہ وہ اپنے چاہنے والے کو مٹادے پس جو بھی یہ روش اختیار کرے گا۔ وہ یقیناً مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کا یہ مٹنا، خود اپنی کرتوتوں کا نتیجہ ہوگا۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ	کیا پھرے نہیں ملک میں؟ جو دیکھیں آخر کیا ہوا (حال) ان
عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کَانُوْا اَشَدَّ مِنْهُمْ	اگلوں کا: (جو) ان سے زیادہ تھے زور میں، اور (جنھوں نے)
قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا اَکْثَرَ مِمَّا	زمین اٹھائی اور بسائی ان کے بسانے سے زیادہ اور ان کے
عَمَرُوْهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ	پاس ان کے رسول کھلا حکم لیکر پہنچے۔ اور اللہ ان پر ظلم کرنیوالا
فَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَهُمْ	نہ تھا لیکن وہ آپ اپنا برا کرتے تھے۔ . . . . . .
یَظْلِمُوْنَ (سورہ روم)	. . . .

یہ خدا کا قانون ہے۔ اس کی میزان عدل میں فرماں روا اور غریب و بے نوا، دونوں برابر ہیں۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کے مطابق پورا بدلہ ملتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ سنکھیا کا کوئی ٹکڑا کسی بادشاہ کے حق میں زندگی بنجائے اور برف کا گلاس کسی غریب کے لئے زہر ہلاہل ہو جائے۔ خدا کی عدالت میں دونوں برابر ہیں سنکھیا کی تیزی دونوں کے لئے یکساں قاتل ہے اور برف کی ٹھنڈک دونوں کیلئے یکساں حیات افروز۔ خدا، اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا، بندے خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، خدا کی ذات اس اتہام سے پاک ہے۔ تعالی اللہ عما یصفون۔ وہ رحیم ہے، اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے، حکیم ہے، جو کچھ کرتا ہے، وہ حکمت سے خالی نہیں۔ عادل ہے، بندوں کے اعمال کو میزان عدل میں پورا پورا تول دیتا ہے وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْراً۔

خدا نے اگر کسی کو اونچا کیا اور عزت بخشی تو اس کے اعمال خیر کی پاداش میں! اور اگر کسی کو گھٹایا اور

ذلت دی تو اس کے اعمال بد کی جزا ہیں:

اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ

سو جو یقین لائے اور بھلے کام کئے تو ان کے لئے رہنے کے باغ ہیں، ان کے اعمال کی مہمانی میں اور جو بے حکم ہوئے ان کا ٹھکانا آگ ہے۔ اس میں سے جب نکلنا چاہیں گے تو اسی میں پھر لوٹا دئے جائیں گے اور کہا جائے گا ان سے چکھو آگ کی مار، جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

خدا کا قانون مجازات عام ہے۔ آخرت کی کھیتی میں بیج ڈالو گے تو اس کا بھی پھل پاؤ گے اور اگر صرف دنیا ہی کی کھیتی میں بوؤ گے تو اس کی پیداوار سے بھی محروم نہ رہو گے۔ تم جس گوشہ میں بھی کوئی عمل کرو گے۔ اس کا نتیجہ ضرور تمہارے سامنے آئے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ

جو چاہتا ہے آخرت کی کھیتی بڑھا دیں گے ہم اسکو اسکی کھیتی اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی، اس کو ہم دیں گے کچھ اس میں سے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

پاداش عمل حق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ برائیاں کرو گے مصیبتیں نازل ہوں گی، بھلائیاں کرو گے، دونوں جہان میں خوشحال رہو گے۔ مصائب کا نزول انسانی اعمال کا نتیجہ ہے،

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (سورہ شوریٰ)

اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو بدلا ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے اور (وہ) معاف کرتا ہے بہت۔

اور دونوں جہان کی پر لطف زندگی کا حصول بھی اپنے ہی اعمال پر موقوف ہے۔ ایمان لاؤ۔ اچھے اچھے کام کرو، دارین کی سعادت تمہارے لئے ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سورہ نحل)

جس کسی نے اچھا کام کیا خواہ مرد ہو خواہ عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو (یاد رکھو) ہم ضرور اسے (دنیا میں) اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے ان بہتر اعمال کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔

غرض یہ کہ سب کچھ تمھارے بس میں ہے۔ ہدایت کی راہ چلو، ہدایت پاؤ گے۔ ضلالت کی طرف جھکو گمراہی میں پڑو گے۔ سعادت و شقاوت کی دونوں راہیں باز ہیں، جو راہ اختیار کرو گے اسی کی منزل سامنے آئیگی۔ ترکستان کی راہ پر چلنے والا حجاز نہیں پہونچے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

جو ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کریگا وہ (اس کی جزا) پائیگا اور جو ایک ذرہ کے برابر بھی برائی کریگا وہ (اس کی سزا) پائے گا۔

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ تقوی اختیار کرو گے تو تم پر ہدایت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

یہ آسمانی کتاب ہے اس میں کچھ شک نہیں، ڈر والوں کو راہ بتاتی ہے۔ جو بن دیکھے یقین کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

اور فسق میں مبتلا ہو گے تو ضلالت کا طوفان تم کو بہالے جائے گا۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

اس سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو راہ پر لاتا ہے۔ اور انہی کو گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں جو اللہ کا اقرار مضبوط کیے پیچھے توڑ دیتے ہیں اور (اسکو) توڑتے ہیں جسکو اللہ نے جوڑنا فرمایا۔ اور ملک میں فساد کرتے ہیں۔ وہی لوگ گھاٹے میں ہیں۔

ان آیتوں کے نظم و ترتیب پر غور کرو، فلسفہ پاداش عمل کی اصل حقیقت بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آجائیگی۔

متقیوں کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایمان بالغیب (۲) اقامت صلوٰۃ (۳) انفاق فی سبیل اللہ۔ یعنی جن میں یہ صفتیں ہیں، وہ متقی ہیں اور انہی کے لئے ہدایت ہے۔

اسی طرح فاسقوں کی بھی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) نقض عہد (۲) قطع تعلق (۳) افساد فی الارض۔ یعنی جن میں یہ صفتیں ہیں وہ فاسق ہیں اور یہی گمراہ ہوتے ہیں۔

اب ترتیب کے ساتھ متقیوں اور فاسقوں کی ایک ایک صفت کا موازنہ کرو، تمہیں صاف نظر آئیگا کہ ان کی ہر صفت، ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئی ہے۔ جب اعمال میں اختلاف ہے تو ضروری ہوا کہ نتائج بھی مختلف پیدا ہوں چنانچہ ایک کو اس کے اعمال صالحہ کے نتیجہ نے تقویٰ کی دولت سے سرفراز فرمادیا اور دوسرے کو اس کے اعمال سیئہ کے نتیجہ نے فسق کی ذلت سے پامال کر دیا متقی کے زینہ کا رخ اوپر تھا۔ اس لئے وہ آسمان ہدایت پر جا پہنچا، اور فاسق کی سیڑھی نیچے کی طرف تھی۔ اس لئے وہ ضلالت کی خندق میں چلا گیا۔ اور دونوں نے اپنے اپنے کئے کا ٹھیک ٹھیک بدلا پایا۔ جزاءً بما کانوا یعملون۔

جن لوگوں کی نگاہ عدل و حکمت پر نہیں ہے۔ وہ اس قانون پاداش کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس قانون کو غیر ضروری سمجھنا، خدا کے اسماء و صفات کی اصل حقیقت سے بےخبری کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا علم نہایت ضروری ہے۔ یہی وہ حقایق ہیں۔ جو معرفت رب کی تجلی گاہ ہیں۔ ان کو جانے بغیر اللہ کی صحیح پہچان نہیں ہو سکتی، یہ موقع، اس بحث کی تفصیل میں پڑنے کا نہیں ہے اس لئے اسکو ہم کسی فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے اس اہم نکتہ کو فراموش کر دیا، انھوں نے صرف مشیئت کو پیش نظر رکھکر بہت سی ایسی باتیں کہہ دیں جن سے خالق و مخلوق کے رشتہ محبت میں بہت سی گرہیں پڑ گئیں۔

ان لوگوں کے نزدیک جائز ہے کہ خدا، یونہی بلاوجہ ایک پارسا کو مسجد سے بت خانہ میں پہنچا دے، ایک موحد کو مشرک بنا دے، ایک ذاکر کے وظیفہ اللہ اللہ کو مشغلہ چنگ و رباب سے بدل دے فرمانبردار بندوں کو جہنم میں جھونک دے اور نافرمانوں کو نعیم جنت سے سرفراز فرما دے۔ گویا خدا کا نہ کوئی اصول ہے نہ نظام۔

خدا کی مشیت سے انکار نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک عادل اور حکیم خدا کو بے اصول اور بے ضابطہ ثابت کر کے اس کے بندوں کے دلوں میں انابت و رجوع اور یقین واذعان کی کونسی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے؟ اس سے تو یاس و قنوط کی پرورش ہوگی اور آگے بڑھنے کے سارے حوصلے سرد ہو جائیں گے۔ جب حال یہ ہو کہ سب کچھ کرو لیکن آخر میں یونہی بلاوجہ ایمان کو کفر، توحید کو شرک، طاعت کو معصیت، اور نیکی کو بدی بنا دیا جا سکتا ہے اور جنت کے بدلے جہنم میں ڈال دئے جا سکتے ہو تو کون ہے جس میں شریعت کی راہوں کو طے کرنے کا شوق پیدا ہو سکے۔

اللہ کی تمام کتابوں اور اس کے تمام پیغمبروں کی تعلیمات اس عقیدہ کے خلاف ہیں خصوصاً قرآن مجید نے تو (جیسا اوپر گذر چکا) نہایت تفصیل کے ساتھ یہ حقیقت بار بار دہرائی ہے کہ جو جیسا کرتا ہے، ہم اس کو ویسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ نیک کاموں کا اچھا نتیجہ ہے۔ اور بد کاموں کا برا! ہمارے حضور میں کسی پہ ظلم نہیں کیا جائیگا۔ بھلائی اور برائی کے ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا، ہر شخص کی کمائی ہوگی جو اس کے سامنے آئے گی۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا

جس نے اچھے کام کئے تو اس کو اس سے بہتر ملے گا۔ اور جس نے برے کام کئے تو بدکاروں کو وہی دیا جائیگا

السَّیِّاٰتِ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ جو وہ کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عزت بخشتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے تو ایسا محض مشیئت ہی سے نہیں کرتا، بلکہ حکمت و عدل کی بنا پر بھی کرتا ہے۔ اور یہی حکمت و عدل، قانون پاداش کے مرکز ہیں۔ نوح علیہ السلام نے اپنے لڑکے کی نجات کے متعلق جب خدا سے عرض کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ نہیں اسکو نجات نہیں مل سکتی، وہ اپنے اعمال بد کی پاداش میں غرق کیا جائیگا۔ یہ نہیں فرمایا کہ میں محض اپنی مشیئت سے بلا کسی وجہ کے یونہی غرق کروں گا۔ بلکہ اعمال بد کو اسکی علت قرار دیا۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (سورہ ہود)

نوح نے اپنے پروردگار سے دعا کی اور کہا خدایا! میرا بیٹا تو میرے گھر کے لوگوں میں سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے بہترین فیصلہ کرنیوالا ہے (خدانے) فرمایا: اے نوح وہ تیرے گھر کے لوگوں میں سے نہیں ہے وہ تو (سراپا) عمل بد ہے پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارہ میں سوال نہ کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہو جانا۔

اسی طرح کوئی معلول ایسا نہیں ہے جس کا دامن کسی علت سے وابستہ نہ کیا گیا ہو۔ کافروں کے دلوں پر جو زنگ چھا جاتا ہے اور جسکی وجہ سے ان کیلئے ہدایت کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں، اسے بھی اعمال ہی کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ

جدھر بھی دیکھو، جہانتک اپنی نگاہوں کو پھیلا سکتے ہو پھیلا کر دیکھو، ہر جگہ پاداش عمل کے قانون کی حکومت دکھائی دیگی، یہاں ہر گوشہ میں علت کیساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے۔ جیسا عمل کروگے، اللہ تعالیٰ ویسا ہی نتیجہ بھی مرحمت فرمائیں گے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (انعام)

جو نیکی لایا، اسکو اسکا دس گنا ہے اور جو برائی لایا سو سزا پائیگا تو اتنی ہی اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

ادبیات

استاذ امام کی ایک غیر مطبوعہ غزل

نیپال کے شاہی خاندان کے کوئی رکن الہ باد میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ فارسی میں شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے۔ اور شادی تخلص کرتے تھے۔ اس تقریب سے مولاناؒ سے راہ و رسم ہوئی۔ مولاناؒ نے یہ غزل ان کی فرمائش سے لکھی (الاصلاح)

بہار خرمی در گلشن گیہاں نمی بینم
کہ بی صد خار غم اینجا گلے خنداں نمی بینم

نروید لالۂ کش داغ حسرت بر جگر نبود
نخیزد نرگسے کش دیدۂ حیراں نمی بینم

ز نکہت غنچہ را جز آہ بر لب می نیندیشم
ز شبنم سبزہ را جز اشک بر مژگاں نمی بینم

ندانم سرو را جز تیر آہے از زمیں جستہ
بجز دود دلش ایں سنبل و ریحاں نمی بینم

بگیتی ہر شب و روزے ہمی آید بپایانے
مگر شبہائے درد و رنج را پایاں نمی بینم

بہر یک سینہ صد زخم است و یک مرہم نمی یابم
بہر یک گوشہ صد رنجور و یک درماں نمی بینم

چہ دوزی چشم بر گردوں کہ بنیادش بود واروں
کہ من از راستی نقشے دریں ایواں نمی بینم

چہ رنج است آنکہ اندر گنج او پیدا نمی یابم
چہ نیش است آنکہ اندر نوش او پنہاں نمی بینم

بپیمانش چہ دلبندی بعہد او چہ خرسندی
کہ گردوں را سر یک عہد و یک پیماں نمی بینم

متاع خوشدلی از خانۂ گیتی بروں باشد
کہ اینجا از پی آرام دل ساماں نمی بینم

ز رنگ و بوی گلزار جہاں دل شاد کی گردد
پی شادی رہے جز طاعت یزداں نمی بینم

نذر خصائص

مدرسۃ الاصلاح

(حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ اگست کے معارف میں تحریر فرماتے ہیں:-

اعظم گڈھ میں بمقام سرائے میر، عربی کا ایک جدید طرز کا مدرسہ (علامہ شبلی مرحوم کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق) مدرسۃ الاصلاح کے نام سے پچیس چھبیس برس سے قائم ہے۔ اس کے ناظم مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ مولانا حمید الدین صاحب نے مراجعت وطن کے بعد اپنی بقیہ زندگی اسی مدرسہ کی علمی و تعلیمی رہبری میں صرف فرمائی (اسی کے خاطر انھوں نے ہزار روپئے ماہوار کی نوکری چھوڑی، گھر بار چھوڑا، مدرسہ ہی میں بود و باش اختیار کی اور وہاں کے طلبہ و مدرسین کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا اور اپنی ساری متاع علمی مدرسہ کے چند ہونہار طلبہ کے سپرد کر دی۔

اس مدرسہ کا مقصد یہ ہے کہ عربی صرف و نحو کی دقتوں کو کم کر کے عربی علوم کو قرآن پاک کا خادم سمجھکر سکھایا جائے، اور فلسفہ و منطق کی دور از کار کتابوں کو بہت کم کر دیا جائے، مدرسہ کا کاروان عمل شروع سے آج تک اس راہ پر چل رہا ہے اور اچھے نتیجے پیدا کر رہا ہے، اس میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ، بے غرض اور مخلص علماء ہیں۔ جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور کچھ خود اسی مدرسہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ مدح و ستائش نہیں، واقعہ ہے کہ ان مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گذر کر کے اور سالہا سال تنخواہ نہ پاکر اس اخلاص و ایثار کے ساتھ کام کیا ہے اور اب تک کر رہے ہیں کہ ہمارے موجودہ قومیات

میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

رسالہ فاران (بجنور) اپنی اگست کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

..... ضلع اعظم گڑھ کے ایک نہایت غیر معروف مقام سرائے میر میں ایک مشہور مدرسہ ہے جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے۔ یہ مدرسہ ایک چھوٹی جگہ میں واقع ہونے اور اپنے کارکنوں کی شہرت پسندی سے متنفر ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں وہ شہرت حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس مدرسہ کی تعلیم و تربیت اور اس کے اساتذہ کی محنت و ایثار اور خلوص وغیرہ کا حال معلوم ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مدرسہ اپنی گوناں گوں خصوصیات کے اعتبار سے تمام اسلامی درسگاہوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اس مدرسہ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جنکی نظیر کسی اور اسلامی درسگاہ میں نہیں ملتی مثلاً (۱) اس میں کتاب الٰہی کی محققانہ تعلیم کا بہترین انتظام کیا گیا ہے اور یہ بات ہندوستان کی کسی درسگاہ میں نہیں۔ اس مدرسہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے مدتوں ایک ایسے جلیل القدر انسان کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا جو علم و عمل کے اعتبار سے یگانہ تھا، جس کے دن رات کے غور و فکر کا مرکز صرف قرآن حکیم تھا۔ اور جو تمام دنیائے اسلام کے متفقہ فیصلہ کے مطابق اس آخری صدی میں، قرآن فہمی میں سب کا امام تھا، یعنی مولانا حمید الدین فراہیؒ۔ اس جلیل القدر امام نے اپنی زندگی کا آخری حصہ، دنیاوی بلند منصب و اعزاز سے بے نیاز ہو کر گمنامی کے ساتھ اسی مدرسہ کی چہار دیواری میں گذارا ہے اور آخر دم تک اپنے علم و معرفت سے یہاں کے طلبہ و اساتذہ کو سیراب کرتے رہے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اپنی تحقیقات کا، جس کا بیشتر حصہ قرآنی معارف سے متعلق ہے۔ ایک وافر ذخیرہ اسی مدرسہ کی امانت میں چھوڑ گئے ہیں اور جس کا ایک ایک صفحہ اہل علم کے لئے بڑے بڑے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

(۲) اس مدرسہ نے عربی تعلیم کے لئے ایسے سادہ اور سہل اصول جاری کئے ہیں کہ اس

راہ کی تمام دشواریاں دور ہوگئی ہیں۔ اور کم سے کم مدت میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی نہایت سیدھی اور صاف راہ کھل گئی ہے۔

۳۔ اس نے ملک کے افلاس کو دیکھتے ہوئے تعلیم کے نرخ کو انتہائی حد تک ارزاں کیا ہے چنانچہ یہ بات مدرسۃ الاصلاح ہی کے لئے مخصوص ہے کہ وہاں کم سے کم خرچ میں بہتر سے بہتر تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

۴۔ اس مدرسہ میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ انگریزی، ریاضی اور بعض مفید صنعتیں مثلاً جلد بنانا، جوتہ بنانا بھی سکھائی جاتی ہیں تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا کسی معاش میں فوراً لگ سکیں۔

انھیں خصوصیات کے ساتھ یہ مدرسہ ایک مدت سے اسلام کی اور مسلمانوں کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اوپر جو خصوصیات مذکور ہوئی ہیں ان میں سے ہر خصوصیت ایسی ہے کہ اگر وہ کسی مدرسہ کو حاصل ہو تو وہ اسکی شہرت کے لئے کافی ہے مگر مدرسۃ الاصلاح ان تمام خصوصیات کے باوجود اب تک گمنام ہے۔

مدینہ مجریہ ۹ جولائی کی اشاعت میں رقمطراز ہے:۔

مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ مسلمانوں کی ایک ممتاز کامیاب اور اہم درسگاہ ہے۔ یہاں کے علما روشن ضمیر ہیں، صاحب فکر ہیں، متدین ہیں۔ دین حنیف کے خادم اور مسلمانوں کے درد مند ہیں۔ یہاں جو اساتذہ ہیں وہ اپنی نظر تحقیق، خدمت قرآن اور اپنے کمال علمی کا ایک خاص معیار رکھتے ہیں۔ یہاں کے ارباب انتظام اپنے عزائم و اعمال میں اتنے مخلص ہیں کہ آج سے نہیں بلکہ سالہا سال سے نمود و نمائش اور ریاکاری کے ہنگاموں سے دور اپنی دنیائے عمل میں سکوت و سکون کے ساتھ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس درسگاہ کے طلبہ بھی عام عربی درسگاہوں کے طلبہ کے مقابلہ میں اصلاح پسند اور ترقی پذیر ہیں اور علم و تحقیق سے مناسبت رکھتے ہیں اور ابتدا ہی سے ایسے ماحول میں علم حاصل کرتے ہیں کہ

ان کے دلی رجحانات بجائے خود اسلامی خدمت کیطرف مائل ہوتے جاتے ہیں ابھی چند دن کی بات ہے کہ اسی درسگاہ کے بعض ارباب علم نے کلام الٰہی کے حقائق و حکم کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ قائم کیا۔ دائرہ کا ترجمان الاصلاح شائع ہوا اور وہ پیش نظر مقصد کے لئے اصلاحی رنگ میں مسلمانوں کی خدمت کرنے لگا۔

جمعیۃ العلماء (دہلی) کا ترجمان الجمعیۃ لکھتا ہے:۔

..... مرحوم (علامہ فراہیؒ) نے اپنی زندگی میں ضلع اعظم گڈھ کے ایک مشہور و معروف اور دور افتادہ سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں ایسے علماء پیدا کئے جائیں جو قرآن حکیم کی حکمت اور روح کو بیکر باہر نکلیں اور قرآن کریم کے لائحہ عمل کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بنائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مرحوم اپنے مقصد میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور اس مدرسہ کی بدولت ایسے روشن خیال اور مفکر علماء پیدا ہو گئے جن کی زندگی کا مقصد قرآن کی خدمت اور اس کے اسرار و حکم کی تبلیغ ہے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء اور کارپردازوں نے دائرہ حمیدیہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کی طرف سے ایک علمی و قرآنی ماہنامہ مجلہ الاصلاح جاری کیا۔ دائرہ حمیدیہ اور مجلہ الاصلاح کا مقصد بھی، قرآن کی تبلیغ، اسرار قرآن کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں میں قرآنی روح کی ترویج ہے

روزنامہ ملت (دہلی) لکھتا ہے:۔

..... مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) نہ صرف اعظم گڈھ بلکہ ہندوستان کی عزیز ترین درسگاہ ہے۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں جسقدر کارنامے انجام دئے ہیں اس کا اندازہ دائرہ حمیدیہ کی مطبوعات اور رسالہ الاصلاح کے مضامین سے کیا جاسکتا ہے۔

رسالہ اردو (حیدرآباد) جولائی کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

مولانائے مرحوم (مولانا حمید الدین فراہیؒ) قدیم طرز اور جدید طرز کے ہر دو مدارس سے غیر مطمئن تھے اس لئے انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی جس کا منشاء دینی اور معاشرتی اصلاح ہے۔ اس کی تعلیم کا نصاب بھی خاص ہے جس میں زیادہ تر قرآن کی تعلیم ہے اور اس کے ساتھ ہی بعض مفید پیشے اور ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہاں کے طلبہ اپنی معاش کمانے کے قابل ہو سکیں۔

تقریظ و تبصرہ

الجمعۃ والسنۃ:- مولفہ مولوی قاضی، حافظ شیخ محمد نعمت اللہ صاحب چشتی، قادری۔ حجم ۱۲۴ صفحات تقطیع متوسط، کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی۔ پتہ:- مولوی عثمان احمد صاحب۔ مقام بسو۔ پوسٹ ٹینا ریاست پالن پور۔

یہ کتاب مانعین جمعہ کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں فرضیت جمعہ، جائے اقامت نماز جمعہ، شرائط جمعہ، زبان خطبہ اور قریہ و مصر کے فرق پر تفصیل کے ساتھ بحث کیگئی ہے۔ تقریباً ہر مسئلہ کو قرآن و حدیث آثار صحابہ اور فقہاء کی پرزور رایوں کی روشنی میں دیانت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ہندوستان کے مختلف خیال و مسلک کے علماء کی رائیں بھی درج ہیں جس سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ امید ہے کہ بسو اور دیگر اضلاع کے مسلمان اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ افادۂ عام کے خیال سے کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی گئی ہے۔ محصول ڈاک کے لئے صرف ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر پتہ مذکورہ سے منگائی جاسکتی ہے۔

جدید خطبات جمعہ:- مولفہ خطیب رازی حجم ۴۶ صفحات تقطیع چھوٹی قیمت فی کاپی ۲ر سالانہ ۸ر پتہ:- سیرت کمیٹی، پٹی۔ لاہور۔

سیرت کمیٹی عرصہ سے دین و مذہب کی مفید تبلیغی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس کی طرف سے ہر سال لٹریچر، مختلف زبانوں میں، مفت کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ربیع الاول کے مبارک مہینہ میں ملک کے مختلف گوشوں میں تقریروں کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس سے مسلم اور غیر مسلم یکساں مستفید ہوتے ہیں۔

اس ... سیرت کمیٹی کے مخلص کارکنوں نے اردو زبان میں اصلاحی خطبات جمعہ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ خطبات مختلف عنوانات کے ماتحت سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ ان میں کسی جماعت ... کی مخالفت نہیں کی جاتی ہے بلکہ ہر جماعت ... عقیدہ و مسلک سے آزاد ہو کر اسلام کی تعلیم پیش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے موجودہ امراض بتا کر ان کے علاج سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اگر ان خطبات کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو ان سے مسلمانوں کی مذہبی معاشرتی ... اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ اور جمعہ کے قیام کا کھویا ہوا مقصد بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ائمہ مساجد اور ارباب خیر کو اس سلسلہ میں سیرت کمیٹی کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔

تحریک اتحاد اسلامی: مصنفہ مولانا سید کشفی شاہ نظامی رنگونی۔ حجم ... صفحے تقطیع چھوٹی کتابت و طباعت و کاغذ معمولی۔

مولانا کشفی ایک دردمند مسلمان ہیں۔ اپنے دل میں اسلام کی سچی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں مسلمانوں کی موجودہ بے بسی سیاسی تنزل، ان کی باہمی خانہ جنگیوں اور تکفیر بازیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے "اتحاد اسلامی" کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا ہے جس میں عالم اسلامی کے تمام مسلمانوں سے اتحاد باہمی اور وحدت ملی کی اپیل کی ہے۔ اس رسالہ میں مختلف عنوانات سے مسلمانوں کے لئے بہت سے پیغامات ہیں، لیکن سب کا منشا صرف یہ ہے کہ مسلمان باہم متحد ہو کر اپنی قوت محسوس کریں اور اسلام کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کی کوشش کریں۔ ... چالیس مسلمانوں کو پڑھ کر سنانے کے لئے ... مصنف سے مفت مل سکتا ہے۔

ہدیۂ اخلاص: مصنفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب اعظم گڑھی۔

حجم ۲۴ صفحات، تقطیع چھوٹی، کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ قیمت ۲ر

پتہ ملنے کا :- مولوی عبداللطیف صاحب اعظمی ۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ ۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب (اعظم گڈھ) ملک کے ایک ہونہار اور بلند فطرت شاعر ہیں۔ ان کی ذات اب تعارف سے مستغنی ہے۔ ان کی نظمیں ہندوستان سے گذر کر، دوسرے ممالک کے ادیبوں اور شاعروں سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ موصوف اپنے سامنے شاعری کا بلند مقصد اور اعلیٰ تخیل رکھتے ہیں اسی وجہ سے غزلوں سے زیادہ نظمیں لکھنے کے عادی ہیں۔ یہ نظمیں اکثر طویل اور مسلسل ہوتی ہیں جن میں شاعر کی طرف سے کوئی خاص پیام یا زندگی کا کوئی اہم فلسفہ ہوتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں صرف دو نظمیں ہیں لیکن کافی طویل ہیں۔ یہ نظمیں بارگاہ اقبال میں ہدیۂ اخلاص کے طور پر پیش کی گئی ہیں مگر ان میں صرف مدح سرائی یا اظہار عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ اقبال کی شاعری، ان کے لائحہ عمل، ان کے سیاسی رجحان، اور ان کے فلسفۂ حیات ملی پر نہایت لطیف انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسرار خودی اور رموز زندگی کی تفصیل کے ساتھ حکیمانہ تشریح بھی کی گئی ہے۔ جو لوگ اقبال کی شاعری اور ان کی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس مختصر مرقع میں علامہ اقبال کی زندگی کا ہر پہلو موجود ہے۔ امید ہے ارباب ذوق اس مجموعہ کی قدر کرینگے۔

طلوع اسلام :- اڈیٹر جناب سید نذیر نیازی صاحب بی۔ اے۔ تقطیع ۲۲×۲۰/۸ ۱۰۰ صفحات

قیمت سالانہ [illegible] ششماہی [illegible]

پتہ :- میکلوڈ روڈ ۔ لاہور ۔ نمبر ۲۵

پنجاب سے ہر سال کثیر تعداد میں رسائل نکلتے ہیں لیکن کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے سامنے کوئی بلند مقصد رکھتے ہوں۔ مقام مسرت ہے کہ پنجاب کی سرزمین سے "طلوع اسلام" ایک بلند مقصد لیکر طلوع ہوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب و سیاست عمرانیات و معاشیات میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرے۔ اور قومی زندگی کے ان جدید احوال و واردات کو مسلمانوں کے سامنے اسلام

کی روشنی میں پیش کرے۔ رسالہ کے مضامین زیادہ تر انہی عنوانات کے ماتحت لکھے جاتے ہیں۔ ایک حصہ رفتارِ سیاسیات سے بھی متعلق ہوتا ہے۔ سبق آموز افسانے بھی درج ہوتے ہیں کتابت و طباعت قابل اطمینان ہے۔ مضامین کی ترتیب و انتخاب پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

"چڑیوں کا گھونسلا"

رومیوں کا ایک وفد حضرت امیر معاویہ سے ملنے کیلئے دمشق آیا۔ وہ امیر معاویہ جو تمام رومی عظمت کے وارث تھے، جنھوں نے شام کو قیصر کی عظیم الشان اور متمدن حکومت سے چھین کر خلافت اسلامیہ کا دار السلطنت اور اس نئے دین کا مرکز بنایا تھا جسکی بے پناہ قوت نے قیصر و کسریٰ کی تمام عظمت پارہ پارہ کر ڈالی تھی۔

وفد نے دمشق پہنچکر دار الخلافت کا پتہ پوچھا، لوگوں نے پتہ بتایا، ارکان وفد کو نہایت تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا "یہ تو چڑیوں کا گھونسلا ہے"۔ حضرت امیر معاویہ نے سنا تو فوراً مکان کو منہدم کرا دیا۔ اور ایک نئی عمارت کی داغ بیل ڈالی اور ایسی پرشکوہ عمارت بنوائی کہ دیکھکر نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں:

اس کے بعد ہر آنیوالے نے اپنی ایک یادگار چھوڑی جو ایک ایک کرکے دست بردِ زمانہ کے نذر ہوگئیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ عبد العزیز بن مروان نے فسطاط میں عمر بن العاص کی جامع مسجد کے متصل ایک محل بنوایا اور اسکی وسعت و عظمت کیوجہ سے اسکا نام "مدینہ" رکھا اس کے تمام گنبدوں پر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے

جب بنی امیہ کا آخری خلیفہ مروان ابن محمد عباسی فوجوں کے خوف سے بھاگ کر مصر آیا تو پہلے فسطاط میں اقامت گزین ہوا لیکن خبر ملی کہ عباسی لشکر برابر اسکے تعاقب میں ہے۔ وہ دریائے نیل عبور کرکے جیزہ چلا گیا اور فسطاط کو جلا دینے اور قصر مدینہ کو ڈھا دینے کا حکم دیدیا ایک امیر نے ملامت کی کہ آپ عبد العزیز بن مروان کے اس محل کو منہدم کرتے ہیں جس کی تیاری میں پانی کیطرح روپیہ بہایا گیا ہے۔ مروان نے کہا "اسکا غم نہ کرو، اگر میں بچ گیا، تو اس کو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے دوبارہ تعمیر کرا دونگا"۔

(ع۔ر۔ ناصر)

جلد ۱ | ماہ رجب ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۲ - ۸

باب التفسیر

تفسیر سورۃ الکافرون	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۹ - ۱۷

معارف قرآن

تیسیر قرآن	امین احسن اصلاحی	۱۸ - ۳۲

موعظۂ حسنہ

نماز خیر دارین ہے	جناب مولانا ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب قادری	۳۳ - ۳۷

مقالات

دیباچہ سیرت شبلی	جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل	۳۸ - ۵۰

ادبیات

دعا	جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب اعظم گڑھ	۵۱ - ۵۲

تلخیصات

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ	ع - ن	۵۳ - ۶۱
تقریظ و تبصرہ	"	۶۲ - ۶۴

شذرات

مدرسۃ الاصلاح میں اکابر کا اجتماع

۲۵-۲۶-۲۷ شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۱-۱۲-۱۳ نومبر ۱۹۳۶ء کی تاریخیں مدرسۃ الاصلاح میں ایک عام اجتماع کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد نے اس اجتماع میں شرکت کا حتمی وعدہ فرمایا ہے حضرت مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند، حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار، حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند، حضرت مولانا ابو القاسم صاحب سیف بنارسی نے بھی دعوت شرکت منظور فرمائی ہے، بعض دیگر مشہور علما کی آمد کی بھی توقع ہے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ کی تشریف آوری، بعض اہم مشغولیتوں کی وجہ سے، ابھی مشتبہ ہے، لیکن امید ہے کہ انشاء اللہ وہ بھی شرکت فرمائیں گے۔

اعظم گڑھ کے مسلمان بائیس برس سے امام الہند کے لئے چشم براہ ہیں، اس لئے قدرتی طور پر انکی تشریف آوری کی خبر نے پورے ضلع میں ایک حرکت پیدا کر دی ہے۔ قریب کے دیہاتوں اور قصبوں نے تصدیق خبر کے لئے، لوگوں کے وفود آرہے ہیں۔ دور کے لوگ خطوط کے ذریعہ دریافت حال کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ان تاریخوں میں، مدرسہ کے وسیع میدان میں، جو اجتماع ہوگا، وہ اعظم گڑھ کی پوری تاریخ میں بے مثال ہوگا۔ مجلس استقبالیہ پوری سرگرمی سے انتظامات میں مشغول ہے۔ چھوٹے بڑے سب کے اندر ایک خاص جوش اور ولولہ عمل کارفرما ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اجتماع قوم اور مدرسہ کے لئے موجب خیر و برکت ہو۔

مئی ۳۶ء میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ علالت کی وجہ سے، شرکت نہ فرما سکے تھے۔ اور ان کی عدم موجودگی کو کارکنوں نے گوناگوں وجوہ سے محسوس کیا تھا، لیکن انشاء اللہ اس موقع پر وہ کارکنوں کی رہنمائی کے لئے موجود ہوں گے اور قوم ان کے مواعظ و نصائح سے مستفید ہوگی۔ مولانا مسعود علی صاحب ندوی اپنے قیمتی مشوروں سے منتظمین کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ مولوی عبدالعزیز صاحب ندوی پوری سرگرمی سے انتظامات میں مشغول ہیں۔

فتنۂ تکفیر کے بعد

فتنۂ تکفیر کے بعد، اشخاص فتوی میں سے اخبارات میں بعض لوگوں کے رجوع کے اعلانات چھپ رہے ہیں۔ بعض لوگ ان اعلانات کی نسبت ہماری رائے دریافت کرتے ہیں۔ اولاً تو ہر مسئلہ پر اظہار رائے کچھ ضروری نہیں، ثانیاً اس مسئلہ پر ملک کے معزز رسائل و جرائد اور ارباب علم نے اتنا کچھ لکھدیا ہے کہ اب اس بارہ میں قوم ہماری رہنمائی کی محتاج نہیں ہے۔ اور پھر جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ہم کو اس چیز سے زیادہ دلچسپی بھی نہیں۔ جتنا لکھا گیا اس کو بھی داخل اضاعت وقت سمجھتے ہیں۔ آپکے سامنے ہی ایک قوم ہے اس کو دیکھئے وہ کیا کر رہی ہے اور آپ ابھی مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے کفر وایمان کی بحث سے فارغ نہیں۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین اب اس جگہ پہنچ چکے جو ہمارے اور آپکے قلم وزبان کی قلمرو سے باہر ہے۔ اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ زمین والوں کو یہ اختیار جو بخشا گیا تھا کہ "جو تم زمین پر باندھوگے وہ آسمان پر باندھا جائیگا۔ اور زمین پر کھولوگے وہ آسمان پر کھولا جائے گا" اس کو آپ کی آسمانی کتاب، قرآن مجید نے مٹا دیا۔ ایسی حالت میں مولانا حمید الدین اور مولانا شبلی کو نہ آپ کی تکفیر کا اندیشہ ہے نہ آپکے رجوع اور تاویل کا انتظار۔ وہ ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر جوار رحمت الہی میں پہنچ چکے اور ان کا معاملہ اس کی عدالت کے سپرد ہے جو دلوں کے بھیدوں اور نیتوں کے اسرار وخفایا کو اچھی طرح جانتا ہے اور احکم الحاکمین ہے۔

باقی رہے ہم لوگ، تو ہم نے تکفیر ہی پر کب سینہ کوبی کی تھی۔ جو آج رجوع کے اعلانات پر خوشی سے

چمینے لگیں۔ ہمارے نزدیک جس طرح لوگوں کا پہلا اقدام ناقابل اعتنا تھا اسی طرح یہ رجوع ناقابل التفات ہے۔ ہم لوگوں کو اگر کبھی اللہ تعالیٰ اپنے پیش وعقب پر غور کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور زندگی کی مکروہات سے آزاد ہو کر عواقب پر نگاہ ڈالنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیسا ہے؟ باقی رہی یہ بات کہ ہماری نسبت لوگ کیا کہتے ہیں، اس کے لئے کبھی کان نہیں لگاتے۔ کوئی برا کہتا ہے تو اس سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ ہم نے کبھی معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور اگر کوئی اچھا کہتا ہے تو خدائے علیم دستار کے شکر گذار ہوتے ہیں کہ اس نے باوجود علم ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ پس جن لوگوں نے ہماری تکفیر کی ہے ان کے معاملہ سے ہم کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ خیال کرتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اپنا معاملہ اپنے اللہ سے صاف کریں اور جن لفظوں میں چاہیں صاف کریں، اس کا تعلق ان کے ضمیر کے اطمینان سے ہے اور ضمیر کے اطمینان کے متعلق ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے۔

ہم لوگوں کا جرم صرف یہ ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین سے محبت کرتے ہیں۔ ہاں کرتے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ انشاء اللہ اس پر قیامت کے دن ہم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ ہم غیب کا حال نہیں جانتے۔ ظاہر پر حکم لگاتے ہیں۔ اردو زبان میں لکھنے والوں میں سے مولانا شبلی کے قلم سے زیادہ اسلام کی خدمت کسی نے نہیں کی، باقی رہے مولانا حمید الدین ـــــ سو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا علم زیادہ تھا یا عمل! پس ان دونوں بزرگوں کے باب میں ہم ان لوگوں کی رائے سے متفق نہیں ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ دونوں "راجپال" اور "کعب بن اشرف" کی سزا کے مستحق ہیں۔ اور الحمد للہ اپنے اس عدم اتفاق کے نتائج پر پوری ذمہ داری کے ساتھ غور کر چکے ہیں۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم غیب نہیں بخشا ہے اس لئے امید ہے کہ وہ ہماری غلطی معاف فرمائے گا۔

ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس تمام جوش جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا اصلی مقصد صرف یہ تھا کہ مدرسۃ الاصلاح کو نقصان پہنچایا جائے۔ اور اگر ہم "مصلحت اندیشی" کے خوگر ہوتے تو شاید اسی "بت" پر اپنے ضمیر کی قربانی کے لئے آمادہ ہوتے لیکن الحمد للہ اس کی فکریں ہم کو اس قدر نہیں ستاتیں جسقدر لوگ سمجھتے ہیں۔ مدرسہ ایمان اور ضمیر کی خدمت کے لئے ہے۔ اگر وہ اس راہ میں روک ہو تو اعلان حق کا گرز سب سے پہلے اسی بت پر پڑنا چاہئے۔ یہ نفس کی بدترین خدائی ہے کہ آدمی پیٹ کے لئے دل کا خون کرے۔ روزی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس خزانہ پر بندوں کو اختیار و تصرف نہیں بخشا ہے۔ مولانا شبلی اور مولانا حمیدالدین سے محبت کر کے ہم صرف چند مولویوں کی نظر میں کافر ہوں گے لیکن اگر ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کرلیں کہ روزی کے خزانہ پر خدا کے سوا کوئی دوسرا بھی متصرف ہے تو ہم قرآن کے نزدیک کافر ہو جائیں گے کیونکہ یہ علانیہ شرک ہوگا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ پس دونوں میں کون آسان ہے یہ کہ ہم کو چند انسان کافر سمجھیں یا یہ کہ قرآن کے فیصلہ کے مطابق ہم مشرک ہو جائیں؟

بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ مولانا حمیدالدین کی جس تحریر پر تکفیر کی گئی وہ مشتبہ تھی اس لئے ہم غلط فہمی ہوئی اور ہم نے ان کی تکفیر کر دی۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ نے اچھا کیا۔ اب اسکی پوری تشریح الاصلاح میں چھاپ دی گئی ہے اور غلط فہمی کا پورا سد باب کر دیا گیا ہے، انشاء اللہ آئندہ یہ عبارت موجب وحشت و اشتباہ نہ ہوگی۔ لیکن اتنے کے لئے اسقدر زحمت فرمائی کی ضرورت نہ تھی کہ ۲۲ صفحے کا فتویٰ تکفیر شائع کیا جائے۔ اتنی تحریر کافی تھی کہ یہ عبارت مشتبہ ہے۔ اسکی تفصیل کر دیجائے۔ آپ مشتبہ کو مشتبہ کہہ سکتے تھے۔ کفر و زندقہ کہنے کا حق تو شاید یہ حاصل نہیں ہے؛

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہیں کافر نہیں ہیں ہم

رہا عبارت کا مشتبہ ہونا، سو وہی عبارت ہم نے الاصلاح سے نہیں بلکہ "الافصاح" سے نقل کر کے ہندوستان کے کم وبیش ۵۰۰-۶۰۰ علماء کی خدمت میں بھیجی تھی اور اس کے متعلق ان سے شریعت کا حکم دریافت کیا تھا۔ ان علماء نے جو کچھ لکھا ہے وہ چھپ رہا ہے عنقریب شائع ہوگا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ تاہم ان لوگوں کو ہم معذور خیال کرتے ہیں جنکو غلط فہمی ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز سے ۹۰ آدمیوں کو اطمینان ہو اور دس کو شبہہ ہو جائے۔ ایسا ہونا بعید نہیں ہے۔ غلط فہمیوں کے بے شمار اسباب ہوتے ہیں۔ ہم دوسروں کی غلط فہمی پر کیوں تعجب کریں جب خود ہم کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس عبارت سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کو مولانا حمید الدینؒ کے ساتھ حسن ظن نے غلط فہمی میں ڈالا ہو اور دوسروں کو ان کے ساتھ سوءظن غلط فہمی میں ڈالدے۔ نگاہ تو بہت حد تک ہمارے باطنی احساسات و تصورات کے تابع ہوتی ہے۔

مولانا شبلی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا سید سلیمان صاحب نے مولانا شبلی کی جو تحریر شائع کی ہے وہ ہماری نظر سے نہیں گذری تھی۔ اب اس تحریر کے بعد یہ غلط فہمی رفع ہوگئی۔ غلط فہمی کا رفع ہونا ضروری تھا وہ جس طرح بھی رفع ہوئی اچھا ہوا۔ مگر ایک بات پر ہم کو تعجب ہوا کہ جو لوگ الکلام کے پیدا کئے ہوئے مغالطات اور مولانا شبلی کی تکفیر کی پوری سوانح عمری سے گھر والوں کی طرح واقف ہیں، وہ مولانا شبلی کی اس تحریر سے بیخبر تھے۔ حالانکہ مولانا شبلی کی تاریخ تکفیر کا سب سے زیادہ روشن ورق یہی تحریر تھی۔ راقم سطور نے تو جب آنکھیں کھولیں مولانا شبلی کا قلم سیرت کا سرنامہ لکھکر دربار نبوت میں نذر عقیدت پیش کرنے کے لئے احرام باندھ چکا تھا۔ اس لئے کچھ نہیں معلوم کہ اس سے پہلے کیا حالات و واقعات گذرے لیکن جو لوگ اس تاریخ تکفیر کی تمام جزئیات پر مطلع ہیں ان کو یہ بات ضرور معلوم ہونی چاہئے کہ ایک زمانہ میں غریب شبلی اپنی اس صفائی کے باوجود بھی مجرم ہی ٹھیرا کئے۔ کیا ضمانت ہے کہ اگر یہ تحریر الکلام کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر دی گئی تو آیندہ غلط فہمیوں کا

سدباب ہوجائیگا۔ افسوس ہوتا ہے کہ جو بات الکلام کے مشرح ومفصل ابواب کے اندر لوگ نہ سمجھ سکے وہ دو سطر کی ایک مجمل تحریر سے سمجھ گئے۔ کیا یہ سچ ہے کہ تل کے اوٹ میں پہاڑ ہوتا ہے!

بعض تحریروں میں یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ جب الاصلاح اور الکلام کے مضامین سے علماء میں اس قدر غلط فہمی پیدا ہوئی تو عوام میں نہ جانے کتنی غلط فہمی پھیلی ہوگی۔ عوام اس تفقد احوال اور التفات خسروانہ کے ممنون ہیں کہ ہمارے علماء کرام ان کے لیے اس درجہ غمگین رہتے ہیں لیکن ہم پورا اطمینان دلاتے ہیں کہ عوام اس قسم کی غلط فہمیوں میں پڑکر اپنے تئیں پریشان نہیں کرتے۔ اس قسم کی غلط فہمیوں میں صرف وہ لوگ پڑتے ہیں جو اپنی عاقبت سے زیادہ دوسروں کی عاقبت کی فکروں میں گھلتے رہتے ہیں۔ جو اپنے ایمان وعمل کے معاملات سے بالکل فارغ ہیں اور خلق کی ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے مامور۔ یہی لوگ ہیں جو کبھی کبھی اپنے تمام اسلحہ سے مسلح ہوکر یکجا ہوتے ہیں اور ایک جماعت کے خلاف دوسری جماعت میں بے شمار غلط فہمیاں پھیلا کر اسلام اور کلمۂ اسلام کی خدمت کرتے ہیں۔ عوام غریب کو روٹی کے جھگڑوں سے اتنی فرصت کہاں جو بیٹھکر الکلام اور علم الکلام کے مسائل کی تحقیقات کریں۔

ایک محب مخلص دریافت کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت ہوتی اور اسلامی حدود وتعزیرات جاری ونافذ ہوتے تو اس فتویٰ کے بموجب حکومت کے جلادوں کی سفاک تلواریں کب کی ہماری گردنوں پر چل چکی ہوتیں۔ پھر ان رجوعات سے ہمارا کیا بھلا ہوتا! لیکن ہم اپنے دوست سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ تاریخ اسلام کا پہلا واقعہ ہوتا! تاریخ اسلام کے بے شمار واقعات میں جو علماء کی نگرانی اور پورے دن کی روشنی میں پیش آئے ایک واقعہ کا اضافہ اور ہوجاتا۔ اس سے زیادہ کیا ہوتا! ہماری یہی سعادت مندیاں تو ہیں جن کی بدولت آج ہم تخت وتاج سے محروم ہوکر ہندوستان میں

ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہیں ورنہ کیا خدا نے اپنی دنیا کی پاسبانی کے لئے ہمارے سوا کسی دوسرے کو چنا تھا؟ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

دو ادیبوں کی موت

اخبارات میں مولوی نورالحسن صاحب نیر صاحب نور اللغات اور مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کی موت کی خبریں چھپی ہیں۔ مولوی نورالحسن صاحب مرحوم اردو زبان کے ماہر ادیب تھے انھوں نے نور اللغات کی تالیف سے اردو زبان کی ایک پائدار خدمت انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

منشی پریم چند آنجہانی نے اپنے بے نظیر افسانوں کے ذریعہ اردو زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اردو زبان میں صرف انہی کے افسانے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ ہر چند ہم ان کے جدید رجحانات سے متفق نہیں تھے لیکن ان کی قدیم خدمات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

آیندہ اشاعت

آجکل مختلف مشغولیتوں نے بالکل احاطہ کر لیا ہے۔ پھر جلسہ کے سلسلہ میں نومبر میں شاید دو تین دن پریس بند رکھنا پڑے اس لئے اندیشہ ہے کہ آیندہ پرچہ دو چار روز کی تاخیر سے شائع ہو۔ ابتک جو تاخیر ہوتی تھی وہ عموماً بلا وجہ ہوتی تھی مگر اس مرتبہ اگر تاخیر ہوئی تو واقعی عذر ہوگا۔ امید ہے کہ قارئین مہینہ کی آخیر تاریخوں تک انتظار کریں گے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ جلسہ سے پہلے پرچہ شائع ہو جائے۔ اگر ایسا ممکن ہوا تو انشاء اللہ انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑیگی۔

باب التفسیر

تفسیر سورۃ الکافرون

۳

مصنّفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی

مترجمہ

امین احسن اصلاحی

لفظ "کافرون" سے خطاب دلیل برأت ہے

۷۔ اس سورہ کے علاوہ، پورے قرآن میں، خدا نے کہیں ان لوگوں کو اس لفظ سے مخاطب نہیں کیا ہے۔ اس لفظ سے اسی وقت خطاب کیا جب انھوں نے پیغمبر صلعم کو قبول دعوت سے مایوس کر دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ اپنے کفر سے ہٹنے والے نہیں ہجرت سے پہلے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ تیسری فصل میں یہ آیت گذر چکی ہے۔ فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ. یہ ان منکرین کا قول ہے جو جوش مخالفت میں انکار و تمرد کی آخری حالت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال سورہ سبا میں بھی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ

ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا مگر وہاں کے دولتمندوں نے کہا کہ جو چیز تم لے کر آئے ہو

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ○

ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور کہا ہم مال و اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہم پر عذاب نہیں ہونے کا

سورہ قصص میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کا قول بیان ہوا ہے۔

وَقَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا وَقَالُوا إِنَّا بِكُلٍّ كَافِرُونَ

کہا دو جادوگر ہیں جنھوں نے آپس میں ایکا کر لیا ہے اور کہا کہ ہم ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔

سورہ زخرف میں اہل مترفین کا حال بیان ہوا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ

اور جب ان کے پاس حق آیا انھوں نے کہا یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔

اس سورہ میں فرمایا

وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ

اور ایسے ہی ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا مگر وہاں کے دولتمندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ پیغمبر نے کہا کیا اگر میں اس سے زیادہ ہدایت کی چیز لاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا تو بولے جو چیز تم لے کر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں

یعنی چاہے وہ ہمارے طریقہ سے زیادہ ہدایت بخش ہو یا کم، ہم اپنے باپ دادا کے رستہ سے نہیں ہٹ سکتے۔ اور یہ جو کچھ تم لے آئے ہو ہم کو اس سے علانیہ انکار ہے

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ لفظ "کافرون" سے خطاب کا مقصود شتم نہیں ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے سمجھا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ انکار و سرکشی کی اس حد تک پہنچ گئے کہ سچائی کی ایک بات بھی سننے کو

نہیں رکھتے، ان سے ایمان و ہدایت کی توقع کا خاتمہ ہو چکا۔ اب ان کے لئے صرف ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ عذاب الٰہی نمودار ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرکشوں کا حال ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنی رعایا کے حقوق اس وقت تک تسلیم نہیں کئے جب تک تلوار نے ان کو مجبور نہیں کر دیا۔ اس لئے انبیاء کی سنت ایسے سرکشوں کے معاملہ میں رہی ہے کہ اتمام حجت کے بعد جب ان سے مایوس ہو گئے اور توبہ و انابت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی، ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے خروج کی صورت میں، جیسا کہ ہم اپنی کتاب ملکوت اللہ میں مفصل لکھ چکے ہیں، نظام معاشرت کی بربادی ہے۔ اس لئے انبیاء کرام نے تبری و علیحدگی کی روش اختیار فرمائی۔ قرآن مجید اور کتب مقدسہ میں اس کے شواہد بکثرت ہیں۔ مثلاً فرمایا۔

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ

پس جو ہمارے ذکر سے پھر گیا اور صرف دنیا ہی کی زندگی پر قانع ہو گیا اس سے اعراض کر۔ انکے علم کی رسائی یہیں تک ہے۔

آیات (۲-۳) اعلان برأت میں

۸۔ تمدن کے قدیم دور میں، قوموں کے تمام اجتماعی رشتے، محض ان کے بتوں کی بدولت قائم ہوتے تھے مختلف قبائل مختلف بتوں کی پوجا کرتے تھے اور جب ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کے ساتھ رشتۂ اتحاد قائم کرنا چاہتا تو اس قبیلہ کے بت کی پرستش شروع کر دیتا۔ اس طرح جس سلطنت کے زیر سایہ جتنی قومیں ہوتی تھیں، اتنے ہی اس کے اصنام ہوتے تھے۔ قدیم زمانہ میں یہی دستور تھا۔ قومی مصالح میں سب سے زیادہ اہم حیثیت بت پرستی کو حاصل تھی۔ اجتماع و اتحاد کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم تھی، اس لئے اس میں جس قدر توسیع ہو وہ عین مطلوب تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت جہاں بیان ہوئی ہے اس میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا

تم تو اللہ کے سوا بت تھان بناتے ہو، آپس کی دوستی

مُّوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ — کے لیے دنیا کی زندگی میں، پھر قیامت کے دن تم میں سے

یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا — بعض، بعض کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا

وَّمَاْوٰکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ — اور تمھارا ٹھکانا جہنم ہوگا اور تمھارے لئے کوئی مددگاروں میں سے نہ ہوگا

روم اور ہندوستان کی بت پرست قوموں کی تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ — نہ میں پوجتا ہوں جسے تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے والے ہو جسے

مَآ اَعْبُدُ — میں پوجتا ہوں۔

کا اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں ہے۔ یہ آپس کے تمام اجتماعی رشتوں کے خاتمہ کا اعلان ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تم سے علحدہ ہیں اور تم ہم سے علحدہ ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہی اعلان تھا۔ (فصل ۵ میں الف، ب، ج دیکھو)

حسن موقع کے لحاظ سے "تعبدون" کی جگہ "انتم عابدون" فرمایا لیکن "لا اعبد" کا قرینہ دلیل ہے کہ یہ حال کے مفہوم میں ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے ایسا ہی سمجھا ہے۔

آیات (۴-۵) تاکید برأت ہیں

۹۔ بلاغت کا تقاضا ہے کہ اعلان برأت نہایت واضح اور موکد لفظوں میں ہو اور یہ بلاغت قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس میں تکرار محض نہیں ہے۔ وہ ہر تکرار کے ساتھ کسی جدید فائدہ کا اضافہ کردیتا ہے۔ قصص و واقعات کے بیان میں اس کے شواہد بکثرت ملیں گے۔ پس لفظ "عابدون" مستقبل کی تمام امیدوں کا خاتمہ کردیتا ہے۔ اور "عبدتم" میں ان کے دین آبائی سے بیزاری کا اعلان ہے۔ اور مقابلۃً اس میں زیادہ شدت و غلظت ہے۔ اسکی مثال سورہ انبیاء میں ہے

اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَقَوْمِہٖ مَا ھٰذِہِ التَّمَاثِیْلُ — جب انھوں (ابراہیم) نے اپنے باپ اور اپنی قوم

الَّتِیْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ. قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا لَهَا عَابِدِیْنَ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

(سورہ انبیاء)

لوگوں سے کہا کہ یہ مورتیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو یہ کیا ہیں؟ وہ بولے ہم نے اپنے بڑوں کو ان ہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے (ابراہیمؑ نے) کہا کہ بیشک تم اور تمہارے بڑے صریح

دوسری جگہ فرمایا۔

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ، اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

بھلا دیکھو تو جن کو تم پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے اگلے آباؤ اجداد۔ بے شک یہ میرے دشمن ہیں۔ مگر اللہ رب العالمین۔

یعنی نہ ہم تمہارے اور تمہارے آباؤ اجداد کے بتوں کو پوج سکتے اور نہ تم ہمارے خدا کو پوجو گے۔

"کلمہ باقیہ"

۱۰۔ آخری آیت "لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ" خاتمہ کا ایک جامع کلمہ ہے جس نے اپنے اندر اوپر کی تمام باتیں سمیٹ لی ہیں۔ "لَكُمْ دِیْنُكُمْ" "لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ" کے قائم مقام ہے اور "وَلِیَ دِیْنِ" "وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ" کے برابر ہے اور چونکہ جملہ اسمیہ ہے اس لئے کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تینوں زمانوں پر حاوی ہوگیا ہے۔ اختصار و ایجاز نے اس کو ایک ضرب المثل اور "کلمہ باقیہ" کی شکل میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۔

بے شک میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو مگر وہ ذات جس نے مجھکو پیدا کیا بے شک وہ میری رہبری فرمائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک باقی رہنے والا کلمہ بنایا اس کے بعد تاکہ وہ رجوع کریں۔

ہجرت سے پہلے پیغمبروں کی طرف سے اسی قسم کے اعلانات ہوتے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اعلان فرمایا:

اِنِّیْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ	میں خدا کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ خدا کے سوا
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا	جو تم دوسرے شریک بناتے ہو میں ان سے بالکل بیزار ہوں
ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۵ - ہود)	بس تم سب مل کر میرے ساتھ اپنا داؤ کر دیکھو اور پھر مجھکو مہلت

اسی سنت کے مطابق آنحضرت صلعم کی زبان پر یہ یادگار کلمہ جاری ہوا۔ اور آپ کی ہجرت کے بعد، ایک دائمی خلش بنکر، ان کے دلوں میں بس گیا۔ اور گو اس کے بعد بھی زبانوں کا انکار باقی رہا لیکن دلوں نے گواہی دیدی کہ آپ کا دین، خدائی دین ہے۔ اپنے زمانہ قیام مکہ میں آپنے وعظ و عید کی کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی۔ نصیحت کے کلمات اور پند و موعظت کے ارشادات سے ان کو اچھی طرح باخبر کر دیا اور جب انھوں نے ان باتوں پر کان نہیں دھرا، آپ نے ان کو آخری مرتبہ جھوڑا اور چھوڑکر چلے گئے کہ ممکن ہے یہ آخری تدبیر کچھ کارگر ہو اور وہ خدا کی طرف متوجہ ہوں۔ ہجرت کے بعد آپ کی قوم میں سے ایک بڑی جماعت نے آپ کی دعوت قبول کی۔ صرف وہی لوگ انکار پر قائم رہے جن کے لئے عذاب مقدر ہو چکا تھا۔ وبالآخر قتل و ہلاک ہوئے۔

اسی اصول کے مطابق آپ نے فتح مکہ کے وقت بھی ایک سخت اور آخری تبلیغ فرمائی۔ یعنی سورۂ برأت اہل مکہ کو سنائی گئی۔ اس اعلان نے اہل عرب کو متوجہ کیا اور ایک بڑی جماعت کو توبہ کی توفیق ہوئی۔ اسی وجہ سے سورہ برأت کو سورہ توبہ بھی کہتے ہیں۔ اور یہی نکتہ ہے کہ سورہ کا قرون ایک ایسی سورہ کے ساتھ رکھی گئی جس میں توبہ کبری کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل بارہویں فصل میں آئے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت اور عذاب بھی منجملہ اسباب ہدایت کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے

ئُذِیْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (سجدہ)

اور قیامت کے بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو ایک ایسے عذاب کا مزہ بھی ضرور چکھائیں گے جو (اس دنیا میں ان پر) عنقریب نازل ہوگا تاکہ یہ لوگ ہماری طرف رجوع کریں۔

ہجرت کے جنگ و برائت ہونیکا ثبوت احادیث سے

۱۱- پانچویں فصل میں، آیات قرآن کی روشنی میں ہم دکھا چکے ہیں کہ ہجرت جنگ و برأت کا اعلان تھا۔ اب بعض روایات پر غور کرو جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قریش نے ہجرت کو جنگ کا پیش خیمہ سمجھا اور اسی وقت سے طیاریوں میں لگ گئے۔

ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں ایک روایت لائے ہیں کہ جب انصار کے ۷۳ مرد اور ۲ عورتیں حضرت صلعم سے بیعت کے لئے آئے تو قبیلۂ خزرج کے ایک سردار عباس بن عبادہ نے کہا اے گروہ خزرج! کچھ خبر ہے۔ ان سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؛ لوگوں نے کہا ہاں: بولے، ان سے احمر و اسود کی جنگ پر بیعت کر رہے ہو، پس اگر تم کو خیال ہو کہ جب تمھارے مال پر تباہی آئے گی اور تمھارے سرداروں کو قتل و ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا تو تم ان کو چھوڑ دوگے تو بہتر ہے ابھی سے چھوڑ دو، کیونکہ اگر بیعت کے بعد تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہوگی۔ الخ

ایک دوسری روایت کعب بن مالک سے مروی ہے، فرمایا، جب صبح ہوئی قریش کے سرداروں کی ایک جماعت ہمارے پاس آئی اور کہا اے معشر خزرج! ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ ان کے پاس (حضرت صلعم) اس لئے آئے ہیں کہ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں اور ہم سے لڑائی پر آپ لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں، خدا کی قسم، اگر ان کے اور ہمارے درمیان جنگ چھڑ گئی تو تم سے زیادہ عرب کا کوئی قبیلہ ہمارے نزدیک مبغوض نہ ہوگا۔ الخ

اسی طرح ایک روایت ہے کہ براء ابن معرور انصاری آنحضرت صلعم کا ہاتھ پکڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور بیعت کرنا چاہتے تھے کہ ابوالہیثم جو یہود کے حلیف تھے، بات کاٹ کر بولے۔ اے اللہ کے رسول! ہم میں اور یہود میں معاہدہ ہے، اب ہم اس کو کاٹ رہے ہیں، مبادا کہ ہم ایسا کریں اور جب آپ کو اللہ غلبہ دے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس چلے جائیں۔ آنحضرت یہ سنکر مسکرائے اور فرمایا۔ تمہارا خون میرا خون ہے اور تمہارا عہد میرا عہد ہے، تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں جس سے جنگ کروگے اس سے جنگ کروں گا، جس سے صلح کروگے اس سے صلح کروں گا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہجرت درحقیقت تمام کفار و مشرکین اور یہود سے جنگ تھی۔ اس دن ایک نئی امت ظہور میں آگئی اور آنحضرت صلعم کو ایک مستقر اور ایک چھوٹی سی جماعت تائید و رفاقت کے لئے حاصل ہوگئی یعنی ایک حد تک وہ شرائط پورے ہوگئے جن کے بغیر جنگ ناجائز ہے (ان مباحث کے لئے ہماری کتاب الہجرۃ والحرب دیکھو) لیکن اس کے باوجود بھی آنحضرت صلعم مکہ میں مقیم رہے اور اعداء کی تمام ایذا رسانیاں جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کرلیا۔ اس وقت ہجرت کی شرط پوری ہوگئی اور قوموں کا انبیاء کے ساتھ ہمیشہ جو معاملہ رہا ہے، ظاہر ہوگیا۔ فصل (۱) و (۲) میں پڑھ چکے ہو کہ نبی کو صبر اور تحمل شدائد کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ معاملہ بالکل آخری حد کو پہنچ جائے۔ اس وقت پیغمبر ہجرت فرماتا ہے۔ "ہجرت فرماتا ہے" بھاگتا نہیں۔ پہلے برات کا اعلان کرتا ہے۔ اپنے شیرازہ کو مجتمع کرتا ہے۔ خدا کی مدد کے بھروسہ پر پوری طرح مطمئن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت متعین ہوجاتا ہے، وہ اس طرح بے خوف و خطر روانہ ہوجاتا ہے کہ گویا دنیا کی کوئی قوت اس کو گزند نہیں پہنچا سکتی۔ ان اشارات کو ہم پوری تفصیل کے ساتھ کتاب الہجرۃ میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ انبیاء کا اپنی قوم کو چھوڑ کر چلا جانا فرار نہیں ہے بلکہ ہجرت و برائت تمام انبیاء کی سنت رہی ہے

سورہ کا تعلق مابعد سے

۱۲۔ چونکہ یہ سورہ جنگ کی سورہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ سورۃ النصر کو رکھا کہ یہ واضح ہو سکے کہ جنگ اور فتح دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں کے ربط کی مثالیں بہت ہیں۔ چوتھی فصل میں بعض اشارات گذر چکے ہیں۔ اس اسلوب کو اسلوب القرآن کی بحث وصل میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ اس فتح و غلبہ کا اصل مقصود یہ تھا کہ مسجد حرام صرف خدائے واحد کی طاعت و عبادت کا مرکز بن جائے اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو کر اپنے حقیقی رب سے وابستہ ہو جائے۔ اس اصولی حقیقت کو یاد رکھو۔ اس سے بعض اہم مباحث کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ ہجرت دراصل، وصل کا دیباچہ اور جنگ درحقیقت صلح اور توبہ کا پیش خیمہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کی بعثت ذریت ابراہیم علیہ السلام کیلئے سراپا خیر و برکت تھی۔ عذاب اور نقمت نہ تھی۔ اس پر ایک اجمالی بحث سورہ یوسف کی تفسیر میں بھی ملے گی۔ ھذا واللہ تعالیٰ اعلم فان اصبت فلہ المنۃ وان اخطأت فارجو العفو ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا

تفسیر سورہ اخلاص (اردو)

یہ آیت بھی اسی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس سے ننگے طواف کرنے کا اصل فلسفہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کا یہ احمقانہ فعل، ان کے بہت سے افعال کی طرح، درحقیقت ایک نیکی پر مبنی تھا۔ یہ بے حیائی انھوں نے اصلاً ترک دنیا، رہبانیت اور زہد کے طور پر اختیار کی تھی۔ لباس ایک شان وتجمل اور زیب وزینت کی چیز ہے اس لئے وہ طواف کے وقت اس کو اتار دیتے تھے کہ خدا کے گھر کا طواف ان دنیاوی آلائشوں کی آلودگی سے پاک رہے۔ گھروں میں پشت کی طرف سے جانے کا معاملہ بھی غالباً اسی قسم کے احمقانہ تخیل پر مبنی تھا۔ قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کے اس خیال کی تردید کی کہ نیکی کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کو آدمی اپنے اوپر حرام کرے۔ ان تمام نعمتوں سے متمتع ہونا چاہیئے کہ ان کے وجود میں لانے کا منشا ہی یہی ہے۔ البتہ اسراف ناجائز ہے۔ اس سے بچو۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنا اس امر پر منحصر ہے کہ طواف عریاں کا یہ فلسفہ سامنے ہو۔ یہ فلسفہ آیت کے الفاظ سے مترشح ہو رہا ہے۔ بلکہ بغیر اس کو مانے ہوئے آیت کی کوئی جمتی ہوئی تاویل ناممکن ہے لیکن الفاظ میں اسقدر غموض ہے کہ اگر یہ بات سامنے نہ ہو اور موقع کلام رہبری نہ کرے تو اس مطلب تک پہنچنے میں دقتیں ہیں لیکن جن کے سامنے یہ فعل اور یہ فلسفہ دونوں موجود تھا ان کو اس آیت کے سمجھنے میں کیا دقت ہوسکتی تھی! خود اپنی حکایت تھی، ادھر الفاظ زبان سے نکلے اُدھر تمام حقیقت آئینہ ہوگئی۔

سورہ بقرہ میں، جہاں احکام حج بیان ہوئے ہیں، فرمایا ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَاءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا (۲۰۰ - بقرہ)

جب تمام مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ

سلف سے اس آیت کی جو تاویل ہم تک پہنچی ہے اس میں کذکرکم اباءکم کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں کہ وکانوا اذا قضوا مناسکھم وقفوا بین المسجد بمنیٰ وبین الجبل فیعددون فضائل اٰبائھم ویذکرون محاسن ایامھم۔ مناسک حج سے فارغ ہو کر لوگ مسجد اور پہاڑ کے

درمیان بیٹھ جاتے اور اپنے آبا و اجداد کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے۔

ہر چند آیت کے الفاظ اس تفصیل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اس اشارہ کا سمجھنا ان لوگوں کیلئے بہت آسان نہیں ہے جو موقع کی اس خصوصیت اور عرب کے مذاق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ البتہ جو لوگ عہد نزول قرآن میں موجود اور ان حالات سے باخبر تھے ان کے لئے اس کا سمجھ لینا مشکل نہ تھا۔

اسی طرح کسی عہد کا کلام اس عہد کی بے شمار تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس کا اصلی حسن اور زور اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک اس کلام کا ماحول اپنے اردگرد نہ پیدا کر لیا جائے۔ مثلاً ایک مقام پر فرمایا ہے۔

إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ	تم نے اللہ کو چھوڑ کر تھان بنائے ہیں آپس کی دوستی کے لئے
بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ	دنیا کی زندگی میں، پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار
بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ	کریگا اور ایک دوسرے پر لعنت کریگا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔
النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن نَّاصِرِينَ	اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اس آیت میں "مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" کے ٹکڑے پر غور کرو۔ اس میں اس عہد کی سیاست کی ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، جس کے سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل کے بعض نہایت اہم پہلو بے نقاب نہیں ہو سکتے۔

عرب اور دوسری بہت سی بت پرست اقوام میں، بت پرستی محض ایک مذہبی عمل و اعتقاد ہی کی حیثیت سے نہ تھی بلکہ ان کے تمام سیاسی اور اجتماعی رشتے بھی اسی چیز سے وابستہ تھے۔ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ اصنام تھے اور دستور تھا کہ جب کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا تو اس کے بت کی پرستش میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتا اور جب اس سے قطع تعلق کرنا چاہتا، اس شرکت سے تبری کا اعلان کر دیتا۔ اس کے بعد آپس کے تمام رشتے ختم ہو جاتے۔ غور کرو، جن لوگوں کے سامنے یہ حقیقت

وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَاۤءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ. قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۤءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ

. . . .

(۱۳۸ – ۱۴۱ انعام)

اور کچھ انعام ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ اللہ پر افترا پردازی کرتے ہوئے۔ اللہ انکی افترا پردازی کا عنقریب انکا بدلہ دیگا۔ اور کہتے ہیں ان چوپایوں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ مردوں کے لئے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر مردہ پیدا ہو تو وہ اسمیں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ عنقریب انکو اس (من مانی) تفصیل کا بدلہ دیگا۔ بے شک وہ حکیم وعلیم ہے۔ گھاٹے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو بیوقوفی سے بغیر کسی علم کے قتل کردیا اور اللہ نے جو انکو روزی دی اسکو اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی کرتے ہوئے حرام کیا۔

[illegible]

ان آیات کے اندر اہل عرب کی متعدد مزعومات بیان ہوئی ہیں اور انداز بیان اجمالی کا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ داستان سنائی جا رہی ہے وہ اس سے پوری طرح با[خبر] ہیں۔ پس اقتضائے بلاغت یہی تھا کہ اس کی تفصیل نہ کی جائے۔ لیکن بعد والوں کے لئے جو اس عہد [کے] انقراض کے بعد آئے ان اجمالی اشارات کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں ان کی تفصیلات [کے] متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوں گے جن کے جواب کے لئے اس عہد کے عقائد و اعمال سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کو ایک دوسری مثال سے یوں سمجھو کہ سورہ انفال میں فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۤءً وَّتَصْدِيَةً نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس مگر تالی بجانا اور سیٹی بجانا۔ آج ہمارے لئے اہل مکہ کی اس عبادت کا صحیح تصور کتنا مشکل ہے۔ لیکن عہد نزول قرآن کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ عام اور معلوم بات کوئی دوسری نہ تھی۔ وہ نہ صرف اس نماز کی پوری ہیئت و حقیقت سے واقف تھے بلکہ ظہور اسلام سے پہلے یہ سب کچھ کر چکے تھے۔

ایک اور مثال لو۔ سورہ اعراف میں ہے ۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَاءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۸ ۔ اعراف)

اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو یہ کام کرتے ہوئے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ کہدو اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات کا الزام دھرتے ہو جس کا تمھیں علم نہیں۔

جو لوگ عہد نزول قرآن میں موجود تھے انھوں نے اس آیت کو اہل مکہ کے طوافِ عریاں سے متعلق سمجھا۔ حالانکہ اس میں طواف عریاں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک لطیف اشارہ ہے لیکن کلام کا موقع اور سیاق وسباق ایسا تھا کہ جو لوگ اہل مکہ کی اس حالت سے واقف تھے انکا ذہن اسی مطلب کی طرف جاسکتا تھا۔ البتہ بعد والوں کو یہ مطلب سمجھنے میں زحمتیں پیش آئیں اسلئے کہ ان کے سامنے صرف کلام اور اس کا سیاق وسباق تھا۔ وہ موقع اور ماحول نہ تھا جس میں یہ کلام نازل ہوا۔ ہرچند کہ الفاظ اور سیاق کلام صحیح مطلب کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے ناکافی نہیں ہوتے لیکن انکی رہنمائی کے ساتھ اگر موقع ومحل کی رہنمائی بھی شامل ہوجائے تو پھر اصل حقیقت آپ سے آپ بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

اسی آیت سے بالکل متصل فرمایا ہے ۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الآیۃ) (۳۱ ۔ ۳۲ اعراف)

اے آدم کے بیٹو! ہر مسجد کے پاس لباس وغیرہ سے اپنے تئیں آراستہ کرلیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچیاں نہ کرو کیونکہ خدا فضول خرچیاں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ کس نے حرام کی اللہ تعالیٰ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور پاک روزیاں (جو اس نے اپنے بندوں کو بخشیں)

معارف قرآن

تیسیر قرآن

(۷)

امین احسن اصلاحی

قرآن مجید کی مشکلات باعتبار مخاطب

مضمون کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک کلام ایک شخص کے لئے نہایت سہل و آسان ہوتا ہے لیکن وہی کلام دوسرے شخص کے لئے نہایت مشکل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے معاملہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ عہد رسالت کے مسلمانوں کے لئے قرآن مجید نہایت آسان تھا۔ وہ آسانیاں بعد کے لوگوں کے لئے باقی نہیں رہیں۔ اپنے زمانہ کے احوال و واقعات و رسوم و عوائد اور اعمال و عقائد سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ قرآن مجید نے جہاں ... فوراً سمجھ گئے۔ یہاں تک کہ ان آیات کا سمجھنا بھی ان کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہ تھا جن میں کسی واقعہ یا کسی خاص شخص کی طرف نہایت مخفی اور لطیف تعریضات ہوتی ہیں۔ کوئی آیت اتری ... کے کسی لفظ میں انھوں نے کسی خاص اشارہ، تعریض، یا کنایہ کی بو پائی اور فوراً اس کے مصداق کی طرف انگلیاں اٹھا دیں۔ اور ہدف مطلب تک اس طرح پہنچ گئے گویا اخفاء و ابہام کی بات تھی ہی نہیں۔ اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جنھیں ... کی نسبت نہایت لطیف تعریضات ہیں۔ ان آیات کے اندر جو شخصیت مخفی ہے ... کی طرف صحابہؓ کی نظر باولی وہلہ اٹھ سکتی تھی وہ اس کے خد و خال سے اچھی طرح آشنا تھے۔

لسانِ غیب سے کوئی لفظ تراوش ہوا اور وہ بے تکلف اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بعض آیات میں صحابہ میں سے کسی خاص شخص کی مدح یا کسی خاص فعل پر مذمت ہے۔ ان کو جس سہولت کے ساتھ عہدِ نزولِ قرآن کے لوگ سمجھ سکتے تھے، قرونِ مابعد کے لوگ کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔

یہی حال اعمال و عقائد کا ہے۔ قرآن مجید میں اس عہد کے اعمال و عقائد کے بیان سے شاید کوئی سورہ خالی ہو۔ لیکن جس طرح معلوم و مشہور باتیں بیان ہوتی ہیں، اسی طرح بالاجمال ان کی طرف اشارات کر دئے گئے ہیں تفصیل کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں اہلِ عرب کے بعض اعمال و معتقدات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ	اور انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں
نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا	میں اس کا ایک حصہ ٹھیرایا اور اپنے زعم کے مطابق کہا اللہ کیلئے
لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ	ہے اور یہ ہمارے شرکا کے لئے ہے۔ پس جو حصہ ان کے شرکا
اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَائِهِمْ	کا ہے وہ اللہ کو نہیں مل سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہے وہ ان کے
سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ	شرکا کو مل سکتا ہے۔ کتنا برا فیصلہ ہے۔ اسی طرح بہت سے
الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ	مشرکین کی نظروں میں ان کے شرکا نے انکی اولادوں کے
لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ	قتل کو عمدہ کر دکھایا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں ڈالیں اور
شَاءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ	تاکہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ اور اگر اللہ
وَقَالُوا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا	چاہتا وہ ایسا نہ کر پاتے۔ پس ان کو اور انکی افتراپردازیوں
اِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ	کو چھوڑ دو۔ اور کہتے ہیں یہ چوپائے اور یہ کھیتیاں اچھوتی
ظُهُورُهَا وَاَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ	ہیں ان کو نہیں کھا سکتا مگر وہ جس کو ہم چاہیں۔ اپنے
عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ	زعم کے مطابق۔ اور کچھ انعام ہیں جن کی پیٹھیں حرام ہیں

موجود تھی ان کو آیت کے اس ٹکڑے کے سمجھنے میں کیا دقت پیش آ سکتی تھی! سنا اور فوراً سمجھ گئے، لیکن ہم، جب تک اس عہد کی سیاسیات سے فی الجملہ واقف نہ ہوں ان لفظوں کا حقیقی زور کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی طرف سورہ کا نزول کی تفسیر میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی آخری فصلیں غور سے پڑھنی چاہئیں

اس حقیقت کی توضیح کے لئے ایک عمدہ مثال بقرہ کی وہ آیت ہے جو خمر و میسر سے متعلق ہے۔

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ	وہ تم سے شراب اور جوئے کی نسبت سوال کرتے ہیں۔
كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ	کہدو ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے ان میں
مِنْ نَفْعِهِمَا (۲۱۶ بقرہ)	بعض فوائد بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کی منفعت سے زیادہ ہے

اس آیت کی نسبت ایک غلط فہمی عام ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ خمر و میسر کی جس منفعت کا قرآن نے اعتراف کیا ہے وہ ان کی طبی اور ذاتی منفعت ہے۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے جس منفعت کا اعتراف کیا ہے وہ ان کی تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی منفعت ہے۔ کسی چیز کی طبی اور ذاتی منفعت اولاً تو قرآن کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ ثانیاً اگر شراب میں کچھ فوائد ہوں بھی تو دنیا کی کونسی مضرت مضرت ایسی ہے جس میں کوئی پہلو فائدہ کا نہیں ہے۔ پھر شراب اور جوئے کی کیا خصوصیت تھی کہ قرآن نے ان کو حرام کرتے ہوئے ان کے نفع بخش اور مفید ہونیکا اعتراف کیا۔ دوسری بہت سی چیزیں حرام کیں کیا وہ فوائد سے مطلقاً خالی ہیں؟ پھر ان کی نسبت یہ اعتراف کیوں نہیں کیا؟ کیا خنزیر میں فائدہ کا کوئی پہلو نہیں ہے؟

بہرحال یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اور اس غلطی کو دفع کرنے کے لئے آیت میں "نفع" اور "اثم" کا تقابل بالکل کافی ہے۔ اگر مقصود ان کے طبی اور ذاتی فوائد و نقصانات کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو "نفع" کے مقابل میں ضرر یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ آتا۔ اثم کا لفظ نہ آتا۔

اب تم کہوگے کہ خمر و میسر کے طبی و ذاتی منافع کا معاملہ تو آسان تھا کہ اس کے بعض وجوہ معلوم تھے لیکن ان کے تمدنی اور اخلاقی فوائد کیا ہیں جن کا قرآن نے اعتراف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آج مشکل ہے۔ کیونکہ ہمارے سامنے جو میخواری اور قمار بازی ہے وہ سرتاسر ضرر اور فساد ہی ہے، اس میں فائدہ کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں۔ جسم اور روح، فرد اور سماج، سب کے لئے عذاب ہے۔ البتہ عربوں میں میخواری اور قمار بازی کو تمدنی اور اخلاقی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کی سوسائٹی میں یہ دونوں برائیاں نیکی کی راہ سے داخل ہوئی تھیں۔ وہ ان دونوں چیزوں کو فیاضی اور گرمجوشی کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو نہایت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جو شراب اور جوئے سے بچتے تھے۔ جو لوگ اس عہد کی تہذیب سے واقف ہیں وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے۔ کسی جاہلی شاعر کے چند شعر پڑھیے۔ وہ انھی دونوں چیزوں کو جن کو آپ سوسائٹی کی سب سے بڑی برائی خیال کرتے ہیں، سب سے بڑی نیکی کی حیثیت سے ذکر کرے گا۔ اس لئے کہ دوستوں کی مدارات، غریبوں کی ہمدردی، بیواؤں کی سرپرستی، یتیموں کی اعانت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے یہاں یہی چیزیں تھیں۔ جوئے اور شراب کے یہی فضائل تھے جن کی بنا پر انکی حرمت کے متعلق لوگوں نے متعجبانہ سوال کیا اور قرآن نے ان کی اس منفعت کا اعتراف کیا لیکن چونکہ یہ منفعت ان کے ضرر کے مقابل میں بہت کم تھی اس لئے حرمت کا پہلو راجح رہا۔

یہ نکتہ بھی، یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید نے خمر و میسر کا تذکرہ انفاق کے سلسلہ میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب میں یہ چیزیں رذائل میں نہیں فضائل میں داخل تھیں۔ اور انھوں نے ان کو محض عیاشی اور لہو و لعب کے طور پر نہیں اختیار کیا تھا۔ بلکہ سوسائٹی کی ایک بہت بڑی عزت سمجھکر۔

اب غور کرو کہ جن لوگوں کو یہ تمام داستان معلوم تھی ان کے لئے قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

للناس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانا بالکل سہل تھا، لیکن بعد کے زمانوں میں جب یہ تمام باتیں مجہول ہو گئیں تو ان تاویل کا یہ راز لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گیا

مزید وضاحت چاہتے ہو تو سورۂ نور دیکھو۔ اس میں اصلاح معاشرت کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔ بظاہر ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ لیکن جب ڈوب کر مطالب پر غور کرنے کی کوشش کروگے تو اس عہد کے معاشرتی حالات کی نسبت سے بہت سے سوالات پیدا ہوں گے اور ایسا معلوم ہوگا کہ کلام اپنی توضیح کے لئے ان معلومات کا منتظر ہے۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر جب تک حالات کی پوری تفصیل سامنے نہ آجائے طبیعت کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ سورۂ براءت وغیرہ سمجھنے کے لئے اس عہد کے سیاسی تغیرات و انقلابات اور ان تمام سیاسی مذہبی پارٹیوں کو جاننا ضروری ہے جو اسلام کے ظہور نے پیدا کردی تھیں۔ غرض ہر عہد کے کلام میں اس عہد کے تمدن، اخلاق، سیاست اور مذہب کی ایسی حقیقتیں مضمر ہوتی ہیں جن سے مطلع ہوئے بغیر اس کلام کی بہت سی خوبیاں اور باریکیاں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر کلام کا حال یہی ہے۔ ہومر اور شکسپیئر کو پوری طرح سمجھنے کے لئے بھی ہم کو یہی کرنا پڑتا ہے کہ جتنا خارجی چیزوں کی مدد سے ہم اپنے اردگرد ہومر اور شکسپیئر کا ماحول تیار کرتے ہیں۔ ہومر اور شکسپیئر تو خیر زمانہ قدیم کے فسانے ہیں، ان کے تمدن اور ہمارے تمدن میں نہ صرف زمانہ کا فرق ہے بلکہ دونوں کی اصل نسل اور وطن و مرز بوم مختلف ہیں۔ میر اور غالب کو لو جو اپنی ہی قوم کے شاعر تھے۔ اور ابھی ان کے کلام پر کچھ ایسا زمانہ بھی نہیں گذرا ہے۔ کیا ان کے سمجھنے کے لئے ہم ان تمام چیزوں کے محتاج نہیں ہوتے۔

الاصلاح نمبر۱ میں استاذ امامؒ کا ایک مضمون "ترتیب و نظام قرآن" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل سطریں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

(۱) ہم کو لازم ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کی پوری حالت تمدن سے ہم واقف ہوں۔

(۲) ہم کو اس وقت کے یہود و نصاریٰ، مشرکین و صابئین وغیرہ کے مذاہب و معتقدات سے واقف ہونا چاہئے۔

(۳) ہم کو عرب کے عام توہمات کو دریافت کرنا چاہئے۔

(۴) ہم کو جاننا چاہئے کہ نزول قرآن کی مدت میں کیا کیا واقعات نئے پیدا ہوئے، دوران سے عرب کی مختلف جماعتوں میں کیا کیا مختلف باتیں زیر بحث آگئیں۔ کیا کیا ملکی و تمدنی جھگڑے چھڑ گئے اور تمام عرب میں کیا کیا شورش پیدا ہوگئی۔

(۵) ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ عرب کس قدر وحشی اور تند مزاج تھے، اور اس لئے کس قسم کے کلام سے متاثر ہو سکتے تھے۔

(۶) ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ عرب کا مذاق سخن کیا تھا، کس قسم کے کلام سننے اور بولنے کے وہ عادی تھے بزم میں ان کا خطیب کس روش پہ چلتا تھا، ایجاز و اطناب، ترصیع و ترکیب و دیگر اسالیب خطابت کو وہ کیونکر استعمال کرتے تھے۔

(۷) اور بالآخر ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ عرب کے ذہن میں، خلاق کے مدارج نیک و بد کیا تھے۔

سلف کا طریقہ تفسیر انہی وجوہ سے سلف کا طریقہ تفسیر یہ تھا کہ پہلے قرآن کو خود قرآن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے اس کے بعد اگر کوئی مشکل پیش آتی تو اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال میں تلاش کرتے اس کے بعد بھی اگر معاملہ کا کوئی گوشہ محتاج توضیح رہ جاتا تو اس کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و اقوال سے مدد لیتے کیونکہ قرآن مجید جن کے حالات و واقعات پر اترا اور جن کو اس نے سب سے پہلے مخاطب کیا وہ قرآن مجید کے اسرار و حکم اور اس کے رموز و حقائق جس خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے اس خوبی کے ساتھ دوسرے لوگ جن کو وہ حالات میسر نہیں ہیں کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ سیوطی اتقان میں تفسیر کا طریقہ یہ بتاتے ہیں۔

قال العلماء من اراد تفسير الكتاب
العزيز طلبه اولاً من القرآن فما اجمل منه
في مكان فقد فسر في موضع آخر وما اختصر
في مكان فقد بسط في موضع آخر منه
وقد الف ابن الجوزي كتاباً فيما اجمل
في القرآن وفسر في موضع آخر منه وقد
اشرت الى امثلة منه في انواع المجمل فان
اعياه ذلك طلبه من السنة فانها شارحة
القرآن وموضحة له وقد قال الشافعي
رضي الله عنه كلما حكم به رسول الله
صلى الله عليه وسلم فهو مما فهمه من القرآن۔
قال الله تعالى انا انزلنا اليك الكتاب
بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله
في آيات اخر وقال صلى الله عليه وسلم
الا اني اوتيت القرآن ومثله معه يعني
السنة۔ فان لم يجده من السنة رجع
الى اقوال الصحابة فانهم ادرى بذلك
لما شاهدوه من القرائن والاحوال عند
نزوله ولما اختصوا به من الفهم التام
والعلم الصحيح والعمل الصالح۔

علماء نے کہا ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہے
وہ پہلے قرآن مجید سے تفسیر کرے، اس میں جو چیز ایک جگہ
مجمل ہے دوسری جگہ اسکی تفسیر کر دی گئی ہے اور جو بات
ایک جگہ مختصر ہے دوسرے مقام پر بالکل مفصل ہے۔
ابن جوزی نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کی ان
تمام آیات سے تعرض کیا ہے جو ایک جگہ مجمل اور دوسری
جگہ مفصل ہیں۔ اور میں نے نوع مجمل کے بیان میں اس کی
بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔
اگر کہیں اس میں کامیابی نہ ہو یعنی قرآن کی تفسیر خود
قرآن سے نہ ہو سکے تو سنت میں اسکی تفسیر تلاش کرے
کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے۔ حضرت امام
شافعی نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم کے تمام فیصلے قرآن مجید سے
مستنبط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے انا انزلنا الیک الکتٰب الآیۃ
آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے مجھے قرآن دیا گیا اور اسی مثل اسکے
ساتھ یعنی سنت۔ پس اگر سنت میں بھی نہ پائے تو صحابہ رض
کے اقوال کی طرف متوجہ ہو وہ اس کے سب سے بڑھکر جاننے
والے ہیں اسلئے کہ انھوں نے نزول قرآن کے
وقت تمام قرائن و احوال کا خود مشاہدہ کیا ہے، نیز فہم کامل
اور علم صحیح و عمل صالح سے بھی آراستہ تھے۔

تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔ اصل چیز خود قرآن کے الفاظ اور اس کی توضیحات ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلعم کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوال صحابہؓ کا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کی تشریحات اور صحابہؓ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ قرآن کے الفاظ کی حکومت باطل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے اوپر جو قول نقل کیا ہے اس میں تفسیر کے لئے اصل الاصول خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی توضیحات کو قرار دیا گیا ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا۔ ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید سے صاف نہیں ہوتی تو اس کے لئے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال سے آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دیگا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنت رسول اور اقوال صحابہ کی رہنمائی ہو اس لئے کہ جس پر قرآن اترا اور جن لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے اترا وہ اس کو جسقدر بہتر سمجھ سکتے ہیں دوسرے اسقدر بہتر نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اس رہنمائی کی صورت کیا ہو گی؟ یہ ہو گی کہ ایک آیت پر اس کے الفاظ کی روشنی میں پوری طرح غور کر لیا۔ قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں، ان کی روشنی میں بھی اس کو اچھی طرح دیکھ لیا، سیاق وسباق اور عمود و نظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود پوری تشفی نہیں ہوتی۔ الفاظ کچھ چاہتے ہیں لیکن صاف نہیں معلوم کہ کیا چاہتے ہیں۔ اب ہم احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی بات پا لیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے۔ الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انتظار نہیں رہ جاتا، نظم اور سیاق کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ تو اس بات کو اگر وہ صحیح طریقہ سے منقول ہو گی، قبول کر لیں گے۔ یہ نہیں کریں گے کہ آیت کے الفاظ کسی توضیح و تشریح کے منتظر ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک بات جو ہم نے روایات کے ذخیرہ میں دیکھ لی ہے خواہ مخواہ اس پر چسپاں کر دیں اگرچہ نظم و سیاق، آیات مماثل اور نصوص کتاب و سنت اس کے علانیہ مخالف ہوں۔ اسی قسم کے غلو

بارے میں احادیث و آثار کی طرف سے بدگمانی پیدا کی اور وہ خیالات پھیلائے جن کا حال اس مضمون میں ہم حوالے دے چکے ہیں۔ اہل تحقیق کا یہ مذہب کبھی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے تفسیر قرآن کے معاملہ میں ہمیشہ قرآن مجید کو مقدم رکھا ہے۔ ہاں اگر کوئی مقام محتاج توضیح ہوا، اور صحیح احادیث اور ثابت آثار سے اس کی تشریح ہو گئی تو اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے جائز ہونے پر شاید کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس پر کسی شخص کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی مشکلات میں سنت رسول اور آثار صحابہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ کیا نبی صلعم سے بڑھکر بھی کوئی قرآن کا رازداں ہو سکتا ہے۔ اور کیا یہ ثابت ہے کہ صحابہ سے زیادہ کسی کو قرآن سمجھنے کے مواقع حاصل ہوئے؟ اس پر مذہبی حسن ظن کے ساتھ نہ غور کرو بلکہ مضمون کے ابتدائی مباحث کو پیش نظر رکھکر، عقلاً غور کرو۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ احادیث و آثار صحیح و ثابت ہوں، ضعیف و موضوع نہ ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ علماء نے خود اس بات پر نہایت اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ اتقان میں ہے

للطالب للتفسير مآخذ كثيرة امهاتها اربعة الاول النقل عن النبي صلى الله عليه وسلم وهو الطراز المعلم لكن يجب الحذر من الضعيف منه والموضوع فانه كثير ولهذا قال احمد الخ (ص ۲۱۱ ج ۲)	تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں جن میں سے چار امہات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اول وہ نقل ہے جو آنحضرت صلعم سے مروی ہے اور یہی مقدم ترین ہے لیکن اس باب میں ضعیف و موضوع سے احتراز واجب ہے کیونکہ اس قسم کی روایات بہت ہیں اسی وجہ سے امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ ثلاثۃ لیس لہا اصل التفسیر والملاحم والمغازی۔ تین چیزیں ایسی ہیں جنکی کوئی اصل نہیں ہے تفسیر، ملاحم اور مغازی۔
. . . .	
. . . .	

یہ کوئی نہیں کہتا کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات پر اعتماد کر لیا جائے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ پوری تحقیق و تنقید کے بعد، جو روایات قابل قبول ہوں اور روایت و درایت کے تمام اصولوں پر جانچنے کے بعد پکی ثابت ہو جائیں، صرف وہی روایات لی جائیں۔ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ روایات صحیحہ اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کی بہترین تفسیر روایات صحیحہ آثار ثابتہ اور سنن متواترہ کے اندر محفوظ ہے۔ آنحضرت صلعم نے جو کچھ کیا اور جو کچھ فرمایا سب سرتاسر قرآن سے ماخوذ و مستفاد ہے اور اس پر عموماً امام شافعی کا جو قول نقل ہوا ہے وہ ایک اصل عظیم ہے۔ قال الشافعی رضی اللہ عنہ کلما حکم بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فھو مما فھمہ من القرآن ایسی حالت میں قرآن اور حدیث میں تعارض کیونکر ہو سکتا ہے۔ عموماً لوگ احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف اتنے ہی حصہ کو قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو ابواب تفسیر کے عنوان سے درج ہوتا ہے۔ بقیہ کو قرآن سے غیر متعلق خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ حدیث سرتاسر فہم قرآن ہے۔ احادیث پر اگر دقت نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو حدیث و قرآن کا گہرا تعلق نہایت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ ان کو ہم انشاء اللہ کسی مستقل مضمون میں بیان کریں گے۔

تاہم حدیث کی حیثیت اصل کی نہیں ہے۔ فرع کی ہے۔ اصل قرآن مجید ہے۔ وہ جس طرح تمام کتب سابقہ کے لئے مہیمن ہے اس طرح تمام کتب مابعد کے لئے بھی مہیمن ہے۔ اگر کسی روایت اور آیت میں تعارض ہوگا تو آیت کی تاویل نہ کی جائے گی۔ روایت کی تاویل کی جائے گی۔ آیت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ ہمیشہ سے اہل تحقیق کا یہی مذہب رہا ہے۔ نسخ کے بارہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب تمام کتب اصول فقہ میں مذکور ہے کہ ان کے نزدیک سنت، قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ اس رائے سے اختلاف رکھنے والوں نے ان پر اس مسئلہ کی وجہ سے بڑی تشنیع کی ہے یہاں تک کہ شارح مسلم الثبوت نے اس کو مکابرت تک کہہ دیا ہے لیکن مذہب حق یہی ہے۔

امام کے دلائل کتب فن میں مذکور ہیں۔ اصول میں خود انکا رسالہ ہے اس میں انھوں نے وجوہ بیان کیے ہیں۔ علامہ آمدی نے بھی ضروری تفصیل کی ہے۔ بلکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل ظاہر کا یہی مذہب بتایا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ جب امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہ مذہب ہے، جو حدیث و روایت میں صاحب البیت کا درجہ رکھتے ہیں تو فقہاء اور متکلمین کا مذہب اس سے الگ کیوں ہوا!

بہرحال اگر احادیث کو اس درجہ میں رکھکر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان سے قرآن کے سمجھنے میں نہایت قیمتی مدد ملے گی۔ کوئی۔ کاوش نہ پیدا ہوگی۔ ہمارے نزدیک احادیث کو اس درجہ سے بڑھانا زیادتی ہے، اور اس سے گرانا انتہائی بدبختی اور محرومی جو لوگ آج احادیث کو چھوڑکر قرآن مجید سمجھنا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ بہت بڑا ہے اللہ تعالیٰ ان کو لغزشوں سے بچائے اور مشکلات میں انکی مدد کرے۔ ان کی مثال اس پرجوش اور الڑھ نوجوان کی ہے جو سمندر میں بغیر کشتی کے پھاند پڑا ہے اور خیال کرتا ہے کہ پیرکر سمندر پار کرجائے گا۔ یہ امنگ قابل داد ہے۔ لیکن اس نادانی پر کون نہیں ماتم کرے گا۔ (باقی)

تفسیر سورہ فیل (عربی)

اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصلی حقیقت، اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی جس سے سورہ کی تفصیل میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ مولانا نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کردیا ہے واقعہ ظلم کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اس کی حقیقت آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین۔ قیمت ۸ر منیجر

موعظۂ حسنہ

نماز خیر دارین ہے

از مولانا ابوالخیر محمد خیر اللہ قادری، خلیفہ السنوسی - ورنگل ” دکن

ترک صلوٰۃ حسب صراحت کتاب و سنت تنظیم کے خلاف ایک تفرق و تشتت ہے جس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی ہے یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے جس کا ظہور ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ نماز ہی کی بدولت ہمارے اسلاف، تخت وتاج کے مالک ہوئے اور اسی کو چھوڑ کر ہم آج تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ زبور کی تصریح ہے کہ وراثت ارضی کے مستحق، خدا کے عبادت گذار صالح بندے ہی ہوا کرتے ہیں اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْنَ (انبیاء) دونوں جہاں کے لئے یہی وہ رحمت الٰہی و موہبت نامتناہی ہے جس پر بہبودی کونین و فلاح دارین کا انحصار ہے۔ اسی لئے ہدایت و تبلیغ صلوٰۃ اور اس کی نشر و توزیع سے نظم و جمعیت قومی قائم کرنے والی ذات مستجمع صفات کو اسی سلسلۂ کلام کی بعد والی آیت میں رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ کا خطاب عنایت ہوا۔ وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

آیت استخلاف پر غور کرو کہ حکومت و سلطنت کے حصول و بقا میں اس عبادت گذاری کو کیسا عمیق دخل حاصل ہے۔ اس میں یَعْبُدُوْنَنِیْ وَلَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا سے مقصود بیان وہی واضح ہو رہا ہے جو اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ سے مفہوم ہے۔ نتیجہ یہ کہ وعدہ خلافت ایمان کے ساتھ مشروط تھا۔ لیکن جب ایمان شرک سے مبدل ہو جائے اور ترک و ہجر عبادت عبدیت کو مٹا دے

تو پھر وعدۂ الٰہی کیوں پورا ہو؟ اسی لئے اگلی آیت میں قیام صلوٰۃ کی پھر تاکید فرمائی جارہی ہے وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور) قرآن حکیم میں جہاں کہیں اطیعوا فرمایا گیا وہاں اول اللہ اور اس کے بعد محمد صلعم کی اطاعت کی تاکید مذکور ہے یہاں جو صرف اطاعت رسول کا حکم ہے اس سے عبادت رسول کی پیروی اور اس عمل کی تقلید مترشح ہو رہی ہے جو حضور سید المعاشرین کے لیل و نہار میں نمایاں رہا تھا۔ حیات طیبہ آقائے کون و مکاں میں قیام صلوٰۃ کی جو کثرت ہے پھر اس میں انہماک اور شوق و شغف کا اس درجہ نظر افروز ہونا کہ پائے مبارک متورم نظر آئیں اور جب عرض کیا جائے کہ اسقدر تکلیف کیوں گوارا فرمائی جاتی ہے تو ارشاد ہو کہ افلا اکون عبداً شکورا یہ امور اہل نظر کے لئے موجب عبرت ہیں۔

چونکہ ذات پاک الٰہی معبود ہے (معاذ اللہ) عابد نہیں ہے لہٰذا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فرمانے کے عوض صرف اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ فرمایا گیا اور حضور رحمۃ للعالمین کی نماز کے اتباع اور تقلید ہی کے صلہ میں لعلکم ترحمون سے رحمت الٰہی کی بشارت دی گئی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلافت الٰہی اور وراثت ارضی کے قیام و بقا کے لئے قیام صلوٰۃ ناگزیر ہے۔ اسی میں تنظیم امت اور تمدن و عمران کا راز پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج ہم مسلمانوں نے اسی کو چھوڑا اور اسی سے منہ موڑا ہے نظم قومی و حیات ملی کی تشکیل میں التزام جماعت نماز کو ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہی چیز اساس کار ہے

اصلاح حال کے نہ جانے کیا کیا منصوبے ہیں جو ہمدردان ملت و بہی خواہان قوم کے سامنے ہیں۔ بعض شناسان علالت قومی نے اپنی اپنی جگہ بہت سے نسخے تجویز کر رکھے ہیں۔ جن کو قرابادین یورپ سے تلاش کیا گیا ہے اور وہ اس مریض بیدرماں کو پلائے بھی گئے مگر وہ موافق مزاج ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ شافی مطلق نے جو نسخہ شفا اس کے لئے ازل میں تجویز فرمایا تھا وہ وہی تھا

جس نے اپنا مفید و مجرب ہونا، اسلام کے دور اول میں ساری دنیا کو تسلیم کرا دیا تھا۔ وہ علاج جسمانی و اصلاح روحانی کے لئے سرچشمۂ رحمت الٰہی کا ایک جرعۂ جاں بخش تھا جس کو پی کر لاکھوں مردے جی اٹھے تھے۔ نظم جمعیت قومی کی روح رواں "صلوٰۃ" نے ان کو نئے سرے سے زندہ کر دیا تھا بہیمیت کو ملکوتیت نے اسی نسخہ سے مغلوب کر کے فتح و نصرت حاصل کی تھی۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ۔ (مومنون)

اپنی اصلاح اور آئندہ ترقی کے خواب کی اگر ہم کوئی صحیح تعبیر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس فکر فلاح اور سعی اصلاح کو اگر ہم نتیجہ خیز دیکھنا چاہتے ہیں، تو اس کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ہم اپنی نشأۃ اولی پر نظر رکھکر اصلاح و ترقی کی جانب قدم بڑھائیں۔ یعنی یہ دیکھیں کہ ہماری ابتدا کس طرح ہوئی تھی اس کے بعد کامیابی کی توقع صحیح ہوگی۔ حضرت امام مالکؒ نے اس راز کو ان الفاظ میں بے نقاب فرمایا ہے "لا یصلح اخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولہا" یعنی اس امت کے آخری دور کی اصلاح اس وقت تک نہ ہو سکے گی جب تک اس کیلئے دور اول کی اصلاح کے طریقے اختیار نہ کئے جائیں۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ہماری ابتدا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنے کے بعد نماز ہی سے ہوئی تھی (زکوٰۃ اور روزہ و حج اس کے بعد کی چیزیں ہیں) اسی نے قومی جمعیت، ملی مرکزیت اور اجتماعی مشورہ جیسے سامان اصلاح و ترقی مہیا کئے تھے۔ اجتماعی زندگی اور حکومت آفریں تمدن کے راز بتائے تھے۔ جہانگیری، جہانداری اور جہاں پروری کے گر سکھائے تھے۔ ہر مشکل اسی سے آسان اور ہر بلا اسی سے دفع ہوتی گئی۔ آج مسلمان اگر اس الٰہی نسخۂ شفا کو ٹھکرا دیں اور خود ساختہ تدبیر دلہا اور خانہ ساز فکروں پر بھروسہ کرلیں تو نتیجہ ندامت اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

اقوام وجود میں آنے کی ایک اور علت پر بھی غور کرلیں۔ اس زمانہ کو یاد کرو جب ہماری نام رکھائی

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کی تقریب بندھ رہی تھی اور فہرست اقوام وملل میں ہمارا نام مسلمان لکھا جا رہا تھا۔ وہ بھی کیا ساعت تھی جب خدا کا خلیل وادی غیر ذی زرع میں، اس کے بیت محرم کے سامنے اپنے نور نظر کو ساتھ لئے، یوں دست بدعا تھا رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ خداوندا میں اس بے آب وگیاہ ریگستان اور اس لق ودق بیابان میں اپنے اہل کو اس لئے بسا رہا ہوں کہ یہ اور ان کی ذریت تیری نماز قائم کریں۔ "رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ"۔ خداوندا تو اس کام کے لئے ان کے رہنے بسنے کا سامان فرما دے۔ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے کہ جوق جوق اس طرف آئیں۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ (ترجمہ) دعائے خلیل کے ان آخری الفاظ کو دیکھو! رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ خداوندا! مجھے اور میری ذریت کو تو پابند نماز بنا۔ پھر اس التجا پر ظر کرو رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ (ترجمہ) خداوندا! میری اس دعا کو قبول فرمائے۔

اس مقصد اسلام اور وجہ تعمیر بیت الحرام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کبھی بھلایا نہیں اپنی ذریت کو برابر باپ کی اس دعا اور خانۂ کعبہ کے اس بنیادی مقصد کی طرف توجہ دلاتے رہے وَكَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِیًّا (مریم) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا۔

غرض ہماری ابتدا اور ہماری انتہا میں اگر کوئی جلوہ نظر آتا ہے تو وہ اسی نماز کا۔ پھر اس کو چھوڑ کر کہاں پناہ پائیں گے۔ نماز سحر خیزی سکھاتی ہے جو تندرستی کی ممد ومعاون ہے۔ نماز پابندی اوقات کا سبق دیتی ہے۔ جس میں حصول ترقیات کا راز مضمر ہے اور آج مادی دنیا اس سے حظ وافر اٹھا رہی ہے۔ نماز انسان کو پاک وصاف رکھتی ہے۔ ایک نمازی اس کے اہتمام میں صبح وشام لگا رہتا ہے، اس طہارت جسمانی کا جو فیضان صحت پر مترتب ہوتا ہے وہ محتاج اظہار نہیں۔ نماز

بدکاریوں اور برائیوں سے بچاتی ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ جس شخص کو دن میں پانچ دفعہ بادشاہ کے دربار میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خلاف ورزی احکام شاہی سے خائف و لرزاں رہتا ہے۔ یہ خوف و خشیت اس شخص پر کیوں طاری ہوگی جب کی دن بھر میں ایک دفعہ کی حاضری بھی بارگاہ خسروی میں مقرر ہو۔ جو پابند نماز ہوجاتا ہے اس کو وہ جملہ امور ترک کر دینے پڑتے ہیں جو اس پابندی میں خلل انداز ہوں۔ جامہ ہو۔ فواحش کی خو، بدا طوارانہ اوقات گزاریاں، شرمناک بدشعاریاں، لہو و لعب اور عاصیانہ عیش و طرب ان سے پرہیز ناگزیر ہوجاتا ہے۔ نمازی اور بے نمازی کی حالتوں میں ایک احساسی فرق و امتیاز ہوتا ہے یعنی ایک بے نمازی جہاں خود کو مدہیاً حظا کا ربا ور کرنے پر مجبور ہوتا ہے وہاں نمازی اپنے وجود میں ایک قدرتی تقدس محسوس کرتا ہے۔ اور ہر ایسے موقع پر جہاں اس کو ٹھیس لگنے والی ہو متنبہ ہوجاتا ہے۔ یعنی وہ اپنا خاص احترام پیش نظر رکھتا ہے خود کو صلاحیت کی انطوات سے گرنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی نماز کے ساتھ عیبوں کو جمع کرنے سے محترز رہتا ہے وہ باور کرتا ہے کہ اس کا بدنام ہونا نماز کو بدنام کرنا اس لحاظ سے معاملات میں بھی دیانت و راست بازی اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ اسکا خیال رکھتا ہے کہ کوئی تنگ نظر اسکی کسی غلطی کو دیکھ کر نماز کو مطعون نہ کرے۔ نماز رشتہ عبد و معبود کو مستحکم کرکے ایک نسبت حقہ قائم کردیتی ہے اور جب وہ پورے شرائط کے ساتھ ادا کی جائے تو اس سے دل کی آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ نمازی اس روشنی میں وہ کچھ دیکھتا ہے جسکے بیان کرنے کیلئے الفاظ وضع نہیں ہوئے۔ اسکی یہ دید اس نادیدہ عالم کے علم و یقین کو کامل کردیتی ہے جسکے بعد ایک مسلمان اپنی عاقبت کے لئے وہ سب کرنے لگتا ہے جسکی سعادت اندوزی کے لئے ضرورت ہے۔ نماز جہاں ایک ورزش جسمانی ہے وہاں ایک قواعد روحانی بھی ہے۔ نماز باعث طہارت ظاہر ہے تو موجب صفائی باطن بھی۔ مجامع نماز اصلاح قومی کے بہترین ذرائع ہیں۔ یہ شاہ و گدا کو ایک صف میں پہلو بہ پہلو کھڑا کرکے مساوات اسلامی کا منظر دنیا کو دکھا دیتی ہے۔ نماز مسلمان کے اسلام کا اعلان اور اسکے مسلم ہونیکی علامت ہے۔ نماز مقصود زندگی اور ثبوت بندگی ہے۔ نماز جنت کی کنجی اور مسلمانوں کا نور ہے نماز ہمارے آقا و مولیٰ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اگر ہم غلاموں کو اس ٹھنڈک سے کوئی حصہ نہ ملے تو حیف ہے ایسی غلامی پر۔ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ۔

مقالات

دیباچہ سیرت شبلی

جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم-اے ال ال بی علیگ

مولانا شبلی کی سیرت کی ترتیب بھی ان کے تلامذہ پر دَین ہے۔ گذشتہ نصف صدی کی تمام علمی و اصلاحی سرگرمیوں میں مولانا کی عظیم الشان شخصیت کا جو حصہ ہے اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ کام بہت پہلے انجام پا چکتا کہ اس دور انقلاب کی تاریخ مولانا کی سیرت کے بغیر نامکمل رہے گی لیکن تعجب ہے کہ تاریخ نے ہمارے سامنے ایک نیا ورق الٹ دیا اور ہم ابتک اس کے پچھلے صفحات ہی کی ترتیب سے فارغ نہ ہو سکے۔ شبلی اکاڈمی کی طرف سے یہ خدمت مولانا سہیل کے سپرد کی گئی ہے اور اس میں شبہہ نہیں ہے کہ اس مقصد کے لئے ان سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ اور اسی چیز کی کیا خصوصیت ہے، دنیا کی کون سی علمی و ادبی خدمت ہے جس کے لئے وہ ناموزوں ہیں؟ لیکن اگر ایک طرف اللہ تعالے نے ان کو فضل و کمال بخشا ہے تو دوسری طرف ان میں یہ بہت بڑا عیب بھی ہے کہ وہ کسی کام کو اپنے ذاتی ارادہ سے انجام نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلیؒ کی وفات پر ۲۲ برس گذر گئے لیکن ابتک وہ ان کی سیرت کی تالیف سے فارغ نہ ہو سکے۔ حالانکہ ان کے لئے یہ کام چند ہفتوں یا چند مہینوں سے زیادہ کا نہیں ہے۔ کوئی قوی ارادہ [illegible] ہو جاتا تو سیرت شبلی کب کی مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہوتی۔ لیکن اگر معاملہ انہی کے اختیار و ارادہ پر منحصر رہا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کام کب تک انجام پا سکے گا۔

کسی سازگار ساعت میں موصوف نے کچھ صفحات لکھے تھے اور خیر ہے کہ آجکل طبیعت اس کی طرف متوجہ ہے۔ اس تقریب سے دیباچہ کے صفحات الاصلاح میں شائع کیے جاتے ہیں۔ ممکن ہے توجہ کو سرگرم رکھنے میں یہ تحریک کچھ معاون ہو سکے۔ اور قلم دو چار منزل چل نکلے۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اس کی بعض اور اقساط بھی شائع ہو سکیں گی۔ یہ تحریر پڑھکر تمنا ہوتی ہے کہ کاش یہ پرزور قلم علم و ادب کی کسی مستقل خدمت میں مشغول ہوتا۔ (الاصلاح)

فیضان فطرت اگر دیدۂ اعتبار اور نگاہ بصیرت عطا کرے تو صحیفۂ کائنات کے مطالعہ سے دلچسپ تر کوئی مشغلہ انسان کے لئے نہیں ہے۔ دور حاضر کے محققین اس امر پر متفق ہیں کہ یہ کرۂ ارض ایک طرف تو آفتاب کے جمال نظر سوز سے بھاگنا چاہتا ہے اور دوسری جانب پروانہ وار اسی کے حریم جلال کا طواف کرتا رہتا ہے۔ جو حال اس زمین کا ہے۔ وہی بجنسہ اس زمین پر بسنے والی مخلوق کا۔ ایک جانب تو اس رزم گاہ حیات کا ہر ذرہ زبان حال سے ھل من مبارز پکار رہا ہے۔ اور دوسری طرف اس کوشش ثقل کا کرشمہ کہئے یا وحدت مبدأ کا فیض" ہر وجود دوسری ہستی کی طرف خود بخود کھنچا جا رہا ہے۔ اور رشتہ ہم آغوشی میں بیتاب ہے۔

بامن آویزش او الفت موج است و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

انسان چونکہ بزم آفرینش کا صدرنشین ہے، لہذا عالم انسانیت میں اختلاف و ائتلاف، صلح و جنگ، رزم و بزم کا یہ منظاہرہ و رنگینی نمایاں ہو جاتا ہے۔ شخصی تفوق اور جماعتی اقتدار کی باہمی مسابقت اور مختلف جماعتوں میں امتیاز نسل و وطن یا اختلاف مذہب و معاشرت کی بنا پر معرکہ آرائی اسی عالمگیر قانون فطرت کی کارفرمائی ہے مگر کیا اس سوز کے پردہ میں ساز اور اس تضاد کی تہ میں ہم آہنگی کا راز مضمر نہیں ہے اور کیا تمام ظاہری خصومتیں اور عارضی صف آرائیاں اسی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے

کے لئے ارتقائی عمل جاری ہے۔ یہی تغیرات انسانیت کی معراج ہے جس کا نام حکیم فطرت آفریں نے اسلام رکھا ہے۔

آغاز آفرینش کے صحرانشین و خانہ بدوش انسان کو اپنے تحفظ نفس اور بقائے حیات کے لئے دوسرے سے لڑنا ناگزیر تھا لیکن آگے چلکر انہی اغراض کے لئے باہمی امداد کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور متفرق ٹولیاں بنی ہوں گی جو ایک ہی نسل کے افراد پر مشتمل ہوں گی۔ اور یہی خاندانے پھیل کر قبائل بن گئے ہوں گے۔ اس طرح نظام کی جنگ نے تحفظ افراد و قیام کے لئے قومیت کا سنگ بنیاد رکھا اور اب بجائے افراد کے قبائل کی جنگ کا دور شروع ہوا یہاں تک کہ تمدن کی صادق ظہور ہوئی۔ ان قبائل نے بستیاں بسائیں جن کو خارجی حملوں سے بچانے کے لئے مقامی قبائل نے باہم اتحاد کیا اور پھر ہمسایہ قبائل سے باہمی امداد کے میثاق مرتب ہوئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ خود ان قبائل کی جنگ نے ان کی باہمی صلح کا آغاز کیا۔ اور اتحاد انسانی کے اس دوسرے منزل کی تشکیل ہوئی جس کو وطنیت یا قومیت ملکی کہتے ہیں۔ افراد و قبائل کی جنگ نے اب ترقی کرکے مختلف ممالک کی باہمی کشمکش کا روپ بدلا اور توسیع و تسخیر ممالک کا جنون شروع ہوا جس نے دور دراز کے بسنے والے انسانوں کو نہ صرف باہم ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع دیا بلکہ رفتہ رفتہ اختلاط اقوام نے امتیازات نسلی کو مٹانا شروع کردیا اور تمدن انسانی میں تنوع کے ساتھ تدریجی یکسانیت پیدا ہو چلی۔ اس کسر و انکسار نے تمدن کا قدم آگے بڑھایا۔ گوناگوں ضرورتیں پیش آگئیں جن کے سرانجام کے لئے نئی نئی احتیاجات اور نئی نئی حرفتیں وجود میں آتی گئیں۔ انسانی افراد کے دماغی جسمانی اور ذہنی قوی میں جو فطرتی تفاوت تھا اس کو تمدن کے صیقل نے اور چمکا دیا۔ بنی نوع انسان کے افتراق و اتحاد کی نئی نئی صورتیں نکلیں اور فرق مراتب نے فاتح و مفتوح، امرا و غربا، علما و عوام، اہل حرفہ و اہل حکومت کی مختلف جماعتیں پیدا کردیں۔ فطری ضروریات کی جگہ تمدنی اغراض نے ایک جماعت کو دوسری جماعت سے ٹکرا دیا۔

اور وہ وقت آگیا کہ اس تصادم سے وہ شعلہ اٹھے جو تفریق کے خس وخاشاک کو نذر آتش کردے اور اتحاد انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے شمع راہ ہے

بڑا فراس طلاپ میں ہو کہ صلح ہو جائے جنگ ہوکر

وعدۂ الہی پورا ہو! بلد امن کے بے آب وگیاہ صحرا میں علم وعرفان کا سرچشمہ پھوٹے جو دنوں کی خشک کھیتیاں ہری کردے اور فاران کی چوٹیوں سے عالم انسانیت کو دائمی امن ابدی صلح اور عالمگیر اخوت کا پیام سنا دیا جائے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً

اسلام آیا۔ انسانوں کی خود ساختہ اساس قومیت جو کسی خاص نسل، ملک یا مخصوص جماعتی مفاد پر مبنی تھی منہدم ہوئی اور توحید الہی کے ازلی و ابدی نقطہ کو مرکز قرار دیکر مواخات انسانی کا دائرہ کھینچا گیا جو تمام عالم کو محیط ہو گیا۔

ملت بیضا نے قوموں کی مٹا دی تھی تمیز

تھے بلال و جعفر و سلماں برابر محترم

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے اپنے ایوان بلند کا سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے قدیم جھونپڑے منہدم کرکے زمین ہموار کی اور اثبات توحید کے پیشتر معبودان مجازی کی نفی کا اعلان کیا لا الٰہ الا اللہ۔ مگر بایں ہمہ جتنی صداقتیں دنیا پر اس وقت تک ظاہر ہو چکی تھیں ان کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا اگر ایک طرف وللہ المشرق والمغرب کہکر بسیط ارض کے کسی خطہ کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی تو دوسری جانب حب الوطن من الایمان فرماکر حدود جائز کے اندر خاک وطن سے دلبستگی کو جزو ایمان بتایا۔ اگر ایک جانب الخلق عیال اللہ کہکر تمام افراد انسانی کی نوعی مساوات کا اعلان کیا تو دوسری طرف اہل و عیال، اقربا اور ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کو موجب ثواب آخرت قرار دیا۔

اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھسے پہلے جتنے آئے سب ڈاکو اور بٹ مار تھے بلکہ بلکل قوم ھاد - وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر- فرما کر تمام اقوام و ملل کے علما و مقتدایان ملت کا احترام ہر مسلم پر بحیثیت رکن مذہب واجب قرار دیا - اسلام کا ہر گز یہ دعوی نہیں تھا کہ وہ جن صداقتوں کا مبلغ ہے دنیا اس سے کلیۃً ناآشنا تھی - اس کا دعوی صرف اسقدر ہے کہ اس نے ہر باغ کے پھول لیکر ایک ایسا سدا بہار گلدستہ طیار کر دیا ہے، جو ہر انسان کے لئے جاذب نظر اور راحت روح ہے - اور جس کو ہر ملک اور ہر زمانہ کی آب و ہوا یکساں سازگار ہے -

اسلام کی صدا دنیا کے لئے کوئی نامانوس صدا نہ تھی - اس لئے جہاں پہونچی، سننے والوں نے کان نہیں کھڑے کئے بلکہ سب نے اسکو اپنے دل کی صدائے بازگشت سمجھا - اور جس وقت ساقی اسلام رحمت عالم روحی فداہ نے، حق و صبر کی صہبائے کہن کو، دو آتشہ کرکے مینائے نو میں پیش کیا - اور یٰاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ کی علائے عام دی تو ذوق شناسان بادۂ علم و عرفان بلا تفریق ملک و ملت دوڑ پڑے اور سب نے اس شراب روحانی کو خانہ ساز سمجھکر بے تکلف اپنی تشنگی بجھائی - عرب و عجم، اسود و احمر سب نے اپنے نسلی امتیازات اور قومی خصوصیات کو توحید کے اس بحر مواج میں گم کر دینا اپنی سعادت اور شرف کا باعث سمجھا گوشہ گوشہ اس آفتاب ہدایت سے منور ہو گیا اور دنیا میں ایک ایسی برادری قائم ہو گئی جس کا رشتۂ اخوت محض حق و صداقت یا دوسرے لفظوں میں انسانیت کا معیار صحیح تھا اور جس کا مقصد حیات محض اعلاء کلمۃ الحق - كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ یہی وجہ ہے کہ ناموران اسلام اور مقتدیان ملت میں آپ کو اہل عرب سے زیادہ غیر اہل عرب کی تعداد ملے گی - امام المفسرین ابن جریر طبری یہودی النسل، امام المجتہدین حضرت امام اعظم کوفی ایرانی شہزادہ اور امام المحدثین حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ترک تھے - امام غزالی امام رازی، حکیم بو علی ابن سینا، حکیم ابو نصر فارابی، مولانائے روم، ان میں سے کون اہل عرب تھا؟ دور کیوں جائیے

خود آپ کے وطن ہندوستان نے کتنے بڑے بڑے اکابر امت پیدا کئے، حضرت محبوب الہی نظام الاولیا دہلوی، حضرت امیر خسرو دہلوی، علامہ ابوالفیض فیضی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت ملا محمود ولید پوری ملک العلما، شہاب الدین دولت آبادی، حضرت مجدد الف ثانی سرہندی، فخر المجتہدین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا عبدالعلی بحر العلوم اور اس دور آخر میں استاذ الامام علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تو اسی خاک سے اٹھے!

حضرت علامہ مرحوم چونکہ اسلامی ہند کی قدیم علمی انجمن کے آخری صدر رہے۔ اور زیادہ تر انکی ہی حیثیت ان اوراق کی ترتیب میں پیش نظر رہی ہے۔ لہذا اصل بحث کے آغاز سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور بالخصوص اس حصہ مشرقی میں تہذیب اسلامی کے آغاز اور اس کے تدریجی عروج و زوال پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے

ہندوستان میں اس دعوت حق کی پہلی صدا ساحل ملابار میں عرب تاجروں کی وساطت سے پہنچی۔ یہاں تک کہ بالآخر وہاں کا راجہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ اور کچھ دنوں میں ایک اچھی خاصی آبادی مسلمانوں کی ہوگئی۔ مگر یہ موج اندرون ملک تک پہنچ نہ سکی اور صرف مدراس کے ساحلی علاقوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کا ایک تاریخی حملہ سندھ میں ہوا اور تسخیر ملک کے ساتھ تسخیر قلوب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سے علما و شعراء پیدا ہوئے۔ مثلاً ابوالعطا سندھی، مفسر بھائی وغیرہ مگر اثر بھی زیادہ دوررس اور دیرپا نہیں تھا۔ بالآخر سلطان محمود غزنوی کے غزوات اور بعد ازاں سلطان شہاب الدین محمد غوری اور اس کے جانشینوں کی حکومت نے اندرون ہند کا دروازہ بھی داعیان اسلام کے لئے کھولدیا اور صلحا و اتقیائے امت مثلاً سلطان الہند معین الدین اجمیری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت نظام الاولیا محبوب الہی، حضرت مخدوم صابر کلیری، حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی، حضرت مخدوم یحیی منیری وغیرہم کے فیوض باطنی نے فتوحات روحانی کا

ایک ایسا غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیا جس کو وہ جذبۂ منافرت بھی شکست نہ دے سکا جو فاتح و مفتوح اور حاکم و محکوم کے درمیان پیدا ہونا فطری ہے۔

ادھر ارباب حکمت ایمانی کے فیض انفاس نے انوار توحید سے دنیائے قلوب کو چراغاں کرنا شروع کیا۔ اُدھر شاہان اسلام کی علمی سرپرستیوں نے دماغوں پر علوم و معارف کے خزائن کھول دیے۔

خوش قسمتی سے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے عہد شباب سے پیشتر کوئی ایک مرکزی حکومت ایسی نہ تھی جو تنہا ملک کی قابلیتوں کو نقطۂ واحد پر جمع کر سکے بلکہ مختلف حصص ملک مثلاً ملتان، سندھ، گجرات، کشمیر، دکن، خاندیس، مالوہ، بنگال اور جونپور وغیرہ میں اچھی خاصی با اقتدار حکومتیں موجود تھیں۔ جن کی شاہانہ توجہ نے متعدد علمی مرکز قائم کر دیے تھے۔

علاوہ بریں اوس زمانہ میں سلوک باطن کی دشوار گذار منزل پر قدم رکھنے کی جرأت صرف وہ لوگ کرتے تھے جن پر علوم ظاہری کی راہیں کھل چکی تھیں، ورنہ مسند ارشاد ان جامع الفضائل اکابر کے لیے مخصوص تھا، جو ورع و تقویٰ کے علاوہ فنون متداولہ میں بھی یگانۂ عصر ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد زریں میں وجد و حال کی خانقاہیں بھی فضل و کمال کی درسگاہیں تھیں خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ سے لیکر بہار تک کا وہ خطہ جو عہد شاہی میں صوبہ جات اودھ، الہ آباد و عظیم آباد پر مشتمل تھا۔ اور جس کو ارباب دار السلطنت دہلی، پورب کے نام سے موسوم کرتے تھے، اس شرف میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے۔ سحبان الہند آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں "پورب اس وسیع خطہ ملک سے عبارت ہے جو دلی سے جانب شرق صوبہ الہ آباد، اودھ اور عظیم آباد پر مشتمل ہے"۔

یہ ضرور ہے کہ جہاں تک زبان اُردو کا تعلق ہے دلی والوں نے پورب کو ہمیشہ ٹکسال باہر سمجھا اور جب لکھنؤ نے حکومت کے ساتھ زبان میں بھی دہلی سے آزادی کا اعلان کیا تو وہی سنت قائم رکھی۔ اور لکھنؤ سے پورب والوں کی زبان مستند نہیں سمجھی۔ مگر بایں ہمہ علمی حیثیت سے مسلم الثبوت اساطین فن زیادہ تر

پورب ہی والے تھے۔ ملاحظہ ہو مآثر الکرام آزاد بلگرامی۔

"اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بہ وجود حاملان علوم تفاخر دارد اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کردہ و نہایت ذکرہ تخمیناً آبادی شرفا و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ اند مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہاں کشادہ وصلائے اطلبوا العلم در دادہ اند، طلبہ خیل خیل از شہرے بشہرے روند و ہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند۔ و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند و خدمت ایں جماعت را سعادت عظیم می دانند، صاحب قران ثانی شاہجہاں انار اللہ برہانہ می گفت "پورب شیراز مملکت ماہست۔"

اس "شیراز ہند" کے عین وسط میں "سرکار جونپور" کا خطہ بمنزلہ قلب تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ شیراز ہند کا لقب دراصل جونپور ہی کو دیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو Promotion of Learning

"سرکار جونپور" یا بہ اصطلاح حال "ضلع جونپور" کے حدود عہد شاہی میں بہت وسیع تھے۔ آئین اکبری میں سرکار جونپور کو ۴۱ محال[1] پر مشتمل بتایا ہے۔ اور جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا ضلع اعظم گڈھ اور موجودہ ضلع بلیا کا پرگنہ، سکندر پور غربی، غازی پور کے پرگنے شادی آباد اور بہتری۔ فیض آباد کے پرگنے چاندی پور، ٹرہر، ٹانڈہ اور سرہر پور سب کے سب سرکار جونپور میں شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی تاریخوں میں ان مقامات کے اکابر یا تو جونپوری کہلاتے ہیں یا اپنے اپنے گاؤں سے منسوب ہیں۔

جونپور کی آبادی کے ساتھ ساتھ شاہان شرقی کا دور حکومت شروع ہوا جو ۷۹۶ھ سے لیکر ۸۸۱ھ تک قائم رہا۔ جونپور کی تاریخ کا یہ زریں دیباچہ حقیقت میں اس کا سب سے زیادہ روشن ورق ہے۔

---

[1] محال پرگنہ کا مترادف ہے۔

خصوصاً سلطان ابراہیم اور اس کے پوتے محمد بن محمود کے عہد سعادت میں تو یقیناً یہ شہر مدینۃ الاسلام بنو مدینۃ العلم نیشاپور کی چھوٹی سی یادگار معلوم ہوتا تھا سلطان ابراہیم نے جاگیریں اور وظائف علماء کے لئے مقرر تھے۔ اور سلطان ابراہیم کی بہو بی بی راجی نے علمی سرپرستی کے ذوق میں ایک مسجد و مدرسہ قائم کیا۔ اور ومدرسین کے لئے روزینے مقرر کئے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین صاحب تفسیر بحر مواج، اعلم العلماء قاضی سماء الدین وزیر سلطان حسین شرقی شیخ دانیال اور ان کے شاگرد سید محمد جونپوری مدعی مہدویت المتوفی ۹۱۰ھ، شیخ حسن طاہر جونپوری المتوفی ۹۰۹ھ اور ان کے خلف رشید شیخ محمد حسنؒ المتوفی ۹۴۴ھ شیخ محمد عیسیٰ تلمیذ قاضی شہاب شیخ بھکاری۔ مولانا الہ داد مصنف شرح ہدایہ وغیرہ المتوفی ۹۳۲ھ۔ مولانا شاہ نظن غازیپوری المتوفیٰ مولانا ظہیر، مولانا حسن نقشی، مولانا علی احمد نشانی وغیرہ کے فیض انوارسے جونپور اور اس کے مضافات علمی حیثیت سے بقعہ نور ہوگیا تھا۔ فرید خاں سوری جو بالآخر شیر شاہ سوری ہوا، اسی جونپور کے فیض کا خوشہ چین تھا۔ سیکڑوں مدارس قائم تھے۔ اور ہزاروں شتاقان علم کا جمگھٹ رہتا تھا جسکی نہایت تفصیلات سیر الملوک میں درج ہیں۔

حکومت شرقیہ کے زوال نے اگرچہ جونپور کو مستقر خلافت باقی نہ رکھا مگر اس کی ناقابل تسخیر علمی کو بھلول لودی کی فاتحانہ غارت گری بھی مٹا نہ سکی، اور جو باغ ابراہیم شرقی لگا گیا تھا۔ اس کو یہ زمین راس آئی کہ اب بھی آب و ہوا کے فیض سے سرسبز ہوتا رہا بلکہ سچ پوچھئے تو بابر سے لیکر اورنگ زیب کا زمانہ اس چمنستان کا موسم بہار تھا۔ اور عہد محمد شاہی تک برابر یہ دستور تھا کہ جو شخص جونپور کا عامل اس کو شاہان دہلی جونپور کے علماء اور اہل کمال کی سرپرستی کے لئے تاکیدی فرامین بھی کرتے تھے۔ بابر

۵۸۔ ان کے متعلق یہ خرق عادت مشہور ہے کہ جس پر ان کی نگاہ پڑ جاتی خواہ کسی مذہب کا ہو، بے اختیار اس کی زبان سے ملتِ اکبر نکل جاتا۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ العلماء۔ مترجم

کے عہد میں سید عبدالاول زید پوری المتوفی ۹۶۹ھ مصنف فیض الباری شرح صحیح بخاری اور حضرت قاضی خان ظفرآبادی المتوفی ۹۷۰ھ جیسے درخشاں علمی کواکب کا اجتماع مطلع جونپور کے لئے قرآن السعدین سے کم نہ تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کے آثار خیر و برکت نمایاں ہو گئے۔ اور وہ دور سعادت آگیا، جو علمی حیثیت سے جونپور کا عہد شباب ہے۔ مولانا عبدالرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ صاحب "رشیدیہ"۔ شیخ شاہ محمد فاروق المتوفی ۱۰۰۱ھ جد ملا محمود۔ ملا عبدالشکور قاضی جونپور۔ مولانا افضل جونپوری استاد ملا محمود المتوفی ۱۰۶۲ھ نے خود جونپور میں اور شاہ فضل اللہ جونپوری المتوفی ۱۰۵۰ھ نے برہان پور میں نئے آب و رنگ سے بزم علمی سجائی حضرت ملا محمود فاروقی جونپوری صاحب شمس بازغہ معاصر شاہجہان جنکے وجود پر نہ صرف جونپور اعظم گڑھ بلکہ تمام دنیائے اسلام بجا طور پر ناز کر سکتی ہے، اسی بزم کے گل سرسبد تھے تخمیناً ایک صدی بعد تک یہ محفل اسی سج دھج سے جمی رہی۔ ملا محمود ثانی جونپوری۔ ملا عبدالباقی۔ قاضی محمد حسین جونپوری یکے از مرتبین فتاویٰ عالمگیری۔ شیخ محمد ماہ۔ اور ان کے بھائی شیخ شمس الدین معاصرین عالمگیر۔ ملا نورالدین جونپوری اور ان کے تلمیذ خاص محمد افضل سید پوری۔ شیخ ابوالفتح اور ملا بابا جونپوری وغیرہم یکے بعد دیگرے رونق بزم بڑھاتے رہے ۱۱۳۰ھ میں جبکہ مغل حکومت کا آفتاب اقبال ڈھل چکا تھا۔ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ اس نے صوبہ الہ باد کے اکثر شہروں مثلاً کڑا مانک پور جہان آباد، جونپور اور بنارس کو اپنے حدود حکومت میں شامل کرلیا۔ اور قدیم علمی خاندانوں کی معافیاں ضبط کرلیں مجبوراً علماء کی اولاد نے درس افتاء کی مسند چھوڑ کر سپہگری اور شہسواری کا میدان اختیار کیا۔ اس کے بعد ۱۱۵۹ھ میں سعادت خاں کا بھانجہ صفدر جنگ الہ باد کا صوبہ دار ہوا۔ اس نے رہی سہی معافیوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ آل تیمور کی بداقبالی اس سے زیادہ کیا ہوتی کہ "دشمن ارباب ہنر" احمد شاہ کے عہد میں صوبہ داری سے گزر کر وزارت کا قلمدان سنبھالتا ہے اور اس کا نائب بچے کچھے وظیفہ داروں کو بھی مشاغل سے سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیتا ہے اس طرح علم و دانش کا وہ چمن جس کو اب تک نامور اسلاف کی شاہانہ اولوالعزمیوں نے سرسبز رکھا تھا بجنبش

خلافت کی غفلت شعاریوں اور اس کے نااہل عمال کی ستمکاریوں سے تاراج خزاں ہو کر رہ گیا۔

یہ سب ہوا لیکن پورب اور بالخصوص جونپور و مضافات۔ جونپور کا خطہ پھر بھی اہل علم سے خالی نہ ہو گا جیسا کہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں"۔ باوجود ایں خرابی بازار رواج علم خصوص معقولیت بکیفیتے کہ آنجا است در قلمرو ہندوستان ہیچ جانب ہنوز علمائے فحول جدید طراز ندویہ وصول اقصیٰ مراتب کمال انتشار ند" ابھی ایک صدی تک یہ خطہ دارالعلم کہلاتا تھا۔ چنانچہ صاحب سبحۃ المرجان نے جہاں جونپور کا ذکر کیا ہے۔ وہاں جونپور کے ساتھ "دارالعلم" کا لقب جو شہرت عام نے دے رکھا تھا مجبوراً استعمال کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو دیار مدتوں تک ملک العلماء شہاب الدین، سید شہید اللہ، ملا ل، مولانا الہداد، مولانا عبدالرشید اور ملا محمود جیسے شموس کمال کا جلوہ گاہ رہا ہو۔ وہاں دور تک اور دیر تک تاریکی اپنا قدم جما نہیں سکتی اور طلب علم کا مشغلہ بآسانی سرد نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں خوش قسمتی سے ملا محمود کو جونپور اور آستانہ کیرا و لتیپور سے یکساں خاندانی تعلقات تھے اور رشتہ داریاں زیادہ تر جونپور، اعظم گڈھ اور غازی پور کے دیہاتوں میں تھیں۔ اس لئے دئے سے دیا جلتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ یہ پورا خطہ چراغاں ہوتا رہا۔ اور ملا محمود کا خانوادۂ علمی تو آج تک اس خصوصیت میں ممتاز چلا آتا ہے۔ چنانچہ ہمارے موجودہ چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان فاروقی اسی دودمان دانش کے چشم و چراغ ہیں۔ بڑی خوش نصیبی اس خطہ کی یہ تھی کہ یہ تاجداران کمال بوریائے فقر کی بدولت حکومت کی چشم کرم سے بے نیاز تھے اور کسی صوبہ دار کا رد و بدل ان کے چشمۂ فیض کو خشک کر نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں جو ارباب فضیلت اس خطہ سے اٹھے، ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً سب کے سب ایسے ہی گوشہ گیران قناعت تھے۔ شاہ شمس العارفین کرہانی۔ قاضی منصور عباسی چریا کوٹی المتوفی ۱۱۷۱ھ شاہ ابوالغوث گرم دیوان فاروقی بھیروی المتوفی ۱۱۷۹ھ اور ان کے بھتیجے حافظ ابواسحاق بھیروی قاضی غلام مخدوم چریا کوٹی المتوفی ۱۲۰۵ھ مولانا محمد احسن چریا کوٹی شاگرد حضرت ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ۔ قاضی عبد الصمد چریا کوٹی۔ مولانا علی عباس چریا کوٹی

شاہ کریم اللہ غازی پوری۔ مولانا لطف اللہ غازی پوری مصنف تفسیر مظہر العجائب اور عین الفیوض
سخاوت علی جونپوری جن کے فیضان تعلیم سے ہندوستان کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے۔ ہمیشہ تقرب
ت سے دامن بچاتے رہے۔ مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ کے خلوص، ایثار اور مقدس نمونہ زندگی نے
طراف میں بدعات کے قلع وقمع اور علوم و معارف دینی کی اشاعت میں وہ کام کیا جو شاید بڑی بڑی
مجموعی کوشش سے ممکن نہیں ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں حاجی شیخ امام بخش صاحب رئیس اعظم جونپور
نہ ہمارے موجودہ نواب سر محمد یوسف کے مورث تھے۔ علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا، اور ایک
نفعت زمینداری اس کے مصارف کے لئے وقف کردی۔ اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ عموماً مسلم الثبوت
فن ہوتے رہے مثلاً مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولانا ہدایت اللہ خاں
ری وغیرہ۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر جونپور، اعظم گڈھ، اور غازی پور کا خطہ موجودہ مغربی تمدن کے
تک علوم قدیمہ کا گہوارہ رہا۔ اور مذاق علمی کی برقی رو خواص سے گذر کر عوام تک میں سرایت
اکثر ذی استطاعت اشخاص نے اپنی اپنی جگہ پر مدارس قائم کئے۔ ازانجملہ علامہ مرحوم کے بزرگوار
شیخ حبیب اللہ مرحوم نے جو ایک نامور وکیل اور اولوالعزم رئیس تھے اعظم گڈھ میں بھی ایک
قائم کیا۔ جس میں ابتداءً مولانا سخاوت علی مرحوم کے شاگرد مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم
قصبہ مئو مدرس اعلیٰ تھے۔ بعد کو انکی جگہ پر بقیۃ السلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی
ئ محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مدرس ہوئے۔

علامہ شبلی مرحوم نے درسیات کی تحصیل اسی مدرسہ میں کی اور ان ہر دو اساتذہ کے خرمن فیض سے
ینی کی، لیکن مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم سے کچھ دنوں تک صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں
یں۔ بقیہ تمام درسیات کی تکمیل مولانا محمد فاروق صاحب سے کی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ادبیات
ن صحیح اور نقد وجہابذ کا ملکہ جو علامہ مرحوم کے کمال علمی کا سب سے زیادہ نمایاں جوہر ہے۔ اس کی

ابتدائی نشوونما مولانا فاروق ہی کی تربیت کا فیض تھا۔ اس طرح پر علامہ مرحوم کی ذات گویا جونپور کے صحیفہ کمال کی آخری آیت تھی۔ اس کے بعد علوم مشرقیہ کی بزم ہی برہم ہو گئی اور دور فلک نے وہ نظام ہی فنا کر دیا جس سے اب پھر ایسے جواہر ریزوں کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکے۔

حیف کہ آں مطرب و ساقی نماند
بوئے از آں میکدہ باقی نماند

ایک دو حاشیہ نشینان بساط جنھوں نے ہنگامہ دوشیں کا آخری سماں دیکھا تھا وہ بھی اب خواب عدم میں ہیں۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

(باقی)

فاران کا دور جدید

فاران ایک علمی، مذہبی اور تاریخی رسالہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ سال سے دفتر مدینہ سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ فاران عام طور پر مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بہت پسند کیا گیا۔ اب تک فاران کی جو قیمت تھی گو وہ رسالہ کی خوبیاں دیکھتے ہوئے زیادہ نہ تھی لیکن اب اس کے حلقہ اشاعت کو ترقی دینے اور عام مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ رسالہ کی عام افادی خوبیوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ اب تک قیمت سالانہ ۳ سے اور بیرون ہند سے للعہ تھی۔ اب ۱۵ جون سے ۲ اور ۲ کر دی گئی ہے امید ہے کہ مسلمان اس کی اشاعت کو اشاعت علم و دین تصور کر کے توسیع کی کوشش فرمائیں گے۔ نمونہ مفت

پتہ:- محمد مجید حسن۔ مالک رسالہ فاران بجنور (یوپی)

ادبیات

دعا

از

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا اعظم گڑھی

تجھے تیری قسم یا رب فغانِ بینوا سن لے
خداوندا شکستِ شیشۂ دل کی صدا سن لے

یہی ہے بارگاہ کبریا میں التجا میری
تری خدمت میں ہے کچھ عرض اربابِ وفا سن لے

دعا ہائے سحرگاہی کو اذن باریابی دے
زبانِ چاکِ دل سے نالۂ درد آشنا سن لے

مرے شب ہائے غم کی خلوتیں معمور ہیں جس سے
وہ فریادِ حزیں سن لے وہ آہِ نارسا سن لے

یہی چند اشکِ رنگیں ترجمانِ قصۂ غم ہیں
بہت ہی مختصر ہے داستانِ ابتلا سن لے

ستم ہائے عدو کی میں کہاں فریاد کرتا ہوں
میں کب کہتا ہوں مجھ سے جورِ گردوں کا گلہ سن لے

مجھے فریاد کرنی ہے خود اپنے دیدہ و دل کی
قیامت ڈھا رہے ہیں خود جو اپنے دست و پا سن لے

تو خود دانا و بینا ہے، مگر میری زباں سے بھی
دلِ مظلوم پر جو کچھ گزرتی ہے ذرا سن لے

دعا اک ربطِ روحانی ہے آقا اور بندے میں
زباں سے میری یا رب میرا حرفِ مدعا سن لے

پریشاں ہو رہا ہے ہند میں شیرازۂ ملت
پراگندہ ہے حالِ امتِ خیر الوریٰ سن لے

کہاں وہ شیوۂ صدق و صفا اب تیرے بندوں میں
مسلمانوں کے باہم شکوۂ جور و جفا سن لے

ادا ہوتا تھا کل تک کلمۂ حق جن زبانوں سے
نکلتا ہے انھیں سے آج حرفِ ناسزا سن لے

قیامت ہے یہ رسوائی علی الاعلان ہوتی ہے لب مسلم سے خود مسلم کو کافر بر ملا سن لے

رہے گی آہ مظلومان ملت بے اثر کب تک کبھی تو دردمندوں کے دلوں کی آہ و فغاں سن لے

کہاں تک یہ نوائے دردِ غم یہ نالۂ پیہم دعا ہے اب یہی اے خلق کے حاجت روا سن لے

مسلمانوں کو مست بادۂ صدق و صفا کردے

شراب کہنۂ یثرب کا پھر ذوق آشنا کردے

تلخیصات

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ شبلی نعمانیؒ "الندوہ" بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں استاذ امام علامہ فراہی کی تصنیف "جمہرۃ البلاغہ" کے تعارف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"عام قیاس یہ ہے کہ صاحب کمال کسی حال میں گمنام نہیں رہ سکتا۔ تجربہ اور تاریخ بھی اسکی شہادت دیتے آئے ہیں۔ لیکن کوئی کلیہ مستثنیٰ سے خالی نہیں۔ مولوی حمید الدین جن کی ایک عجیب وغریب تصنیف کا اس وقت ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں اس استثنا کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ مولوی صاحب موصوف نے پہلے قدیم طریقہ کے موافق تعلیم پائی یعنی درس نظامیہ کے مطابق فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر مولینا فیض الحسن صاحب شارح حماسہ، جو میرے بھی استاد ہیں، ادب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد انگریزی شروع کی اور مدرسۃ العلوم میں رہ کر بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ زمانہ طالب العلمی ہی میں سرسید مرحوم کے حکم سے انھوں نے سیرت نبوی کے متعلق دو کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیں جو مدرسۃ العلوم کے نصاب دینیات میں شامل ہیں۔ اور چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ مدرسہ سے نکل کر کراچی کے مدرسۃ الاسلام میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور اب تک اسی عہدہ پر ہیں۔ ان کا فارسی دیوان شائع ہو چکا ہے۔ لارڈ کرزن جب سواحل عرب کی مہم پر گئے تھے تو یہ بھی ساتھ تھے۔ اور سرداران عرب کے سامنے عربی زبان میں لارڈ کرزن کی طرف سے جو تقریر پڑھی گئی تھی وہ انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ بھی انسان کی شہرت کے لئے کافی ہو سکتا ہے، لیکن مولوی صاحب اب بھی گمنام ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہے

اور اگر وہ اس خواہش میں کامیاب رہیں تو ہمارا کوئی ہرج نہیں۔"

امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں۔

"مولینا حمید الدین مرحوم جنکی عبارت پر یہ ہنگامہ برپا کیا گیا ہے، ان علمائے حق میں سے تھے جنکا سرمایۂ امتیاز صرف علم ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل بھی ہوتا ہے۔ اور اس دوسری جنس کی کمیابی کا جو عالم ہے، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں جب کبھی ان سے ملا مجھ پر ان کے علم سے زیادہ ان کی عملی پاکی کا اثر ہوا وہ پورے معنوں میں ایک متقی اور راست باز انسان تھے۔ ان کے دل کی پاکی اور نفس کی طہارت دیکھکر رشک ہوتا تھا۔"

حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں۔

"مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحت اعتقاد اور زہد و تقوی کے لحاظ سے خواص امت میں تھے۔"

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار لکھتے ہیں۔

"مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ انھوں نے جس دقت نظر کے ساتھ قرآن کریم کا مطالعہ کر کے قرآن کریم کے مضامین تعلیم اور اس کے اسلوب بیان اور طرز ادا کو جس عنوان سے قوم و ملت کے سامنے پیش کیا ہے اس کا ثمرہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کلام ربانی ہے اور تمام لفظی اور معنوی عیوب و نقائص سے پاک ہے۔"

مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی صدر مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، لکھتے ہیں

"مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ان علمائے کرام میں ہیں جنھوں نے اسلام خصوصاً قرآن پاک کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں"۔

عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شیروانی نے حضرت استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی خدمت میں جو تعزیت نامہ ارسال فرمایا تھا اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھکو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے۔ علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا۔ پھر حیدرآباد میں .... علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شغف جاری تھا، روزانہ ۳ بجے شب سے صبح کے ۹ بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے۔ اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی مدد سے مطالب قرآنیہ کا حل خاص کر پیش نظر تھا۔"

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے استاذ امامؒ کی وفات کے بعد معارف بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں ان کی سوانح حیات پر جو مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے اس میں لکھتے ہیں۔

"اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے جن کی ولادت اور نشوونما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی۔ آج سب سے پہلی دفعہ ہم نے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں۔ ہم ایک ایسے گرکوٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا۔ لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم و فہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے

علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کہا اور لکھا وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی جس نے فلسفہ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنھوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی اور بی اے اور ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی سندیں حاصل کیں لیکن اسطرح کہ

جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا نکھار اور بڑھ گیا تھا۔ اور اسے دیکھ کر سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجوٹ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھکر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے۔ مگر وہ وہ تھی جو اپنے زمانہ میں کوئی نہیں تھا۔

مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی، اپنے رسالہ اردو کی اشاعت جولائی ۱۹۳۶ء میں فرماتے ہیں۔

"مولانا حمید الدین بے مثل ادیب تھے اور فارسی اور عربی زبانوں پر انھیں حیرت انگیز قدرت تھی اور دونوں زبانوں کے نہایت فصیح شاعر اور نثار تھے۔ اگر وہ ادب کی طرف توجہ کرتے تو ایسی یادگار چھوڑ جاتے، جو ہمارے ادب کے لئے مایۂ افتخار ہوتی لیکن ان کا فطری میلان دوسری جانب تھا وہ قرآن پاک کے دلدادہ ہی نہیں تھے بلکہ اس کے نکات و معانی جس طرح وہ سمجھتے تھے شاید ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو، اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ عربی لغت اور ادب پر انھیں کامل عبور تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے

ری توجہ ترتیب و نظام قرآن کی طرف مبذول کردی تھی جس سے ان کی وسعت نظر اور تحقیق و تدقیق کامل کا
یت ملتا ہے۔ یہ انکی ساری عمر کی محنت اور کاوش کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے قرآن مجید پر ہر پہلو سے غور کیا تھا اور کوئی نکتہ
بانہ تھا جو ان کی نظر سے بچا ہو۔ علاوہ تفسیر نظام القرآن کے مفردات قرآن، نحو قرآن، اسلوب قرآن، حکمت قرآن
ض کہ ہر عنوان اور ہر پہلو پر تحقیق کی تھی“

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ترجمان القرآن جلد ۸ نمبر ۱ میں لکھتے ہیں:۔

”علامہ فراہی ایک بڑے درجہ کے محقق تھے انھوں نے اپنی تفسیروں میں تحقیق کا ایک خاص مجتہدانہ
لوب اختیار کیا ہے۔ جو دوسرے مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس اسلوب خاص سے انھوں نے
طالب اخذ کئے ہیں اور آیات کے جو معانی متعین کئے ہیں ان میں اختلاف کی ویسی ہی گنجائش ہے جیسی
سرے مفسرین کے نتائج تحقیق میں لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ناظر کے زاویہ نظر
یع کرتا ہے اور قرآن مجید کے معانی و مطالب سمجھنے کے لئے تحقیق و تفحص اور مواد علمی کے وسیع تر میدانوں کی طرف
ی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی شخص ان کے نتائج تحقیق سے کلی اتفاق نہ رکھتا ہو مگر وہ ان کی
فات میں ایسے بیش قیمت علمی فوائد پاتا ہے جن سے کوئی طالب العلم بے نیاز نہیں ہوسکتا“

”رسالہ فاران بجنور اپریل کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

”علامہ فراہی مرحوم ان مخصوص لوگوں میں تھے جن پر فہم قرآن کی راہیں کشادہ ہوئیں۔ اور جن کو
ب الٰہی کے مزاج میں دخل حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بلا شبہ موجودہ دور میں دنیائے اسلام کے
ر قرآن کا ماہر مرحوم سے بڑھکر اور کوئی نہیں گذرا۔ آپ کو عربی زبان پر پوری بصیرت اور کتاب الٰہی کے فہم
ے ذہنی بلوغ اور علمی کمال حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کا انداز بیان مجتہدانہ تحقیق نہایت گہری اور مدبرانہ

اور اسلوب بیان نہایت دلکش اور عالمانہ ہے۔"

مصحف جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس ماہ مئی کی اشاعت میں رقمطراز ہے۔

"علامہ حمید الدین فراہی نور اللہ مرقدہٗ کی بلند پایہ شخصیت اپنے علمی تبحر، دقت نظر اور بلندی نکر بالخصوص حقائق قرآنی و معارف فرقانی کی دستگاہ کے اعتبار سے اہل علم و فضل میں کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں موصوف اس دور کے بہترین مفسر قرآن تھے۔ جن میں بیک وقت علوم عربیہ کے ساتھ ساتھ فنون جدیدہ اور معارف عصریہ بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ اور نہ صرف علم ہی کے لحاظ سے بلکہ عمل صالح اور تقویٰ کے اعتبار سے علامہ مرحوم کا وجود اپنی آپ نظیر تھا۔"

رسالہ بلاغ امرتسر اپریل ۳۶ء میں لکھتا ہے۔

"علامستان ہند میں مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی "کتاب کریم" کا اعجاز ہے۔ باوجود یکہ روایتی اثرات سے یکسر پاک نہیں تھے تفسیر قرآن میں سلامت روی اور سنجیدگی کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ آپ کا عبور و تبحر مسلم ہے۔ آپ کے مولفات میں مولویانہ طرز تحریر کی بو بھی نہیں پائی جاتی۔ آپ قرآن مجید میں اس قدر محو معلوم ہوتے ہیں کہ نگارش تفسیر کے وقت آپ کو نہ اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے نہ کوئی مخالف نظر آتا ہے جس کی تردید و تکفیر کے لئے اپنا زور قلم دکھائیں۔"

مولانا عبدالماجد بی۔ اے دریابادی ۱۱ر فروری ۳۶ء کے صدق میں لکھتے ہیں۔

"علامہ حمید الدین فراہیؒ اس دور میں، علوم قرآنی کے لحاظ سے، امام وقت تھے۔ لکھ جانے کی جتنی عمر تو تھی، اس کے مساعد تو حالات نہ ہوسکے۔ پھر بھی عربی میں جتنا تحریر فرما گئے ہیں، وہ بھی اچھا خاصہ ذخیرہ ہے

خدمت قرآن کے مدعی تو بہت ہیں، لیکن مولانا اپنی دقت نظر، عمق فکر، حکیمانہ ژرف نگاہی، علم و فضل، تبحر ادبی اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھے۔"

مدینہ بجنور اپنی ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"حضرت علامہ حمید الدین فراہی مرحوم اس دور میں کتاب الٰہی کے جلیل القدر مفسر، قرآنی معارف کے فقید المثال حامل اور اجتہاد و بصیرت کے بے نظیر نمونہ تھے۔ آپ کو قرآن کریم سے جو عشق و لگاؤ تھا اس نے آپ پر فہم قرآن کی راہیں کھول دی تھیں اور آپ کا دل و دماغ الفرقان کی ضیا پاشیوں سے منور ہو چکا تھا۔ جن لوگوں نے مرحوم کے تفسیری اجزا پر نظر ڈالی ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کو قرآنی علوم کے بحر لا ساحل سے کتنا وافر حصہ ملا تھا اور کتاب الٰہی کے اسرار آپ پر کس حد تک منکشف ہو گئے تھے۔"

ہفتہ وار استقلال دیوبند ۵ محرم ۱۳۵۵ھ میں رقمطراز ہے

"علامہ حمید الدین فراہی دور حاضر کے مایہ ناز مفسر اور علوم قرآنیہ کے یگانۂ عصر فاضل تھے۔"

جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان الجمعیۃ ۲۴ جولائی کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور ان مخصوص بزرگوں اور کتاب الٰہی کے عاشقوں میں سے ایک تھے جن پر جناب الٰہی سے فہم قرآن کی راہیں کشادہ ہوئیں اور سعادت ازلی نے جن کو قرآن کریم کے اسرار و حکم کا عارف کامل بنایا، مرحوم نہ صرف اللہ کی پاک اور روشن کتاب کے عاشق ہی تھے بلکہ عربی زبان، عربی ادبیات اور عربی علوم و آداب کے ایک زبردست اور فقید المثال عالم بھی تھے۔ آپ نے قرآن کریم کا مطالعہ یونان کے ناپاک فلسفہ کی عینک لگا کر نہیں بلکہ اس روشنی کی مدد سے کیا جو مخصوص بندوں کو مبدء فیاض سے عطا کی جاتی ہے۔ اور جس کی مدد سے قرآن کو قرآن ہی کے ذریعہ سمجھنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے

مرحوم کی علمی قابلیت اور معرفت کتاب الٰہی کے متعلق دنیائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنی فکری صلاحیت، اجتہادی بصیرت اور قرآن کی معرفت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ بلاشبہ مرحوم کی بے پناہ قابلیت کا اندازہ ابھی ان کی قرآنی تصانیف اور اجزائے تفسیر سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم کی نسبت جو کہا گیا وہ شائبۂ مبالغہ سے قطعاً پاک ہے۔

مرحوم کی علمی اور قرآنی قابلیت کے جو معترف آج بقید حیات ہیں (متعنا اللہ بطول حیاتہم) انہیں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ سید سلیمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مرحوم علامہ شبلی ان کی تعداد قرآنی سے تاحیات بہرہ اندوز ہوتے رہے۔ اور ہم جیسے جید اور مفکر علماء ابتک ان کی بے نظیر تصنیف "امعان فی اقسام القرآن" کو حیرت اور استحسان کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اللہ تعالیٰ خدمت قرآن کی برکت سے مرحوم پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اور ان کے علوم و اجتہادات سے مسلمانوں کو بہرور ہونے کی توفیق دے۔"

رسالہ فاران بجنور ماہ اگست کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"راقم الحروف نے اگرچہ علامہ شبلی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن ان کے اسلامی درد و محبت کے افسانے ان کے جاننے والوں سے سن چکا ہے اور مولانا حمید الدین کی زندگی کے آخری چند سال تو اس کی نظروں کے سامنے گذرے ہیں اور اسے مدتوں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مولانا کے زہد و تقویٰ اور ان کے اسلامی درد و محبت اور شیفتگی کا جو عالم سالہا سال تک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا ہوں۔ وہ مجھے اس اقرار پر مجبور کرتے ہیں کہ مولانا نہ صرف اپنے علم و فضل کے اعتبار سے فقید المثال اور یکتائے زمانہ تھے بلکہ اپنی صحت اعتقاد اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ ارفع اور اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ ممکن ہے اس اعتراف کو آپ ایک بے تمیز اور کور نظر کے حسن ظن یا بے خبری کا نتیجہ قرار دیں۔ لیکن کتنے اہل دل اور اہل نظر ہیں جو مولانا حمید الدین کو تقویٰ و تقدس کے لحاظ سے خدا رسیدہ بزرگوں اور خواص امت میں شمار کرتے ہیں۔"

جامعہ دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"مولانا عبدالحمید مرحوم اس آخری دور میں نہ صرف قرآن کے ایک اچھے مفسر تھے بلکہ قرآن فہمی کی امامت ان پر ختم تھی انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اسی کتاب کریم کی خدمت میں صرف کیا۔ وہ ربط آیات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں۔ اور قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے ہیں۔ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا زیادہ تر عربی میں لکھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے انھوں نے قرآن کے ایک معتد بہ حصہ کی تفسیر چھوڑی ہے بعض بعض اجزا کی تفسیریں ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے تھے جو ہندوستان سے مصر اور عرب تک پہنچے۔"

"ترجمان القرآن حیدرآباد دکن۔ جمادی الآخری ۱۳۵۴ھ و جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کی اشاعتوں میں رقمطراز ہے۔ مرحوم کی شخصیت اس سے بالاتر ہے کہ اس کا تعارف کرانے کی حاجت ہو۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ متاخرین میں قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لحاظ سے بہت کم لوگ اس مرتبہ پر پہنچے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو سرفراز فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کلام اللہ کے معانی میں صرف کیا اور عربی زبان میں ایک ایسی محققانہ تفسیر لکھی جس کی نظیر متقدمین کی تصنیفات میں بھی کم ملتی ہے۔"

جس نے مسلسل چالیس برس تک قرآن مجید کی خدمت کی جس نے معارف قرآنی کی تحقیق میں سیاہ بالوں کو سفید کیا۔ جس کی تفسیروں سے عرب و عجم کے ہزاروں مسلمانوں میں تدبر فی القرآن کا ذوق پیدا ہوا۔ جس کی تحریروں کا ایک ایک لفظ گواہی دے رہا ہے کہ وہ قرآن کا عاشق ہے۔ اور اس کے لفظ لفظ پر جان نثار کرتا ہے۔

ہفتہ وار سہیل علیگڑھ ۱۳ جولائی کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔

"مولانا حمیدالدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن جس سے بڑا ان کی زندگی میں پوری دنیائے اسلام میں قرآن کا کوئی عالم نہیں تھا جس نے تیس برس کامل قرآن کے تدبر و تفکر اور غور و فکر میں گذارا تھا۔ جو نماز اس خضوع و خشوع اور توجہ و انابت کے ساتھ پڑھتا تھا کہ دیکھنے والوں کو بس خدا یاد آجاتا تھا۔ جو قرآن کا حافظ، زاہد شب زندہ دار اور تہجد گذار تھا۔ جس کی عربی دانی پر مصر و شام کے علماء اور ادباء کو رشک تھا۔ جو نحو و صرف، معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، کلام و مناظرات، فقہ و حدیث ہر چیز کا امام تھا۔ جس کو تمام علوم اسلامیہ و دینیہ میں اجتہاد کا مقام حاصل تھا۔"

تقریظ و تبصرہ

ایشیا مصور ۔ مرتبہ جناب ساغر نظامی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ، حجم ۸۰ صفحات ۔ کتابت و طباعت نظر فریب ۔ کاغذ معمولی قیمت سالانہ چھ روپے ششماہی ۳ روپے ۔ طلباء و قومی اداروں سے للعہ ملنے کا پتہ :۔ ادبی مرکز ، گھنٹہ گھر ، میرٹھ ۔

یہ ایک ادبی مصور ماہنامہ ہے جو جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب کی زیر سرپرستی ، در ملک کے مشہور ادیب اور قومی شاعر جناب ساغر نظامی کی ادارت میں میرٹھ سے شائع ہوتا ہے ۔ ساغر صاحب کی ذات دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ۔ وہ ایک خاص طرز کے مالک ہونے کی وجہ سے ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں ۔ ان کے جذبات و خیالات میں قومی درد کی گھلاوٹ ہوتی ہے ۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے ہیں اس کی محرک ملک کی موجودہ فضا ہوتی ہے یا مناظر قدرت ان کی زبان صحیح معنوں میں کانگریس کی منظور کردہ ہندوستانی ہے ۔ ان کی متعدد نظمیں کانگریس کے پلیٹ فارموں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ آج سے چند سال قبل "پیمانہ" کے نام سے آگرہ سے ایک ادبی رسالہ نکالتے تھے اب وہی پیمانہ ترقی کرکے "ایشیا" کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے ۔ ہمارے پیش نظر دوسری جلد کا پہلا نمبر ہے جس میں ۲۳ - ۲۴ مضامین نثر و نظم اور ۸ سہ رنگی و یک رنگی فوٹو بلاک کی تصویریں ہیں ۔ موجودہ ادبی رسائل کی صف میں "ایشیا" کے مضامین اور تصویروں کا معیار کافی بلند ہے ۔ سقراط کی موت کے عنوان سے "فیڈو" کا ترجمہ کئی ماہ سے مسلسل شائع ہو رہا ہے ۔ اگر یہ ترجمہ مکمل ہو جائے تو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا ۔ ایشیا کے اولین مقصد "آزادی رائے اور آزاد قومی ادب کی نشر و اشاعت" کے لحاظ سے پنڈت جواہرلال نہرو صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے خطبہ صدارت کا مکمل ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے ۔ آخر کے چند صفحات میں نگارستان کے ماتحت علم و ادب کے متعلقات پر تبصرہ کیا جاتا ہے ۔ اگر مضامین کے

انتخاب میں ذرا احتیاط اور دقت نظر سے کام لیا جائے اور موجودہ کاغذ کے بجائے کوئی عمدہ کاغذ لگایا جائے تو بہت جلد "زینہ یا" ملک کے موقر ادبی رسائل کی صف میں ایک بلند مقام حاصل کرلیگا۔

بلاغ خواجہ نمبر ۔ زیر ادارت شہباز کاشمیری۔ ایم۔ اے رحمٰن علی بی۔ اے تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۹۴ صفحے قیمت سالانہ ۳ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر امت مسلمہ چوک لاہوری دروازہ۔ امرتسر

رسالہ بلاغ پر کسی گذشتہ صحبت میں مفصل تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ پیش نظر نمبر جماعت امت مسلمہ کے بانی، فرقہ اہل قرآن کے پرجوش مبلغ اور بلاغ کے سرگرم مفسر جناب خواجہ احمدالدین صاحب مرحوم کے نام سے موسوم ہے۔ خواجہ صاحب موصوف عہد حاضر کے اکابر منکرین حدیث میں تھے وہ قرآن کو ہر لحاظ سے تمام ضروریات دین کے لئے کتنی و مہیمن سمجھتے تھے۔ اور اسی نظریہ کے ماتحت ایک نئے انداز سے تفسیر لکھ رہے تھے۔ جس کا بیشتر حصہ چھپ کر شائع ہوچکا ہے۔ آخر کے صرف چند پاروں کی تفسیر باقی تھی کہ صاحب تفسیر نے وفات پائی۔

خواجہ صاحب کی وفات کے بعد کارکنان بلاغ اور ان کے ہم خیالوں نے ان کی سوانح حیات ترتیب دی ہے، جو اس خاص نمبر میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں خواجہ صاحب کے تمام علمی، عملی، اصلاحی، تحقیقی اور مناظرانہ کارناموں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور تقریباً ۳۸ عنوانات کے ذیل میں انکی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ خاص نمبر اس حیثیت سے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا کہ اس میں ایک جدید فرقہ کے بانی اور دور حاضر کے منکرین حدیث کے سرخیل کے حالات ہیں۔

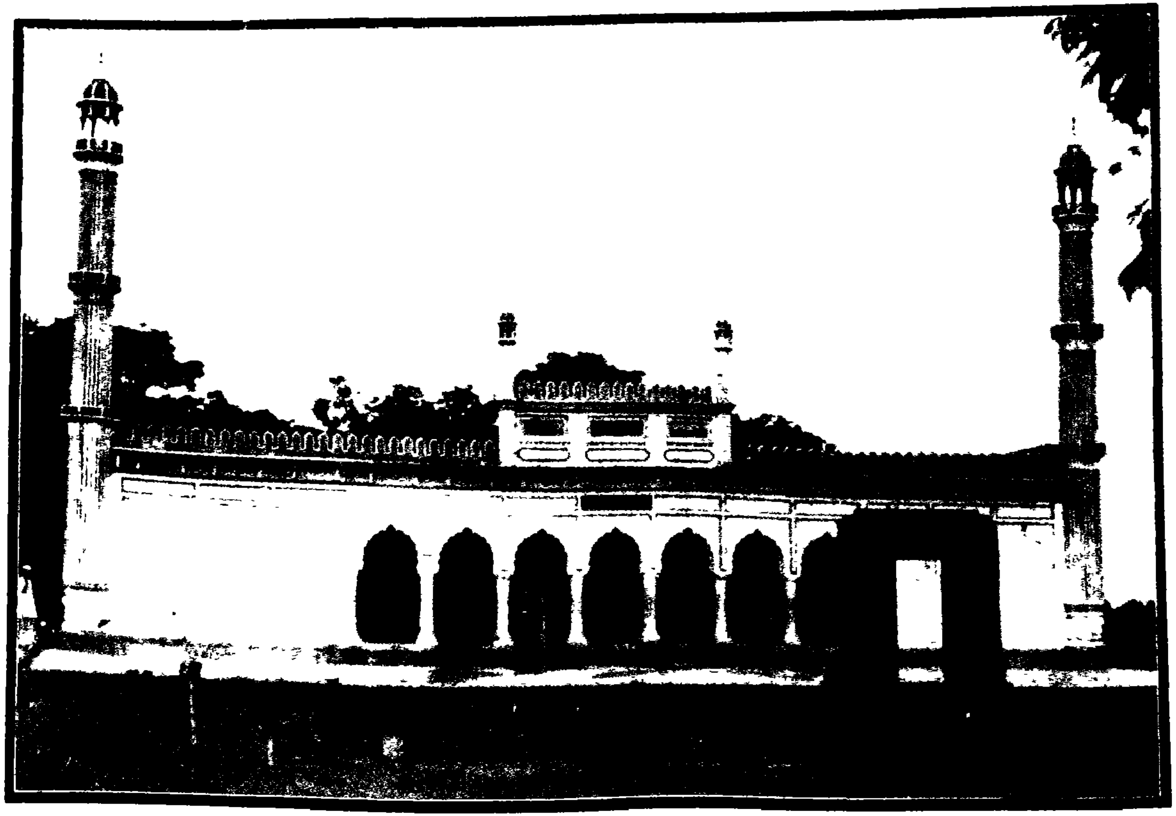
الفرقان :۔ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۵۲ صفحات کتابت وطباعت روشن کاغذ عمدہ قیمت سالانہ باعتبار اختلاف کاغذ ۳ روپے و ۲ روپے ملنے کا پتہ دفتر الفرقان۔ بریلی۔

یہ ایک خالص مذہبی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد شرک و بدعت کا استیصال اور مسلمانوں کی موجودہ معاشرتی و تمدنی خرابیوں کی اصلاح ہے۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر دو ڈھائی سال سے مسلمانوں کی

مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ مذہبی و اصلاحی مقالات کے علاوہ دیوبندی اور بریلوی جماعت کے مابین جو مذہبی مناظرے ہوتے ہیں ان کی مفصل روداد یں بھی اس میں ماہ بماہ بالالتزام شائع ہوتی ہیں۔ ہم کو اتنے حصہ سے اختلاف ہے۔ اگر ..... فان کے صفحات ان جھگڑوں سے آلودہ نہ ہوں تو ہمارا خیال ہے وہ اس سے زیادہ مفید خدمات انجام دے سکے گا۔ افادہ عام کے خیال سے اس کے دو اڈیشن شائع کئے جاتے ہیں۔ جن میں صرف کاغذ کا معمولی فرق ہوتا ہے۔

طبیہ کالج میگزین۔ زیر ادارت جناب مرزا غلام علی خاں ملوانی، جناب شبیر امام اصلاحی تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۴۸ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت سالانہ عہ ششماہی ۱۲ طلبا سے سالانہ ۱۲ ششماہی ۸ ملنے کا پتہ: طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

آج کل جو طبی رسائل شائع ہوتے ہیں ان کا معیار عموماً پست ہے۔ زیادہ تر ان کا تعلق کسی نہ کسی خاص دواخانہ سے ہے اس لئے ان کو مضامین سے زیادہ دواخانوں کی فہرست اور خاص خاص دواؤں کے اشتہارات کی اشاعت .... انہماک ہے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ طبیہ کالج میگزین اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے یہ رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دیگر رسائل کی طرح اپنی صف میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ طب اور اس کے متعلقات پر ہر ماہ بیش قیمت علمی اور تحقیقی مضامین پیش کرتا ہے۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ملک کے نامور اساتذۂ طب اور ماہر فن ڈاکٹروں کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس لئے اس کے مضامین کا معیار بلند ہے۔ خاص خاص مباحث کو سمجھانے کی غرض سے ایک آدھ فوٹو بلاک کی تصویریں بھی ہر ماہ میں شائع کی جاتی ہیں۔ غرض یہ رسالہ اپنی صوری و معنوی حیثیت سے قابل قدر ہے



مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ کی زیر تعمیر مسجد جسکی تکمیل کیلئے قوم سے اپیل کی گئی ہے ۔

جلد ۱ | ماہ شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۶ء | نمبر

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۲ - ۸

باب التفسیر

تفسیر سورۃ العصر	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۹ - ۱۹

معارف قرآن

تفسیر قرآن (۸)	امین احسن اصلاحی	۲۰ - ۲۶
مصدقا لما بین یدیہ کی صحیح تاویل	بدر اصلاحی	۲۷ - ۴۰
اقسام قرآن	جناب مولوی حافظ عبد الاحد صاحب اصلاحی	۴۱ - ۴۷

مقالات

سیرت شبلی (۲)	جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل وکیل	۴۸ - ۵۵

ادبیات

نظم	جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل وکیل	۵۶ - ۵۷

تلخیصات

پیشہ	ع - ر ناصر	۵۸ - ۶۳
حقیقی آزادی کیا ہے؟	ع - ن	۶۴

شذرات

جلسہ مدرستہ الاصلاح اعلان کے مطابق ۱۱-۱۲-۱۳ نومبر ۱۹۳۶ء کی تاریخوں میں مدرستہ الاصلاح کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ تینوں روز تک یہ حال رہا کہ مدرستہ کے وسیع میدان کے جس گوشہ کی طرف نگاہ اٹھتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ اس جلسہ کی شرکت کے لئے لوگ دور دراز اضلاع سے زحمتِ سفر برداشت کرکے آئے تھے۔ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ مختلف نشستوں میں مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی، مولانا قمرالدین صاحب قمر اعظمی، مولانا قاری عبدالمجید صاحب مظفرپوری، مولانا وحید احمد صاحب، مولوی اسمٰعیل صاحب اصلاحی، مولوی امام الدین صاحب بنارسی کے مواعظ وخطب ہوئے۔ حضرت سید صاحب قبلہ صحت کی کمزوری کی وجہ سے کوئی مفصل خطبہ نہ ارشاد فرما سکے تاہم اُن کے مختصر نصائح سے حاضرین کو دو تین بار مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ان کا آخری وعظ خصوصیت کے ساتھ نہایت موثر اور دلنشین تھا۔ مدرسہ کے طلبہ میں سے عبدالرحمٰن ناصر (درجہ ۶)، قاضی بدرالدین گیاوی اور قمرالدین (درجہ ۵) نے تقریریں کیں۔ علمائے کرام اور عام حاضرین سب نے بالاتفاق ان عزیزوں کی جرأت، حسنِ بیان اور سلیقۂ تقریر کی تعریف کی۔ اللہ تعالیٰ ان عزیزوں کو علم و عمل سے آراستہ فرمائے اور مذہب و ملت کی خدمت کا حوصلہ بخشے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اس جلسہ میں شرکت کا حتمی وعدہ فرمایا تھا۔ چنانچہ ۱۱ نومبر ۳۶ئہ کو، کلکتہ سے، اُن کی آمد و شرکت جلسہ کے دو تار آئے۔ لیکن عین وقت پر سائٹیکا کی تکلیف غیرمعمولی طور پر بڑھ

جانے کی وجہ سے سفر سے معذور ہو گئے۔ مولانا کے نہ آسکنے کی وجہ سے ان لوگوں کو مایوسی ہوئی جنھوں نے ان کی زیارت اور تقریر کے شوق میں زحمت سفر برداشت کی تھی۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بھی نہ تشریف لا سکے۔ ان کی نسبت ۱۲ نومبر ۳۶ء کو پٹنہ کے بعض معززین کے دستخط سے جناب صدر کو ایک تار ملا کہ مقامی حالات و ضروریات سے مجبور ہو کر ہم لوگوں نے مولانا کو روک لیا ہے۔

ایک ایسے مدرسہ میں، جو شہر سے بہت دور ایک چٹیل میدان میں واقع ہے اور غریب بھی ہے اس قسم کے بڑے جلسوں کا اہتمام نہایت مشکل تھا لیکن منتظمین کی تعریف کرنی چاہئے کہ انھوں نے دو ہفتہ کی ان تھک کوششوں کے بعد ایک بڑے جلسہ کے لئے ضرورت کی تمام چیزیں اس میدان میں فراہم کر دیں اور طلبۂ مدرسہ، اساتذۂ مدرسہ، طلبۂ قدیم اور محلے اسکاؤٹ کے باہمی اشتراک و تعاون سے پبلک کی خدمت کے لئے ایک ایسا ٹھوس نظام قائم کر دیا جس کی ہر شخص نے بے تکلف تعریف کی۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالعزیز صاحب ندوی کی سرگرمیاں مدت تک یاد رہیں گی۔

اس جلسہ کی شرکت کے لئے مدرسۃ الاصلاح کے طلبۂ قدیم کی بھی ایک اچھی خاصی جماعت یکجا ہوگئی تھی۔ ۱۳ نومبر ۳۶ء کی شام کو طلبۂ جدید نے ان کو چا، کی دعوت دی۔ اگرچہ اس وقت تک اکثر احباب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو چکے تھے، تاہم رہ جانے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ دارالاقامہ کے صحن میں یہ پرلطف مجلس منعقد ہوئی۔ تین دن کی شبانہ روز دوڑ دھوپ، ہنگاموں، پریشانیوں، شب بیداریوں سے ہر شخص بالکل چور تھا۔ لیکن احباب کی مجلس میں لطف و محبت کے دو چار جام جہاں گردش میں آئے، ہر شخص بالکل تازہ دم اور نشاط سے معمور نظر آیا۔

خوش گپ کے علاوہ اس مختصر اجتماع میں ایک مفید کام بھی ہوا۔ طلبہ کا کتبخانہ "دارالمعلومات" ابتک ایک چھوٹے

ست کمرہ کے اندر بند ہے جس کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانے میں طرح طرح کی دقتیں حائل ہیں۔ طلبہ جدید کی درخواست پر احباب قدیم نے طے کیا کہ اس کے لئے ایک وسیع کمرہ تعمیر کرا دیا جائے اور فوراً باتوں باتوں میں اس مقصد کے لئے ایک معقول رقم کا انتظام ہوگیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، مولوی حافظ حکیم محمد عمر صاحب، مولوی برکت اللہ صاحب فاروقی، مولوی عبد الرزاق صاحب، مولوی علاء الدین صاحب جیراجی نے اس تحریک میں خاص حصہ لیا۔

"علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" یہ ۵۰ صفحات کا ایک رسالہ ہے۔ اس کے مصنف کوئی بزرگ "مولانا امداد صابری" ہیں۔ اس میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی قرآنی غلطیاں بیان کی گئی ہیں اور ہم کو بغرض تبصرہ حصول ہوا ہے۔ اس وقت افسوس ہے کہ سخت عدیم الفرصت ہیں اس لئے پورا رسالہ نہ پڑھ سکے۔ جا بجا سے سرسری نگاہ سے دیکھا کسی فرصت میں بغور پڑھیں گے۔

اس رسالہ کا کاغذ وغیرہ برا نہیں ہے اس لئے اگر اس کے شایع کرنے والے اس کی آنہ۔ دو آنہ قیمت رکھ لیتے تو کوئی بیجا بات نہ ہوتی لیکن اس کے ناشر، حضرت سید صاحب قبلہ کی غلطیاں کھولنے کیلئے اس قدر مستعجل تھے کہ اس کی اشاعت میں کسی مانع اور تاخیر کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ یہاں تک کہ رسالہ کے مصنف، سید صاحب کی صرف ۱/۴ غلطیاں جمع کرکے صاحب فراش ہوگئے تھے اور ہنوز ۳/۴ غلطیاں ان کی صحت کی منتظر ہی تھیں کہ ناشر صاحب نے اس رسالہ کو (جو ان کی اصطلاح میں بشکل ضمیمہ ہے) چھاپ کر مفت ہی تقسیم کرنا شروع کر دیا کہ

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

اس رسالہ کو پڑھکر ہمکو نہایت مسرت ہوئی۔ یہ کام کرنے کا تھا اور مولانا امداد صابری مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سید صاحب کی غلطیاں نکال کر لوگوں کو دکھا دیں اور قوم کو ایک بڑے فتنہ سے بچا لیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خود حضرت سید صاحب قبلہ بھی پوری قوم کی طرف سے مبارکباد کے حقدار ہیں کہ باوجودیکہ وہ پورے ہندوستان میں اس وقت

سب سے بڑے مصنف ہیں۔ ان کے قلم نے ہزاروں صفحات لکھے لیکن ان کی غلطیاں بہت کم ہیں۔ اگر تحقیقات اور احتساب کے ایک پورے کمیشن نے سر جوڑ کے محنت کی اور ان کے ہزاروں صفحات میں اس کو یہی چند قرآنی مسامحات نظر آئیں تو سید صاحب اللہ تعالی کا شکر ادا کریں کہ وہ بہت سستے چھوٹے۔ آخر وہ معصوم تو ہیں نہیں! ایک غیر معصوم انسان کے لیے یہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اس سے چند مسامحات ہوگئیں۔ تعجب اور تحدیث نعمت کی چیز تو یہ ہے کہ چند ہی مسامحات ہوئیں۔ زیادہ نہ ہوئیں

مصنف رسالہ نے اپنی تحقیقات کی تصدیق و تائید میں بعض بزرگ علماء کی رائیں بھی حاصل کر کے اس رسالہ میں شامل کی ہیں۔ اس اہتمام خاص کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر منشا یہ ہے کہ یہ زمرۂ معصومین ہے جس نے کبھی غلطی نہیں کی ہے تو ہمکو اس خیال سے نہایت ادب کے ساتھ اختلاف ہے اور اگر یہ لوگ بھی اسی طرح غلطیاں کر جانے والے انسان ہیں جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی تو ان کی تائیدات سے رسالہ کی افادی حیثیت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ تاہم ان رایوں کو پڑھکر ایک نفسیاتی حقیقت ہم کو صاف نظر آئی اور سخت بودا پن ہوگا اگر اظہار حق کے اس موسم بہار میں ہم اس کے اظہار سے چوک جائیں، وہ یہ کہ ان بزرگوں میں سے جو ارباب قرطاس و قلم ہیں عموماً ان کے لب ولہجہ میں متانت اور فقروں میں وزن ہے لیکن جو حضرات "کاغذ بر ریدند و قلم شکستند" و زحرف و دہان حرف گیراں رستند" کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے مستقبل کے تمام خطرات سے مامون و مصئون ہیں ان کے قلم اس قدر رند ہو کر چلے ہیں گویا ایک رسالہ پر تقریظ نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ ایک نیا "الافصاح" مرتب فرما رہے ہیں۔

مصنف رسالہ کو بعض لوگوں کی طرف سے ان کی متانت لہجہ پر مبارکباد دی گئی ہے۔ بلاشبہ اس اعتبار سے وہ ضرور قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے سوقیانہ فحاشی سے احتراز کیا ہے اور اس عہد میں جبکہ بازار میں سب سے زیادہ نایاب

جس کی متانت لہجہ ہی ہے اس شخص کی ضرور تعریف کرنی چاہئے جس کو گفتگو کا اگرچہ سلیقہ نہ ہو، مگر گالی دینے پر نہ اتر آئے۔ پس اس بار پر ہم بھی ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور ساتھ ہی ایک ناچیز مشورہ بھی عرض کرتے ہیں، امید ہے وہ قبول فرمائیں گے۔ وہ اپنے اس کام کو ضرور جاری رکھیں بلکہ بہتر ہوگا اگر وہ اس کو ایک مستقل محکمہ احتساب کی صورت میں کر دیں لیکن خدا را وہ پہلے ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوں جو ان کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ سید صاحب نے سیرت اور ارض القرآن میں قرآنی آیات کے سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں وہ بقول ان کے "صرف پڑھنے والوں کے اسلامی عقائد پر مضر اثر ڈالتی ہیں"، لیکن کیا وہ ان مصنفین سے بے خبر ہیں جن کی غلطیاں اگر انھوں نے جلد خبر نہ لی تو اندیشہ ہے کہ تمام اسلامی عقائد کی دھجیاں اڑا دیں گی۔ (لا سمح اللہ)

پھر تخطیہ و تصویب کا کوئی اصول ٹھہرا لیجئے۔ سید صاحب نے بے شک "قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں کر جاتے ہیں"۔ لیکن ایک معصوم وجود کے سوا (روحنا فداہ) اس آسمان کے نیچے کون ہے جس نے قرآنی آیات کے سمجھنے میں غلطیاں نہیں کی ہیں۔ آپ ایک آیت کی تفسیر کرتے ہیں اور اس کی تائید میں تفسیروں کے نام لکھ دیتے ہیں کیا یہ تمام تفسیریں مسامحات سے پاک ہیں، اور ان کے مصنفین معصوم تھے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر بحث و نظر کی کوئی دوسری راہ اختیار کیجئے۔ ہم نے رسالہ ابھی غور سے نہیں پڑھا تاہم سرسری نگاہ میں بھی اس میں بہت سی مسامحات نظر آئیں اور ہم کو خوشی ہوئی کہ بعض بزرگ علماء نے جن کی ہمارے دل میں خاص قدر ہے اپنی تحریرات میں ان میں سے ایک آدھ کی طرف انگلی اٹھا دی ہے۔ اگر یہ تمام مسامحات جمع کر دی جائیں تو شاید دس صفحات سے زیادہ حجم کا ایک اچھا خاصہ رسالہ مرتب ہو جائے لیکن آپ کی یہ مسامحات ہمارے نزدیک "الحاد و اہمال" نہیں ہیں اور انشاء اللہ ان سے پڑھنے والوں کے اسلامی عقائد پر کوئی مضر اثر بھی نہ پڑے گا" بلکہ جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں لوگوں کو بھی سمجھنا چاہئے کہ کتاب الٰہی کا معاملہ نہایت مشکل ہے یہ ادعا و غرور کی نمائش گاہ نہیں ہے۔ اعترافِ عجز و فروتنی کا آستانہ ہے۔ پس سر فگندہ ہو کر اس کے مقدس آستانہ پر گوشہ نشین ہو جانا چاہئے۔ کچھ سمجھ میں آ جائے تو شکر کرنا چاہئے کہ جس کی کتاب ہے

نے کی توفیق بخشی۔ اور اگر کسی کے سمجھنے میں کوئی کوتاہی نظر آئے تو صرف دو ہی صورتیں ہیں، عاجزانہ استفسار یا
رہ۔ ادعا، و نمائش اور مخاصمت اس راہ میں نہیں ہے۔

برت کا مقام ہے کہ جب ہمارے مجتہدین عصر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا مذاق اڑاتے ہیں، اسلامی عقائد اور مذہبی
تیشے چلاتے ہیں، ابوہریرہؓ اور ابوذر غفاریؓ کی تحقیر کرتے ہیں، حدیث و فقہ کو دفتر اساطیر قرار دیتے ہیں
ں کروڑوں کی اسلامی آبادی میں صرف ایک شخص کا قلم ہے جو اسلام کی حجت اور مذہب کی برہان بن کر نمودا
لون۔؟ مولانا سید سلیمان ندوی لیکن ان کی نیت کے متعلق ایک محترم بزرگ کا حسن ظن مومنانہ ملاحظہ ہو۔

... "مولانا (سید سلیمان) نے قرآن مجید کی آیات کے متعلق جو اور معنوی تحریف کی ہے اور صحیح
اقعات کو مسخ کیا ہے اس نے ان کے نصب العین اور دیرینہ مقصد کو بے نقاب کر دیا ہے۔"

ت قوم اسدرجہ تنگ نظر ہو جائیگی جس کی ہدایت کے لئے سورہ نور نازل ہوئی تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔ ہم کو
صنف رسالہ نے اس طرح کی رایوں کے علاوہ بعض علمائے حق کی سنجیدہ رائیں بھی اس میں شامل
ورنہ ان فقروں سے نہایت سخت رنج ہوتا۔

س رسالہ کو پڑھکر معلوم نہیں ان لوگوں نے اپنے عقائد کی تصحیح کر لی یا نہیں جو مولانا سید سلیمان کی
وجہ سے بھٹک گئے تھے البتہ ان لوگوں کو اس سے بڑی تسلی ہوئی ہے جو فتویٰ الافصاح کے مردہ ہوجانے
ج کل بالکل بے مشغلہ ہو گئے تھے۔ اس کی ایک کھیپ وہ دہلی سے لائے ہیں اور الافصاح کی
ہیں تقسیم کر رہے ہیں کہ بلا سے مولانا شبلی کافر نہ ہو سکے، سید سلیمان کے ملحد ہونے میں کسے شک
بلکہ ان کی غلطیوں پر ۵، صفحہ کا رسالہ شایع ہوا ہے؛ مولانا شبلی نعمانی کے کفر کا پیوند مدرسۃ الاصلاح
ں ذرا زحمتیں تھیں۔ لیکن سید صاحب قبلہ کے "الحاد و اہمال" کی ذمہ داریاں تو بڑی آسانی سے مدرسہ کے
کارکنوں پر عاید ہو سکتی ہیں کہ مدرسہ کو ان سے گوناگوں تعلقات ہیں۔ اپنی اس حالت پر انوری کا ایک

مشہور شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

اس رسالہ کا مقصد اگر نیک نیتی سے سید صاحب کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ہوتا تو ہم کو نہایت خوشی ہوتی لیکن مصنف کا مطمح نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"لیکن افسوس تو یہ ہے کہ مولانا کی یہ غلطیاں ایسی غلطیاں نہیں ہیں جو انسانی دماغی مجبوری کو ظاہر کریں۔ یا خدا نخواستہ مولانا کے مبلغ علم کی پول کھولیں اور ان سے چشم پوشی علو اخلاق کا اقتضا ہو بلکہ یہ فحش اور ارادی غلطیاں ہیں جو مولانا کے بیکر عقیدت کو عریاں کر رہی ہیں .... مولانا کی اکثر و بیشتر قلمی خدمات کا مفاد، دین خالص کی تبلیغ و اشاعت کے بجائے صرف الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا کرنا ہے۔"

ان الفاظ کے اندر مصنف کا مقصد صاف جھلک رہا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ جن بزرگوں نے ان کی متانت لہجہ کی تعریف فرمائی ہے ان سے گذارش ہے کہ وہ اس عبارت کو ضرور پڑھیں یہ الفاظ انہوں نے سیرۃ النبی، ارض القرآن، خیام اور عرب و ہند کے مصنف کی نسبت لکھے ہیں جو بدقسمتی سے اس غلام ملک میں پیدا ہوا، اگر کسی آزاد قوم میں پیدا ہوتا تو اس کی پوری نسل اس پر فخر کرتی۔

تفسیر سورۃ اللّھب

تفسیر سورۃ اللّھب کا اردو ترجمہ ہفتہ عشرہ میں شایع ہو جائے گا۔ جن کو مطلوب ہو دفتر کو مطلع فرمائیں۔

باب التفسیر

تفسیر سورۃ العصر

(۱)

مصنفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

مترجمہ

امین احسن اصلاحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ	(۱)	زمانہ گواہی دیتا ہے۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ	(۲)	کہ آدمی گھاٹے میں ہے
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ		مگر وہ جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ		اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ	(۳)	اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

سورہ کی دو تاویلیں

(۱) جن لوگوں نے فصحائے عرب کے کلام کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی کلام

[illegible] معنی نظم کلام کے موقع اور سیاق کی پوری موافقت [illegible] اور بعض عام جگہ پر نہایت محکم اور بلند [illegible] خصوص [illegible] کے ساتھ اپنے عموم [illegible] گنجائش کے لئے استاذ امام [illegible] تفسیر [illegible] اصول کے یہاں مسلم ہے۔ اور ہم نے اپنی کتاب اصول التاویل میں اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بات [illegible] سورۃ العصر [illegible] اور اس کی دو تاویلیں ہیں۔ ایک خاص اور محدود دوسری عام اور وسیع۔ پہلے ہم خاص تاویل کے لحاظ سے اس کی تفسیر کریں گے جس سے پچھلی سورہ کے ساتھ اس کا تعلق بھی روشنی میں آجائیگا۔ اس کے بعد اس کی عام اور وسیع تاویل پر بحث کریں گے اور یہ پہلو بھی ما سبق سورہ سے بے تعلق نہ ہوگا

سورہ کا اجمالی مفہوم اور ماقبل سے تعلق

اس سے پہلی سورہ میں یہ بات بیان ہوئی تھی کہ ارباب نعمت و جاہ طلب مال اور عیش دنیا کی خود فراموشیوں میں گم ہیں۔ ان کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیوں کا محور دنیا ہے اور اسی کے عشق میں انھوں نے اپنی عمریں گنوا دیں جس سے بڑھکر کوئی بدبختی اور نامرادی نہیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا
الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

کہو، میں تمھیں بتاؤں وہ لوگ جو بالکل گھاٹے میں ہیں؟
یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام سرگرمی (سعی جمع مال) دنیا کی
زندگی میں برباد ہوئی اور وہ سمجھے رہے کہ وہ بڑا مفید کام

ئكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيَاتِ رَبِّهِمْ
ئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ
لْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ ذٰلِكَ جَزَآءُهُمْ جَهَنَّمُ
رُوْا وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا

کر رہے ہیں (یعنی جمع مال کے لئے اپنی مجنونانہ کوششوں کو دانائی
سمجھتے رہے اور جو لوگ آخرت کے کاموں میں مشغول تھے
ان کو بیوقوف خیال کیا) یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی
نشانیوں (ایات بعث جزا) اور آخرت میں اس کے سامنے
حضوری کا انکار کیا، پس ان کے تمام اعمال برباد ہوگئے (یہی
خسران عظیم ہے) اور قیامت کے دن ان کی کوئی پوچھ نہ ہوگی، یہ ان کا
بدلہ جہنم ہے بوجہ اس کے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیو

ن ارباب ثروت کا بیان ہے جو دولت کے نشہ میں انبیاء و رسل کا مذاق اڑاتے تھے اور اللہ کی نشانیوں اور روز آخرت جیسے [illegible]
ہے سورہ والعصر پر غور کرو، ابتدائے سورہ میں ان لوگوں کی نامرادی کو بیان کیا پھر اصلی کامیابی
شارہ کیا کہ اس عمر فانی کے اندر نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کر کے یہ دولت جاوداں حاصل کی جاسکتی ہے۔
لو چاہیے کہ وقت کی قدر کریں اور غفلت و سرمستی کی نیند سے بیدار ہو کر حسرت و افسوس کی ساعت سے
ہتر کی سعی و طلب میں مشغول ہوں جو چاہنے کی ہے۔ ورنہ ایک دن آئیگا کہ وہ اپنی اس بے حاصلی
ماتم کریں گے۔ اور وہ وقت ماتم کا نہ ہوگا۔

جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ
رْجِعُوْنِ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا
تُ. كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا
رَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ
فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ
وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ. فَمَنْ ثَقُلَتْ

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آ کھڑی ہوگی
وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار مجھے لوٹا دے (دنیا میں) تاکہ میں
جو کچھ چھوڑ آیا ہوں (مال و دولت) اس میں جا کر نیک کام
کروں۔ ہرگز نہیں: (یعنی وہ ہرگز دنیا میں لوٹائے نہ جائینگے)
یہ اس کی زبانی باتیں ہیں (یعنی نہ تو اب ان کی تمنا پوری
ہوگی اور نہ یہ اپنے وعدے میں سچے ہیں) اور ان کے پیچھے

مَوَازِینُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِینُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ فِیْ جَہَنَّمَ خَالِدُوْنَ

ایک پردہ ہوگا (یعنی ایک آباؤ جوان کے اور ان کے دنیاوی مال و متاع کے بیچ میں حائل ہو جائیگی) قیامت کے دن تک پس جب صور پھونکا جائیگا تو نہ اس دن آپس کے رشتے قائم رہ سکیں گے نہ ایک دوسرے سے مدد مانگ سکیں گے (یعنی بعث کے بعد بھی وہ اپنے دنیاوی مال و متاع اور اعوان و انصار کی حمایت سے محروم ہونگے۔ صرف ان کے اعمال کی مسؤلیت ان کے ساتھ ہوگی) پس جن کے پلے بھاری ہونگے (یعنی جنھوں نے خیراتی کی کمائی کی ہوگی) وہ لوگ کامیاب ہونیوالوں میں ہوں گے۔ اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے (اسلئے کہ انھوں نے نیک کام نہیں کئے اور ساری زندگی زخارف دنیا کے عشق و طلب میں

ان آیات سے جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں معلوم ہوا کہ انسان کا خسران اس امر پر مبنی ہے کہ روز جزا حق ہے اور انسان چونکہ اپنے رب کے قبضۂ تصرف میں ہے اس لئے ایک روز وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال و افعال اور خدا کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں کے متعلق مسؤل ہوگا۔ پس اس موقع پر ضروری ہوا کہ پہلے جزا کا اثبات کیا جائے چنانچہ سورہ کے مطالب کی ترتیب یوں ہوئی کہ پہلے وہ لزوم جزا کو ثابت کرتی ہے پھر اس خسارہ عظمیٰ کی طرف اشارہ کررہی ہے جو اللہ کی بخشی ہوئی اس عظیم الشان نعمت یعنی اس زندگی کے قیمتی ایام ضائع کردینے کی وجہ سے لاحق ہوگا۔ پھر آگے بڑھکر کامیابی اور نجات کی راہ کھول رہی ہے۔ اور یہ ساری باتیں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ صرف چند لفظوں میں بیان ہوگئی ہیں۔

لفظ عصر کی تحقیق

(۲) عصر کے معنی زمانہ کے ہیں۔ اس لفظ میں زمانہ کے مرور و ذہاب کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح

ظ" دہر" میں اس کی مجموعیت کا اعتبار ہے۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق بیشتر گذرے ہوئے زمانہ پر ہوتا ہے
مرؤالقیس کا شعر ہے:-

وھل ینعمن من کان فی العصر الخالی

اور ان کے لئے کیا مبارکباد ہے جو گذرے ہوئے زمانوں میں تھے

عبید بن الابرص نے کہا ہے:-

فذلك عصر وقد ارانی تحملنی بازل شبوب

وہ بھی زمانہ تھا جب میں اپنے کو دیکھتا تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت اونٹنی پر سوار ہوں۔

"قد ارانی" یعنی حین کنت ارانی جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے۔

متلمس کا شعر ہے:-

عرفت لاصحاب النجائب جدة اذا حرفوا لی فی العصور الاوائل

"نظامی بھی اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے حالانکہ وہ جاہلی نہیں تھا۔

انی اهتدیت لتسلیم علی دمن بالغمر غیرهن الاعصر الاول

میں نے مقام غمر میں ایسے کھنڈروں پر سلام کیا جن کو گردش روزگار نے بالکل متغیر کر دیا تھا۔

اسی مفہوم میں درید بن صمۃ نے بھی ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

فان لا تترکی عذلی سفاها تلمك علیه نفسك غیر عصر

اگر تو مجھے بیوقوفی سے ملامت کرنا نہ چھوڑیگی تو زیادہ زمانہ نہ گذرے گا کہ اس بات پر تیرا نفس تجھکو خود ملامت کریگا

"غیر عصر" یعنی "من غیر ان یمر بك کثیر زمان"

اسی مرور و ذہاب کے مفہوم کی وجہ سے تیز و تند ہوا کے لئے اعصار کا لفظ استعمال ہوا۔ دن کے

آخری حصہ کو جب دن گذر گو یا نچڑ جاتا ہے عصر کہتے ہیں عصر الشیٔ اسی معنی کے اعتبار سے ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر ایک طرف تو گذشتہ قوموں کے واحوال یاد دلا رہا ہے دوسری طرف زمانہ کی ایک مخصوص صفت یعنی اس کی سرعت زوال اور برق رفتاری کی طرف توجہ دلا رہا ہے اور ان دونوں حقیقتوں کی وضاحت سے ہمارے سامنے دو اہم نتائج آتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسانوں پر ان کے اعمال کے لحاظ سے اللہ کے فیصلے نافذ ہوں گے دوسرا یہ کہ ہم کو زمانہ سے جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کی تیزی اور برق رفتاری ہے زیادہ سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

کلام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایک حد تک ان حقائق سے آشنا تھے چنانچہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ حکمت آشنا تھے انھوں نے بیجا اپنے کلام میں ان نکتوں کیطرف اشارہ کیا ہے مثقب عبدی کا شعر ہے۔

ان الامور اذا استقبلتها اشتبهت ... وفی تدبرها التبیان والعبر

معاملات جب اول اول سامنے آتے ہیں مشتبہ حالت میں ہوتے ہیں لیکن جب ان پر تدبر کرو تو ان میں بڑی بڑی بصیرتیں نمایاں ہوتی ہیں

قس بن ساعدہ نے کہا ہے۔

فی الذاھبین الاولین ... من القرون لنا بصائر

گذر جانے والی نسلوں میں ہمارے لئے بڑی بڑی بصیرتیں ہیں

اس شعر میں بصائر کے لفظ سے دو عبرتوں کے علاوہ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اسی شاعر نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں اس حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے۔

یا معشر ایاد! پچھلی قوموں اور گذشتہ نسلوں میں سے	یا ارباب العقول من الامم الخالیة
جنھوں نے اپنی زندگیاں غفلت میں گنوائیں ان کے لئے ہلاکی ہو	والقرون الماضیة یا معشر ایاد این
کہاں ہیں آباؤ اجداد! کہاں ہیں مریض اور ان کے عیادت	الآباء والاجداد وابن المریض والعواد
کرنے والے؟ کہاں ہیں طاقتور فراعنہ! کہاں ہیں وہ لوگ	واین الفراعنة الشداد واین من بنی وشید
جنھوں نے فلک بوس عمارتیں بنوائیں جنھوں نے آراستہ کیا	وزخرف ونجد وغرہ المال والولد این
اور سنوارا اور مال و اولاد کی محبت نے ان کو دھوکے میں رکھا	من بغی وطغی وجمع فاوعی وقال انا ربکم

الاعلیٰ، الم یکونوا اکثر منکم اموالا واطول منکم اجالا طحنهم الثریٰ بکلکله ومزقهم بتطاوله فتلک عظامهم بالیة وبیوتهم خاویة عمرتها الذئاب العادیة، کلا بل هو المعبود

کہاں ہیں وہ جنھوں نے سرکشی کی اور اکڑے، جمع کیا اور سمیٹا اور کہا انا ربکم الاعلیٰ! کیا وہ مال میں تم سے زیادہ نہ تھے اور عمروں میں تم سے بڑھکر نہ تھے! لیکن کیا ہوا؟ زمین نے انکو پیس دیا اور اس کی دست درازیوں نے ان کو پامال کر دیا۔ یہ ان کی بوسیدہ ہڈیاں ہیں، ڈھے ہوئے مکانات ہیں جن کو خونخوار بھیڑیوں نے آباد کر رکھا ہے! ہرگز نہیں

اس کلام میں جملہ خوبیوں کے باوجود ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ اس نے مجازات کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن جب ان امور کا ذکر کرتا ہے، عدل کے پہلو کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً۔ فتلک بیوتهم خاویة بما ظلموا۔ یہ ان کے مسمار شدہ مکانات ہیں بوجہ اس کے انھوں نے ظلم کیا۔ قس نے جہاں بغی وطغی کہا ہے اس حقیقت کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا لیکن صرف زوال نعمت کے ذکر پر پہنچ کر رک گیا۔ جزا کے معاملہ کی طرف اس کی نظر نہیں گئی۔ قرآن مجید عموماً جزا پر ان واقعات سے استدلال کرتا ہے جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آئے۔ دوسرے صحف آسمانی کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں لزوم جزا کی دلیل کے طور پر گذشتہ قوموں کے احوال و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ باقی رہی زمانہ کی بے ثباتی اور بے وفائی تو یہ تو عربی شاعری کا نہایت پامال مضمون ہے۔ شعراء میں عدی بن زید کا تو گویا خاص مضمون یہی ہے؛

اعاذل ما یدریک ان منیتی الی ساعة فی الیوم او فی ضحی غد

اے ملامت گر تجھے کیا معلوم کہ میری موت آج کسی گھڑی میں آجائے گی یا کل۔

اعاذل ان الجهل من لذة الفتی وان المنایا للرجال بمرصد

اے ملامت گر رندی و شاہد بازی نوجوانی کی لذتوں میں سے ہے اور انسان کی موت ہمیشہ گھات میں ہے

کفی زاجرا للمرء ایام دهره تروح له بالواعظات وتغتدی

آدمی کی تنبیہ کے لئے ایام روزگار کافی ہیں۔ ہر صبح و شام صحیفۂ عبرت کا ایک نیا ورق الٹتی ہے۔

دیکھو کس قدر حکیمانہ باتیں ہیں تاہم جزا اور دار آخرت کا کوئی ذکر نہیں

زمانہ کی قسم کیوں کھائی؟

۴۔ لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلی قوموں پر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے نافذ ہوئے وہ ٹھیک ٹھیک ان کے اعمال کا بدلہ تھے اگر انھوں نے نیکیاں اور بھلائیاں کیں خدا نے ان کو عروج کمال بخشا، اگر انھوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی قانون الٰہی نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ انہی حقائق کو یاد دلانے کے لئے خدا نے زمانہ کی قسم کھائی کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک دن اعمال کی اس حقیقت سے لازماً ان کو بھی دوچار ہونا ہے پھر زمانہ کی قسم میں ایک اور نازک نکتہ بھی مضمر ہے۔ وہ یہ کہ انسان کا اصلی راس المال زمانہ ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ تیز روی اور برق رفتاری میں کوئی چیز بھی اس سے بڑھکر نہیں لیکن یہ انسان کی کیسی نادانی ہے کہ وہ زمانہ کی اس بے وفائی سے واقف ہونے کے باوجود اس پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کی بے ثباتی روز قیامت کی باز پرس اور جزائے اعمال کے قانون سے بالکل غافل ہے۔ اس معاملہ میں انسان کی مثال بالکل اس تاجر کی ہے جو برف کی تجارت کرتا ہے لیکن بجائے اس کے اس کو جلد سے جلد بیچ کر اپنے دام وصول کرنے کی فکر کرے اس کو اس نے رکھ چھوڑا ہے اور اس کی چمک اور ٹھنڈک کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تاجر کو بہت جلد اپنی غفلت و نادانی پر کف افسوس ملنا پڑے گا

ٹھیک ٹھیک یہی حال اس غافل انسان کا ہے جو وقت کی قدر و قیمت سے غافل ہے جب موت کی گھڑی اس کے سر پر آجائے گی، حسرت و نامرادی کے سوا اس کے جیب و دامن میں کچھ نہ ہوگا۔ قرآن مجید جس نامرادی کا بار بار ذکر کرتا ہے اس کی حقیقت یہی ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ　　بے شک وہ لوگ گھاٹے میں ہے جنھوں نے اللہ کے سامنے
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً　　حاضر ہونے کو جھٹلایا۔ یہانتک کہ جب قیامت کی گھڑی

قَالُوا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ؁ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ۔

ان کے سر پر دفعتہ آجائیگی وہ کہیں گے افسوس ہماری کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی ہے اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہوں گے اور آگاہ کہ وہ برا بوجھ ہوگا اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر لہو ولعب اور یقیناً دار آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کریں

اور یہ جو قسطلانیؒ وغیرہ بعض علماء نے "والعصر" کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اقسم بالدھر لاشتماله على العجائب والعبر" زمانہ کی قسم اس لئے کھائی کہ وہ گوناگوں نیرنگیوں اور عبرتوں کا مجموعہ ہے۔ تو ان کا مطلب بھی وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

علاوہ بریں زمانہ کی تیزروی میں ایک پہلو بشارت اور تقویت صبر کا بھی ہے۔ کیونکہ اسی تھوڑی سی گذرجانے والی مدت کے صلہ میں اگر انسان چاہے تو اجر وثواب کا ایک لازوال خزانہ حاصل کر سکتا ہے۔ ایک بدبخت انسان اس حیات چند روزہ کی فانی لذتوں پر ریجھ کر ابدی مسرت وکامیابی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن ایک عاقل اس فانی زندگی کے چند دنوں کے اندر، جن کی حقیقت ایک خواب یا برق خاطف سے زیادہ نہیں تقوی اور ضبط نفس کی آزمائشیں جھیل کر اور اس باطل فانی سے بے نیاز اور اس حق باقی پر ثابت قدم رہ کر جو آنکھوں سے اوجھل ہے، خدا کی خوشنودی اور محبت کا ابدی تخت وتاج حاصل کرلیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ عصر محض بطریق مثل ہی نہیں آیا ہے بلکہ یہ قانون جزاء اور غفلت شعار انسانوں کی نامرادی پر ایک محکم حجت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں تقویت صبر وتقوی کا بھی ایک پہلو ہے۔ غور کرو، قرآن کے ایک لفظ نے کس خوبی اور ایجاز کے ساتھ فوز وفلاح اور خسران ونامرادی کے دونوں پہلو بے نقاب کردیے ہیں۔

لفظ "وتواصوا" سے خلافت کا وجوب

۵۔ انسانوں کی عام نامرادی بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کی خصوصیات بیان کیں جنھوں نے اس حیات چند روزہ کے بدلہ ابدی مسرت وکامیابی حاصل کی۔ ان لوگوں کی تین خصوصیتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایمان، عمل صالح، تواصی۔ ان تین صفتوں نے اپنے اندر دنیا وآخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں جو لوگ اس کلام پر غور کریں گے وہ پائیں گے کہ باوجود غایت ایجاز ان الفاظ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ نیکی اور بھلائی کی قسم کی کوئی بات ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ گئی ہے۔ ایمان تمام عقائد کا شیرازہ ہے عمل صالح تمام شرائع کا مجموعہ ہے، اور تواصی ایک رتبہ کمال وفضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے مخصوص فرمایا اور اس امت میں بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو ائمہ ہیں کیونکہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اصلی ذمہ داری انہی پر ہے۔

اس تواصی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی اور ان کو اختلاف ونزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کرکے بھائی بھائی بنا دیا۔ جب تک امت کے اندر یہ نظام باقی رہا اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے۔ جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں، لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہوگیا دفعۃً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے قرآن مجید کی آیت ذیل میں اس فریضہ کی تفصیل کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا	اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حالت میں کہ مسلم ہو۔ اور اللہ کی رسی سب متحد ہو کر مضبوط پکڑو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کے فضل کو اپنے اوپر یاد کرو جب تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو باہم جوڑا اور تم اسکے

…نتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ — فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے

…نْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ — کے کنارے کھڑے تھے تو اللہ نے اس سے تم کو بچایا اسی طرح

…اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَلْتَكُنْ — اللہ اپنی آیتیں کھول کھول بیان کرتا ہے کہ تم ہدایت پاؤ

…مْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ — اور چاہیے کہ تم میں ایک امت دعوت الی الخیر، امر بالمعروف

…رُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ — اور نہی عن المنکر کے لئے ہو اور وہی لوگ فلاح پانے والے

…الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ — ہوں گے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق ہو گئے

…تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ — اور کھلی کھلی نشانیاں پانے کے بعد انھوں نے اختلاف کیا

…الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ — یہی لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے ....

…ظِيْمٌ ..... اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى ..... كُنْتُمْ خَيْرَ — الی قولہ تعالی ..... تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت

…اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ — کے لئے اٹھائے گئے ہو۔ تم نیکی کا حکم دوگے، برائی سے

…وْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ — روکوگے، اللہ پر ایمان لاؤگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے اہمات فرائض میں سے ہے چنانچہ اسکے متعلق …آیات بھی وارد ہیں لیکن یہ امر واضح ہے کہ اسکی اصلی ذمہ داری جیسا کہ ولتکن منکم امۃ سے متبادر ہوتا ہے صرف …ت پر ہے۔ البتہ تواصی ایک فرض عام ہے جسمیں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے …کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے عمل صالح کریں پھر ادائے حقوق …ملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں، اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اس لئے ضروری …لافت قائم کریں، اور خلافت کا قیام چونکہ اطاعت پر منحصر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت …جود ہو۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کے لئے حق و صبر کی پوری تفسیر ضروری ہے اس لئے اب ہم اسکی …متوجہ ہوتے ہیں۔

(باقی)

معارف قرآن

تیسیر قرآن

۸

امین احسن اصلاحی

شانِ نزول گذشتہ صحبت میں روایات و آثار پر ہم نے جو اصولی بحث کی ہے وہ روایات اور قرآن مجید کے تعلق کو پوری طرح واضح کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ لیکن شانِ نزول سے متعلق بعض شبہات لوگوں کے دلوں میں ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اس اصولی بحث سے الگ ہو کر چند سطریں مسئلہ کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر لکھدی جائیں۔

تفسیروں کے مطالعہ میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ تقریباً ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی واقعہ بطور شانِ نزول بیان ہوتا ہے بلکہ بعض آیات کے تحت متعدد واقعات ہوتے ہیں اور ان میں بسا اوقات باہمد گر اختلاف بلکہ تضاد ہوتا ہے اور عموماً یہ واقعات اس درجہ غریب اور آیت کے سیاق و سباق سے اس قدر بے تعلق ہوتے ہیں کہ طبیعتیں ان کو قبول کرنے سے جھجکتی ہیں۔ لوگوں کو اس طرح کی روایات پر دو قسم کے شبہات ہیں۔ ایک یہ کہ ان واقعات میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کو آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر ہر آیت سے متعلق ایک یا چند واقعات بطور شانِ نزول تسلیم کر لئے جائیں تو کم از کم قرآن مجید میں نظم و تسلسل کی تلاش بالکل عبث ہے۔ کیونکہ نظم کلام کے تسلسل کا مقتضی ہے اور ہر آیت کا کسی خاص واقعہ سے متعلق ہونا تسلسل کے بالکل منافی ہے۔ یہ شبہہ سورہ انعام کی تفسیر میں حضرت امام رازی رحمہ اللہ کو بھی پیدا ہوا اور تعجب ہے کہ وہ اس کا کوئی تشفی بخش جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ آیت وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولی ههنا اشكال وهو ان الناس اتفقوا
على ان هذه السورة نزلت مرة واحدة
واذا كان الامر كذلك فكيف يمكن ان يقال
فى كل واحدة من ايات السورة ان سبب
نزولها هو الامر الفلانى بعينه

میرے سامنے یہاں ایک سخت اشکال ہے وہ یہ کہ لوگ اس
بات پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی، جب
معاملہ یوں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سورہ کی ہر آیت کی نسبت
یہ کہا جائے کہ اسکے نزول کا سبب فلاں واقعہ ہے۔

جہاں تک پہلے شبہہ کا تعلق ہے اس کے ازالہ کے لئے ہمارے گذشتہ صحبت کے بعض مباحث کافی ہیں یعنی روایات کے تتبع سے پہلے نفس آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق پر تدبر کرنا چاہئے، اگر الفاظ اپنے مفہوم کو پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، آیت کی صحیح تاویل بغیر کسی خارجی مدد کے بالکل بے نقاب ہوگئی ہے، نظم عمود اور حسن تاویل کے جملہ شرائط پوری طرح ادا ہوگئے ہیں تو کچھ ضروری نہیں کہ ایک ایسے واقعہ کو آیت پر چسپاں کیا جائے جو اس کے نظم و سیاق کو درہم برہم اور حسن تاویل کو مجروح کرے۔ ہاں اگر شان نزول آیت کی واضح اور صحیح تاویل کی تائید کر رہا ہے تو وہ مزید اطمینان اور شرح صدر کا باعث ہوگا اور اس سے اعراض کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک طبیب ایک نسخہ کو دیکھ کر، اس کے اجزاء اور ان کی باہمی ترکیب و تالیف پر غور کر کے، پتہ لگا لیتا ہے کہ وہ کس مرض کے لئے لکھا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے طالب علم کو آیات کے مطالب اور ان کی باہمی ترتیب و تالیف پر تدبر کر کے سورہ کا شان نزول خود سورے سے معلوم کرنا چاہئے اور پھر مزید بصیرت اور ازدیاد طمانیت کے لئے ان واقعات پر غور کرنا چاہئے جو بطور شان نزول بیان کئے گئے ہیں۔ اس صورت میں کمزور و ضعیف روایات سے لغزش کا اندیشہ نہیں۔ قرآن مجید کی روشنی صحیح جادہ کی طرف رہبری کرے گی۔ روایات صحیحہ مزید شرح صدر کا موجب ہوں گی۔ کمزور روایات خود بخود سامنے سے ہٹ جائیں گی۔

اوپر حضرت امام رازی رحمۃ اللہ کے جس شبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ شبہ بھی کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ اہل تحقیق

کے جوابات سے، جو کتب فن میں بہ تصریح مذکور ہیں، اس کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں

قال الزرکشی فی البرھان قد عرف من عادۃ الصحابۃ والتابعین ان احدھم اذا قال نزلت ھذہ الایۃ فی کذا فانہ یرید بذلک انھا تتضمن ھذا الحکم لا ان ھذا کان السبب فی نزولھا فھو من جنس الاستدلال علی الحکم بالایۃ لا من جنس النقل لما وقع۔

زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہؓ و تابعین کا یہ طریقہ معروف ہے کہ ان میں سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "یہ آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی"، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ یہ بات اسکے نزول کا سبب ہے گویا یہ اس آیت سے اس معاملہ پر ایک استدلال ہوتا ہے نہ کہ نقل واقعہ

اس باب میں حکیم اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ وہ فوز الکبیر میں فرماتے ہیں۔

"آنچہ از استقراء کلام صحابہ و تابعین معلوم می شود آنست کہ نزلت فی کذا نہ محض برائے قصہ کہ در زمان آنحضرت صلعم بودہ و سبب نزول آیت گشتہ استعمال کنند بلکہ گاہے یکے از ما صدق علیہ آیت راکہ در زمان آنحضرت صلعم بودہ ہست یا بعد از آں حضرت ذکر کنند و گویند نزلت فی کذا و در ینجا انطباق جمیع قیود لازم نیست بلکہ اصل حکم می باید کہ منطبق باشد پس بس و گاہے سوالے کہ آنحضرت صلعم آوردہ باشند یا حادثہ کہ دراں ایام نیک فرجام متحقق شدہ باشد و آنحضرت صلعم حکم آں را از آیتے استنباط کردہ باشند و آں آیت را دراں باب تلاوت نمودہ باشند تقریر نمایند و نزلت فی کذا و گاہے درین صورت ہا گویند فانزل اللہ تعالیٰ قولہ کذا یا فنزلت گویند و گویا ایں اشارت بآں ہست کہ استنباط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازاں ہمیت والقائے آں آیت دراں ساعت بخاطر مبارک آنحضرت صلعم نیز نوعے از وحی و نفث فی الروع است ازیں جہت میتواں گفت

فانزلت و اگر کسی درانیجا بتکرار نزول تعبیر کند نیز می تواند شد و محدثین در ذیل آیات قرآن چیز ہائے بسیار تقریر میکنند کہ بحقیقت نہ از قسم سبب نزول باشد مثل استشہاد صحابہ در مناظرات خود بآیت یا تمثیل ایشاں بآیت یا تلاوت آنحضرت صلعم آیت را برائے استشہاد کلام خود یا روایت حدیثے کہ موافق آیت باشد در اصل غرض یا تعیین موضع نزول یا تعیین اسماء مذکورین بطریق ابہام یا طریق تلفظ کلمہ قرآنیہ یا فضل سورت یا آیات قرآن یا صورت امتثال آنحضرت بامرے از اوامر قرآن وایں ہمہ درحقیقت از اسباب نزول نیست و شرط مفسر احاطہ باں نیست۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نزلت فی کذا اور فانزل اللہ تعالیٰ قولہ یا نزلت وانزلت کی اصطلاح صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے نزدیک کیا مفہوم رکھتی تھی اور شان نزول سے متعلق جو روایات کثیرہ کتب تفسیر میں مذکور ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ ان کی حیثیت استنباط و استدلال اور تطبیق کی ہے یا نقل و بیان کی؟ سارا اشکال یہیں سے پیدا ہوا تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ سلف جس آیت کی نسبت کہتے ہیں کہ نزلت فی کذا اس کی نوعیت نقل و بیان کی ہوتی ہے۔ لیکن اوپر علامہ زرکشی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جو اقوال نقل ہوئے ہیں ان سے صاف ہو گیا کہ نزلت فی کذا یا فانزل اللہ تعالیٰ قولہ وغیرہ اصطلاحات کا وہ منشا نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ استنباط و استدلال کے قسم کی ایک چیز ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد تمام شبہات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں۔

تفسیر اور شان نزول کی کتابوں میں بعض اوقات ایک آیت کا سبب نزول کوئی ایسا واقعہ بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ اور آیت کے نزول کا زمانہ کسی طرح ایک نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورہ مدنی ہوتی ہے اور شان نزول کی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی آیت کی ہوتی ہے اور شان نزول جو بیان کیا جاتا ہے وہ مدنی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ بلکہ بعض شان نزول تو ایسے ملتے ہیں جن کے وقوع اور ان سے متعلق آیت کے نزول کے زمانوں میں بڑا فرق ہے۔ ایسے مواقع پر اگر طالب علم کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے نزدیک شان نزول کا حقیقی مفہوم کیا ہے تو اس کو مطالعہ میں سخت زحمتیں پیش آتی ہیں اور اس کو شک و انکار کی ان حالتوں سے کشمکش

کرنی پڑتی ہے جن کا سد مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے۔

بااین ہمہ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ شان نزول کے معاملہ میں لوگوں نے بہت افراط سے کام لیا ہے

شاید ہی کوئی آیت ایسی نکلے جس کے نیچے کوئی قصہ درج نہ ہو اور عموماً یہ قصے بالکل بے بنیاد اور محدثین کے نزدیک

ناقابل اعتبار ہیں۔ طالب قرآن کو ان قصوں میں نہیں الجھنا چاہئے۔ ان کو قرآن کے فہم میں نہ صرف یہ

کہ کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کیلئے حجاب اکبر ہیں۔ بالخصوص جو طلبہ نظم کے متلاشی ہوں (اور فہم قرآن کی اصلی

راہ یہی ہے) ان کے لئے ان قصص سے بڑھ کر کوئی روک نہیں۔ حضرت امام رازیؒ کو جو اشکال پیش آیا تھا اور جس کا

اوپر ہم نے حوالہ دیا ہے، وہ اسی قسم کے قصص کا پیدا کردہ تھا۔ اور ناممکن ہے کہ ان قصوں کے ساتھ کوئی طالب قرآن

حقیقت کا سراغ لگا سکے۔

یہ شکایت صرف ہم کو نہیں ہے۔ حکیم اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ان کے

الفاظ یہ ہیں۔

"دانستہ شود کہ اکثر اسباب نزول در فہم معانی آیات دخل ندارد اللھم الاشئی قلیل۔

. . . . . وآنچہ محمد بن اسحٰق کلبی دریں باب افراط کردہ اند در زیر ہر آیتے

قصہ آوردہ اند نزدیک محدثین اکثر غیر صحیح است و در اسناد آں نظر است آنرا شرط تفسیر

دانستن خطائے مبین است و بہ حفظ آں تدبر کتاب اللہ را موقوف داشتن حظ خود را از

کتاب اللہ فوت کردن است"

پس قصص و واقعات کے بارہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ صرف ان قصص کو معلوم کرنے کی کوشش کیجائے جنکی

طرف آیات قرآن خود اشارہ کر رہی ہیں اور جن کا وضوح آیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

شرط مفسر معرفت دو چیز است یکے قصصے کہ آیات تعریض بآں می کنند بیں فہم ایمائے

ایں آیات بغیر معرفت آں قصص میسر نمی شود و دیگر قصہ کہ تخصیص عام یا مثل آں از وجوہ صرف از ظاہر می نماید پس فہم مقصد آیات بدون آں قصص میسر نشود۔"

مثلاً

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ۔ (مجادلہ۔ ۱)

اللہ نے سُن لی اس عورت کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے بارہ میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے شکوہ کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ ۔ (الاحزاب۔ ۳۷)

اور جب تم کہہ رہے تھے اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تم نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روک رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور تم اپنے دل میں چھپاتے تھے جو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے اور اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس (بیوی) سے قطع تعلق کر لیا۔ ہم نے وہ تم کو بیاہ دی تاکہ مومنین پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارہ میں کوئی تنگی نہ رہے جب وہ ان سے قطع تعلق کر لیں۔

یا مثلاً

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ

اور جب پیغمبر نے اپنی بیبیوں میں سے کسی سے ایک بات چپکے سے کہی۔ پھر جب اس نے خبر کر دی اس کی اور اللہ نے جتلا دی نبی کو وہ بات تو جتلائی نبی نے

بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (تحریم-۳)

اس میں سے کچھ اور ٹال دی کچھ۔ پھر جب وہ عورت کو بولی تجھ کو یہ کس نے بتلا دی۔ کہا مجھ کو خدائے علیم وخبیر نے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس وقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کوئی معلوم کر لیا جائے جن پر یہ حکم لگا رہی ہیں۔ پس اس طرح کے مواقع پر شان نزول کی جستجو بلاشبہ ضرو لیکن ایسے مواقع قرآن مجید میں زیادہ نہیں ہیں چند ہیں اور عموماً صحاح میں ان کی تفصیلات موج اس سلسلہ میں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اول قرآن مجید کی آیت پر غور کرنا چاہئے۔ اس خود بخود واقعہ کی تمام جزئیات نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کا کوئی پہلو مخفی ہے اور الفاظ اس کو ڈھونڈھ رہے ہیں تو مزید اطمینان کی خاطر صحیح ذرائع سے قصہ کو معلوم کرنا چاہئے ا پورا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ قرآن کے اشارات سے ٹھیک ٹھیک مطابق ہو۔ اس سے مختلف نہ ہو۔

(باقی)

تفسیر سورۂ اخلاص (اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس ہر دور میں تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر م ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت وطباعت بہترین کاغذ نہایت عم

قیمت :- ۵/

مینجر

مصدقاً لما بین یدیہ
کی
صحیح تاویل

مدیر اصلاحی

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید میں جس اہم مقصد کے لئے اس جملہ کو استعمال فرمایا گیا ہے، اس کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ کی۔ عام طور پر اس کا ترجمہ، اگلی کتابوں کی تصدیق کرنیوالا" کیا گیا ہے۔ حالانکہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت اگلی کتابوں میں قسم قسم کی تحریفات اور رنگ برنگ کی تبدیلیاں ہو چکی تھیں اس لئے یہ کہنا کہ قرآن مجید اگلی محرف کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی صحت وصداقت کی شہادت دیتا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ قرآن مجید نے جن کتابوں کی تصدیق کی ہے ان کے صحیح نسخے، نزول قرآن کے زمانہ میں ـــــ زیادہ نہ سہی۔ دو ایک ضرور موجود تھے تھوڑی دیر کیلئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس زمانہ میں صحف قدیمہ کے صحیح نسخے موجود تھے تو ایک پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ گذشتہ انبیاء کی تصدیق کرکے اور ان کی کتابوں کی شہادت دیکر ایک نبی اپنے دعوئ نبوت پر کیا حجت پیش کرسکتا ہے؟ فرض کیجئے! آج قادیان کی سرزمین سے پھر کوئی مدعی اٹھے، اور اپنی نبوت کا اس طرح پر دعویٰ کرے کہ میں نبی ہوں اور تمام پچھلے نبیوں پر ایمان لاتا ہوں، ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہوں تو کیا اس کا یہ اقرار، اس کے دعوی نبوت پر کوئی حجت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اس کے علاوہ یہ دعویٰ خود تحقیق طلب ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں صحف قدیمہ کے اصلی نسخے موجود بھی تھے یا نہیں؟ قرآن مجید کے اشارات، توراۃ

کی تصریحات اور محققین علما اہل کتاب کی شہادتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان صحیفوں میں قسم قسم کی تحریفات بہت پہلے ہو چکی تھیں اور عہد رسالت میں کوئی نسخہ صحیح توراۃ کا محفوظ نہ تھا۔ تمام شہادتوں کے پیش کرنے میں بات بہت لمبی ہو جائے گی، اسلئے اس موقعہ پر صرف قرآن مجید کی تفصیلات کو اختصار کے ساتھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ مسئلہ کے بعض اہم پہلو سامنے آجائیں اور "مصدقاً لما بین یدیہ" کی صحیح تاویل آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔

قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے صحف قدیمہ میں چند قسم کی تبدیلیاں کی تھیں۔

(۱) کتاب کے الگ الگ ٹکڑے کر دیئے تھے۔

(۲) بہت سی نئی باتیں داخل کر دی تھیں۔

(۳) بہت سی باتیں نکال دی تھیں۔

(۴) لفظوں میں تحریف کر دی تھی۔

(۵) بہت سی باتیں چھپا دی تھیں۔

(۶) کتابوں کو چھوڑ کر جادو وغیرہ کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

۱۔ قرآن مجید نے یہود کی اس شرارت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا۔

(۹۲ : ۶)

اے پیغمبر ان لوگوں سے پوچھو بھلا وہ کتاب (توراۃ جو) زمانے میں اتاری تو کس نے اتاری جسے موسیٰ لیکر آئے (اور وہ) لوگوں کے لئے نور اور ہدایت ہے (اور) تم نے اس کے (الگ الگ) ورق بنا رکھے ہیں (ان میں سے جو تمھارے مطلب کے ہیں) انکو ظاہر کرتے ہو اور بہتیرے (اوراق جو تمہارے مدعا کے خلاف ہیں ان کو چھپاتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے توراۃ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے تھے اور ان کی اس شرارت کا منشاء صرف یہ تھا کہ کتاب کا جو حصہ ان کے حق میں مفید ہو، اس کو ظاہر کریں اور جو حصہ مضر ہو یا جس سے کسی نفع کی توقع نہو، اس کو چھپادیں، یہود کی یہ عادت عام تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس شرارت کو بار بار بیان فرمایا ہے۔ وہ آیات الٰہی کی تجارت کرتے تھے اس لئے قدرتی طور پر وہی چیز سامنے لاتے تھے جس کی مانگ ہو اور ان کے لئے نفع بخش تجارت ہو سکے۔ پوری توراۃ کو ظاہر کرنے سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جس وقت توراۃ طلب فرمائی تو انھوں نے صرف چند اوراق پیش کئے، پوری کتاب سامنے نہ لائے۔

۲- قرآن مجید نے اس شرارت کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ۔ (۲ : ۷۸)	پس افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے تو کتاب لکھیں پھر (لوگوں سے) کہیں کہ یہ خدا کے ہاں سے (اتری) ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑے سے دام حاصل کریں پس افسوس ہے ان پر کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں لکھا اور (پھر) افسوس ہے ان پر کہ

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں بہت سی نئی باتیں دنیاوی فائدوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں سے لکھکر داخل کر دی تھیں۔

۳- اس شرارت کے متعلق قرآن مجید نے ان لفظوں میں خبر دی ہے

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا	لفظوں کو انکی جگہ سے پھیرتے ہیں اور ان کو جو نصیحت کیگئی تھی اس میں سے ایک (بڑا) حصہ بھلا بیٹھے اور (اے پیغمبر) اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ان میں سے چند لوگوں کے سوا سب کی (کسی نہ کسی) چوری کی اطلاع تم کو ہوتی ہی رہتی تھ

اِنَّا نَصٰرٰی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۵: ۱۳-۱۴)

تو ان لوگوں کے قصور معاف کرو اور ان سے درگزر کرو کیونکہ اللہ احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو نصاری کہتے ہیں (اسی طرح) ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا تو جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی (وہ بھی اس میں کا) بڑا حصہ بھلا بیٹھے تو (اسکی سزا میں) ہم نے ان میں عداوت اور کینے (کی آگ) کو روز قیامت تک بھڑکا دیا۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب کے لفظوں میں بھی تحریف کی تھی اور کتاب کے ایک معتد بہ حصہ کو اپنی بے پروائی اور غفلت اعتنا کی وجہ سے فراموش بھی کر دیا تھا جسکی پاداش میں وہ بدترین سزا کے مستحق ہوئے۔

۴۔ یہود کی یہ شرارت، نہایت ہی اہم شرارت ہے، اسلئے ذرا غور سے اس پر نظر ڈالنی چاہئے۔

تحریف کے کیا معنی ہیں؟ تحریف، حرف سے مشتق ہے۔ اور حرف کہتے ہیں طرف کو۔ پس تحریف کے معنی ہوئے کسی چیز کو اس کے صحیح رخ کی طرف سے دوسرے رخ کی طرف تحویل کر دینا۔ تحریف کی دو قسمیں ہیں: تحریف معنی، تحریف لفظ۔ پھر یہیں سے تحریف کی دو اور قسمیں ہو سکتی ہیں۔ تحریف کلمہ، تحریف عبارت۔ تحریف معنوی ظاہر ہے۔ لفظوں کو اپنی جگہ پر باقی رکھ کر معانی میں رد و بدل کرنے کا نام تحریف معنوی ہے۔ تحریف لفظی کے یہ معنی ہیں کہ کسی لفظ کی جگہ پر دوسرا لفظ رکھدیا جائے جو لفظ میں کتابت میں پہلے لفظ کے مشابہ ہو۔ اور تحریف عبارت کا یہ مطلب ہے کہ عبارتوں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر اسطرح مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم بنا کر رکھدیا جائے کہ "کتمان حق" کا مقصود حاصل ہو جائے۔

تحریف کی یہ تمام قسمیں یہودیوں کے صحیفوں میں موجود ہیں اور قرآن مجید نے ان تمام قسموں کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔

بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ یہودیوں نے صرف معانی میں تحریف کی تھی، الفاظ اور ترتیب

میں کوئی رد وبدل نہیں کیا تھا۔ لیکن حقیقت میں قرآن کا حسن ظن ہے۔ نیک آدمی دوسروں کو بھی نیک ہی سمجھتا ہے اس لئے کبھی کسی کی طرف کسی معیوب بات کو منسوب کرنا گوارا نہیں کرتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہود نے صرف معنوی تحریف پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ کتاب کے لفظوں اور اس کی ترتیب کو بھی بدل دیا تھا۔ تورات پڑھنے والوں پر یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی۔ اگر ان صحیفوں کے لفظوں اور ترتیبوں میں بھی تحریف نہیں ہوئی تھی تو ان کے نسخوں میں اسقدر اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟ محققین علماء اہل کتاب ان تمام تحریفات کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اور صرف قرآن مجید کی تصریحات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

یہود کی اس شرارت کو قرآن مجید نے حسب ذیل لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ	اپنے عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان کو دھتکار دیا اور ان کے دلوں
قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا	کو سخت کردیا (تورات کے) لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور
حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (۵: ۱۳)	ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے

اس آیت کے پہلے آیت میثاق ہے جسمیں "ایمان بالرسل" کا بیان ہے۔ تب انھوں نے اس میثاق کو توڑ دیا تو ان پر لعنت کی گئی۔ ان کے دل پتھر کے ہوگئے اور وہ حق کو چھپانے کے لئے لفظوں کو انکی جگہ سے ہٹا کر دُسری جگہ پر رکھنے لگے۔

ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا گیا ہے۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ	(مسلمانو!) کیا تم کو توقع ہے کہ (یہود) تمہاری بات تسلیم کرلینگے، اور انکا
فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ	حال یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوگزرے ہیں کہ کلام خدا
مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ وَإِذَا لَقُوا	سنتے تھے پھر اس کو سمجھے پیچھے دیدہ و دانستہ کچھ کا کچھ کردیتے تھے اور
الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ	جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ایمان

إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوٓا۟ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوكُم بِهِۦ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

(۲ : ۷۶-۷۵)

ملتے ہیں اور جب تنہائی میں ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جو کچھ (توراۃ میں) خدا نے تم پر ظاہر کیا ہے کیا تم مسلمانوں کو اس کی خبر کئے دیتے ہو کہ (کل) کو تمہارے رب کے روبرو اسی بات کی سند پکڑ کر تم سے جھگڑیں تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے (لیکن) کیا ان لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم کہ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ (سب کچھ) جانتا ہے۔

سورہ نساء میں آیا ہے:

مِّنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِۦ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَٱسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَٰعِنَا لَيًّۢا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى ٱلدِّينِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَٱسْمَعْ وَٱنظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ

(۴ : ۴۶)

(اے پیغمبر) یہود میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو الفاظ کو ان کی جگہ سے بدلتے ہیں اور اپنی زبان مروڑ کر اور دین میں طعن کی راہ سے سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا کہہ کر (تم) خطاب کرتے ہیں اور اگر وہ سمعنا و اطعنا اور اسمع اور انظرنا کہہ کر خطاب کرتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات بھی سیدھی ہوتی

سورہ مائدہ میں فرمایا گیا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ

اے پیغمبر جو لوگ کفر پر لپکتے ہیں ان کی وجہ سے تم آزردہ خاطر نہ ہو (یہ دو قسم کے لوگ ہیں) بعض تو ایسے (منافق) ہیں جو اپنے منہ سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ہیں (کہ مطلق) ایمان نہیں لائے۔ اور بعض یہودی ہیں جھوٹی باتوں کی کنسوئیاں لیتے پھرتے ہیں (اور) کنسوئیاں (بھی) لیتے پھرتے ہیں (تو) دوسرے لوگوں کے واسطے جو (ہنوز)

کی ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ یہود کے صحیفوں میں قسم قسم کی تحریفات ہو چکی تھیں، کوئی کتاب بھی اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہ گئی تھی اسلئے قرآن مجید یا پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان محرف کتابوں کا مصدق قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس غلط فہمی کا باعث زیادہ تر یہ ہے کہ اس لفظ کی حقیقت پر کلام عرب کی روشنی میں غور نہیں گیا۔ اسمیں کوئی شبہہ نہیں کہ مصدق کے معنی تصدیق کرنیوالے کے ہیں، اور یہی معنی عام طور پر شائع بھی ہیں، اور سچ پوچھئے تو معنی کی اسی عمومیت نے لوگوں کو مغالطہ میں بھی ڈالدیا۔ ورنہ عربی زبان میں یہ لفظ عموماً دو معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایک تصدیق کرنا یعنی کسی آدمی یا کسی بات کے سچے ہونے کی شہادت دینا، دوسرے کسی کو اس کے خیال و امید کے مطابق سچا ثابت کر دینا۔ لفظ کے اس دوسرے معنی کی طرف کم توجہ کی گئی۔ حالانکہ زبان عرب میں اسکا استعمال بھی عام ہے۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے۔

فدت نفسی وما ملکت یمینی	فوارس صدقت فیہم ظنونی
ان سواروں پر میری جان اور مال قربان ہو	جنھوں نے میرے خیالات کو جو انکی نسبت تھے سچ کر دیا

قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ (سبا)	اور شیطان نے (جو) ان (لوگوں) کے بارے میں اپنی رائے (لگائی تھی) حقیقت میں اس نے اس رائے کو سچ کر دکھایا کہ یہ لوگ اسی کے پیچھے ہولیے

امام رازیؒ وغیرہ اجلہ مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں بغیر تخصیص کے اس دوسرے معنی کی طرف بھی اشارات کئے ہیں، لیکن چونکہ ان بزرگوں نے نظم کلام اور مواقع آیت سے استدلال نہیں فرمایا۔ اس لئے ان کے نزدیک بھی حقیقت مشتبہ رہگئی اور بات پورے طور سے نہ کھل سکی۔

قرآن مجید میں جن مواقع پر یہ لفظ استعمال فرمایا گیا ہے، ان کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام جگہوں میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ آیت حقیقت میں دعوائے نبوت

پر ایک اہم دلیل ہے، اس سے نبوت کا اثبات مقصود ہے۔ یہود کی محرف کتابوں کی تصدیق وشہادت مطلوب نہیں ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور قرآن مجید کے نزول کی بشارتیں صحف قدیمہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی تھیں، اور جس طریقہ سے بیان کی گئی تھیں ٹھیک اسی طریقہ سے آپ کا ظہور اور قرآن مجید کا نزول ہوا۔ اس لئے پیغمبر اسلام اور قرآن مجید، توراۃ کی بشارتوں کے عین مطابق اس کی خبروں کو سچا ثابت کرنے والے ہیں۔ پس اگر اہل کتاب قرآن اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کرتے ہیں، تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے، پیغمبر کی نبوت میں کوئی شبہہ نہیں۔ اسی حقیقت کو سورہ بقرہ میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲ : ۱۰۰)

اور جب ان کے پاس خدا کیطرف سے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے (اور وہ) اس کتاب (توراۃ) کو، جو ان (یہود) کے پاس ہے سچا ثابت کرنے والے ہیں، تو اہل کتاب ہی سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (توراۃ) کو (جس میں ان رسول کی پیشین گوئی ہے) ایسا پیٹھ پیچھے پھینکا کہ گویا ان کو کچھ خبر ہی نہیں

یعنی جب ان لوگوں کے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک تورات کی خبروں کے مطابق تشریف لائے تو انھوں نے خود اپنی کتاب سے روگردانی اختیار کرلی اور اسکی تمام پیشین گوئیوں کا اس طرح انکار کردیا کہ گویا اسے جانتے ہی نہ تھے

اس آیت کے ذرا پہلے اللہ تعالی نے یہ بیان فرمایا ہے۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

کیا ان یہود نے بشارت پر کمربا ندھی ہے کہ جب کبھی کوئی قول کر لیتے ہیں تو ان میں کا کوئی نہ کوئی فریق اسکو پس پشت ڈالکر رکھدیا کرتا ہے بلکہ ان میں کے اکثر تو ایمان ہی نہیں رکھتے۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد کر چکی تھی، لیکن وضوح حق کے بعد محض اپنی شرارتوں کی وجہ سے اس عہد کو توڑ دیا اور ایمان سے محروم رہی۔

سورہ آل عمران میں بھی آنحضور صلعم کی نبوت پر ایمان لانے کے متعلق یہودیوں کا عہد مذکور ہے۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ
إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ
فَاحْذَرُوا وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ
فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيمٌ
(۵ : ۴۱)

تمہارے پاس (تک) نہیں آئے۔ الفاظ کو ان کے ٹھکانے سے بے جگہ کرتے ہیں (اور لوگوں سے) کہتے ہیں کہ (ہم جو کہتے ہیں اگر (محمد کی طرف سے) تم کو یہی (حکم) دیا جائے تو اس کو تسلیم کر لینا اور اگر تم کو (بعینہ) یہی حکم نہ دیا جائے تو (اس سے) احتیاط کرنا اور اے پیغمبر! جسکو اللہ (بے دینی کی) بلا میں مبتلا رکھنا چاہے تو اس کے لئے خدا پر تمہارا کچھ بھی زور نہیں چل سکتا یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا بھی ان کے دلوں کو پاک کرنا نہیں چاہتا ان لوگوں کی دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے۔

"من بعد مواضعہ" پر غور کرو، ہمارے بعض علماء نے جو تحریف کے معنی، صرف معنوی تاویل کے قرار دیئے ہیں وہ اس تشریح کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ صاف پکار رہے ہیں کہ اصل کتاب میں الفاظ ٹھیک اپنی جگہوں میں رکھے گئے تھے۔ جہاں خدا نے چاہا تھا۔ لیکن اہل کتاب نے شرارت سے ان لفظوں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہوں پر رکھ دیا۔

یرمیاہ نبی نے بھی یہود کی اس شرارت کو صاف لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

"تم کیونکر کہتے ہو کہ ہم تو دانشمند ہیں اور خداوند کی شریعت ہمارے پاس ہے لیکن دیکھ لکھنے والوں کے باطل قلم نے بطالت پیدا کی ہے۔ دانشمند شرمندہ ہوئے وہ حیران ہوئے اور پکڑے گئے، دیکھ انھوں نے خداوند کے کلام کو رد کیا۔ ان میں کیسی دانائی ہے۔ پس میں ان کی بیٹوں اور دن کو اور ان کے کھیت ان کو دونگا جو ان پر قابض ہوں گے۔ کیونکہ وہ سب چھوٹے سے بڑے تک لالچی ہیں اور نبی سے کاہن تک ہر ایک دغا باز ہے۔ (۸:۸-۱۰)

کیا ان تشریحات کے بعد بھی اہل کتاب کے متعلق اس حسن ظن کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ ان کا دامن لفظی تحریف کے بدنما دھبوں سے پاک تھا۔

۵۔ یہود کی اس شرارت کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ	اور اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل فرمایا ہے (اور وہ) اس
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا	(کتاب توراۃ) کا مصدق ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی اسکی پیشین گوئیوں
بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ وَلَا	کو سچا ثابت کرنیوالا ہے) اور (سب سے) پہلے اس کے منکر نہ بنو اور ہماری
تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ	آیتوں میں تحریف کرکے ان) کے معاوضہ میں تھوڑی قیمت حاصل
تَعْلَمُوْنَ ۝	نہ کرو اور ہم ہی سے ڈرتے رہو اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ گڈمڈ
(۲ : ۴۱ - ۴۲)	نہ کرو اور جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ۔

اس آیت میں یہود کے کتمان حق کی کوششوں کا ذکر نہایت واضح لفظوں میں موجود ہے۔

۶۔ قرآن مجید نے ان کی اس شرارت کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اور جب ان کے پاس خدا کیطرف سے رسول (محمد) آئے (اور وہ) اس
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ	کتاب (توراۃ) کی جو ان (یہود) کے پاس ہے مصدق ہیں (یعنی انکی
اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ	خبروں کو سچا ثابت کرنیوالے ہیں) تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ
كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ	کی کتاب (توراۃ) کو جسمیں اس رسول کی پیشین گوئی بھی ہے) ایسا
عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ	پیٹھ پیچھے پھینکا کہ گویا ان کو کچھ خبر ہی نہیں اور ان کے ڈھکوسلوں
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ	کے پیچھے پڑ گئے جنکو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا پڑھایا
السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ	کرتے تھے حالانکہ سلیمان سے کفر کی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی بلکہ کفر
وَمَارُوْتَ (۲ : ۱۰۰ - ۱۰۱)	شیاطین نے کیا تھا لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے (اور اس کے علاوہ ان

[illegible]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس وقت نبی موعود آیا، اور ٹھیک یہود کے صحیفوں میں لکھے ہوئے خدا کے وعدوں کے مطابق آیا تو انھوں نے اپنی کتاب پس پشت ڈالدی اور سحر و عزائم وغیرہ سفلی عملیات میں منہمک ہو گئے اور انہی شیطانی تعلیمات کو پھیلانا شروع کر دیا قرآن مجید

اس آیت میں بے انصاف لوگوں سے اہل کتاب مراد ہیں، ان کو اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے اور اس اسلام کی طرف جس کی پیشین گوئی ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن وہ اسلام کا انکار کرکے اللہ پر بہتان باندھتے ہیں، اس بڑھکر ظالم کون ہوگا؟

سورہ قصص میں بھی آیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ وَ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ

[illegible]

جن لوگوں کو قرآن سے پہلے ہم نے کتاب عنایت کی وہ تو اس (قرآن) پر ایمان لے آتے ہیں اور جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو بول اٹھتے ہیں کہ ہم کو تو اس کا یقین آگیا کچھ شک نہیں یہ برحق ہے اور ہمارے پروردگار کیطرف سے نازل ہوا ہے حقیقت میں

یعنی ان کی کتابوں میں پیغمبر اسلام اور قرآن مجید کا ذکر اتنی تصریح کے ساتھ موجود تھا کہ یہ دونوں چیزیں ان کے لئے بالکل جانی اور بوجھی ہوئی تھیں ، یہی وجہ تھی کہ جب ان کو قرآن سنایا گیا تو سمجھدار اور حق پسند لوگ اس کا انکار نہ کرسکے۔

سورہ نساء میں آیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ

اے اہل کتاب (قرآن) جو ہم نے نازل فرمایا ہے اور وہ اس کتاب کو جو تمھارے پاس ہے سچا ثابت کرنیوالا ہے (یعنی اسکی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے) اسپر ایمان لاؤ مگر اس سے پہلے کہ (لوگوں کے) منہ بگاڑ کر ہم الٹے انکی گدیوں میں لگادیں یا جسطرح ہم نے اصحاب سبت کو پھٹکار دیا تھا اسی طرح ان کو بھی پھٹکار دیں۔

غور کرو اتنی شدید وعید یقیناً کسی ایسی ہی اہم نافرمانی پر ہوسکتی ہے جو ان پر پہلے سے فرض ہوچکی ہو۔ توراۃ میں یہودیوں کو صاف طریقہ سے بتا دیا گیا تھا کہ ایک نبی آخر الزماں آئیگا جو دین کو پورا کرے گا، اور

احکام کے ناقابل برداشت بوجھ اور گلوگیر پھندوں کو دور کرے گا۔ جب یہ نبی آئے تو تم اس کی پیروی کرنا۔ لیکن جس وقت یہ نبی آیا۔ اور ٹھیک اگلے نبیوں کی پیشین گویوں کے مطابق آیا اور تمام صحف سماویہ کی خبروں کو سچا ثابت کرتا ہوا آیا۔ تو اہل کتاب باوجود علم و یقین کے اسکا انکار کر بیٹھے۔ انکی صریح حکم کی خلاف ورزی یقیناً انہی شدید وعید کی مستحق ہوسکتی ہے۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ "مصدقا لما بین یدیہ" کی یہ تاویل کہ وہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے" کوئی جمنی ہوئی تاویل نہیں ہے۔ آیت کا زور اسی صورت میں واضح ہوتا ہے جب کہ "مصدق لما بین یدیہ" کو: عوائے نبوت پر دلیل قرار دیا جائے۔ اور اس کی وہی تاویل کیجائے جو ہم نے سطور بالا میں عرض کی ہے

تفسیر سورۃ الفیل

(عربی)

اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی جس سے سورہ کی تفسیر میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ مولانا نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کرکے، تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کردیا ہے، واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بھی عینی شاہدوں کی شہادتیں جمع کرکے اصل حقیقت آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں

کتابت و طباعت و کاغذ بہترین۔ قیمت: ۸/

منیجر

سورہ بقرہ میں ایک دوسری جگہ قرآن مجید کے متعلق آیا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَٰبٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا۟ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۔ فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا۟ كَفَرُوا۟ بِهِۦ فَلَعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ (۲-۸۸)	اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس قرآن آیا (تو وہ) اس (کتاب تورات) کو جو ان کے پاس ہے سچا ثابت کرنیوالا ہے اور اس سے پہلے (اسی کی توقع پر) کافروں کے مقابلہ میں اپنی فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے تو جب وہ چیز کہ جسکو جانے پہچانے ہوئے تھے آموجود ہوئی تو لگے اس سے انکار کرنے۔ پس کافروں پر خدا کی لعنت۔

یعنی جب یہ کتاب ٹھیک ان وعدوں کے مطابق آئی جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے۔ اور جسکی توقع پر وہ کافروں کے مقابلہ میں دعائیں مانگتے تھے کہ پیغمبر موعود ظاہر ہوں تو ہم ان کی تائید سے ان پر غالب آئیں لیکن جس وقت یہ کتاب آگئی اور انھوں نے ٹھیک توراۃ کے بیان کے مطابق اس کو پورا پورا پہچان بھی لیا تو صاف انکار کر گئے۔

سورہ یوسف میں آیا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِى قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُو۟لِى ٱلْأَلْبَٰبِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ ٱلَّذِى بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَىْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ	اس میں شک نہیں کہ عقل والوں کیلئے ان لوگوں کے حالات میں (بڑی) عبرت ہے۔ یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات تو ہے نہیں، بلکہ جو (آسمانی) کتابیں اس کے سامنے (موجود) ہیں انکی تصدیق ہے اور اسمیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت۔

اس جگہ قرآن مجید کے متعلق تصدیق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر یہ لفظ اثبات قرآن کے لئے نہیں لایا گیا ہے بلکہ محض فوائد قرآن کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جو کتاب تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق ہو، جسمیں مومنوں کے لئے ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت و رحمت ہو، وہ کتاب بنائی ہوئی بات، یا گڑھی ہوئی داستان کیونکر ہو سکتی ہے۔

سورہ احقاف میں جنوں کی زبان سے بیان فرمایا گیا ہے۔

قَالُوا۟ يَٰقَوْمَنَآ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَٰبًا أُنزِلَ مِنۢ بَعْدِ	کہنے لگے کہ بھائیو! ہم ایک کتاب سن آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد

مُوسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ — نازل ہوئی ہے (اگلی آسمانی کتابیں جو) اسکے زمانہ میں موجود ہیں انکے

اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — عین مطابق ہے دین حق بتاتی اور سیدھا رستہ دکھاتی ہے۔

یعنی یہ کتاب بھی، دین حق کی ہدایت اور صراط مستقیم کی رہنمائی میں بالکل موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے

انداز پر ہے۔ پس جس طرح وہ حق تھی۔ اسی طرح یہ بھی حق ہے۔

سورۃ الصف میں آیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ

(ترجمہ)

اور (اے پیغمبر لوگوں کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے (بنی اسرائیل سے) کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا (آیا) ہوں (یہ کتاب) تورات جو میرے سامنے موجود ہے (میں) اسکو سچا ثابت کرنیوالا ہوں (یعنی ٹھیک اسکی پیشین گوئیوں کے مطابق ہوں) اور (ایک اور) پیغمبر کی خوشخبری سناتا ہوں جو میرے بعد آئینگے (اور)

عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سامنے اپنی نبوت پر دو طرح سے استدلال کیا سب سے پہلے یہ فرمایا کہ توراۃ میں بنی اسرائیل کے جس آخری پیغمبر کی بشارت دی گئی ہے۔ میں عین اس کے مطابق ہوں۔ اسلئے میری نبوت میں کس طرح شبہ کر سکتے ہو؟ اس کے بعد خاتم الانبیا صلعم کی بشارت سنائی جس کی خوشخبری، بنی اسرائیل کو بہت پہلے موسیٰ علیہ السلام بھی سنا چکے تھے۔ اور جس سے اہل کتاب اچھی طرح واقف تھے۔

چنانچہ اس کے بعد ہی یہ آیت آتی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

(سورۃ الصف)

اور اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا کہ اسکو اسلام کیطرف بلایا جاتا ہو اور وہ (الٹا) خدا پر جھوٹ بہتان باندھے اور اللہ بے انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک کر) بجھا دیں اور اللہ تو اپنے نور کو (کامل طور پر) پھیلا کر رہیگا گو کافر

اقسام قرآن

از جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً چاند، سورج، تارے، آسمان، روز، شب وغیرہ۔ ضرورت ہے کہ ان قسموں کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ ذیل میں ہم استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف امعان فی اقسام القرآن سے اس کے متعلق بعض ضروری مباحث کا خلاصہ اپنے لفظوں میں پیش کرینگے۔

اقسام قرآن پر معترضین کو تین طرح کے شبہات ہیں۔

(۱) قسم کھانا فی نفسہ خدا کی جلالت شان کے منافی ہے۔ قسم وہ شخص کھاتا ہے جس کو اپنی نسبت بدگمانی ہوتی ہے کہ لوگ اس کی بات باور نہ کریں گے۔ خود قرآن سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ زیادہ قسم کھانا ذلت نفس کی دلیل ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ — ہر قسم کھانے والے ذلیل کی بات نہ مانو

(۲) قرآن مجید میں قسمیں مہتم بالشان چیزوں پر کھائی گئی ہیں مثلاً توحید، رسالت، معاد وغیرہ۔ لیکن یہ کس کے لئے سودمند ہیں؟ منکرین کے لئے؟ منکرین کے لئے یہ قسمیں سودمند نہیں ہوسکتی ہیں۔ ان کو منوانے کے لئے دلائل کی ضرورت ہے۔ اور قسمیں دلیل و برہان نہیں ہوسکتیں۔ پھر کیا مومن کے لئے؟ ظاہر ہے کہ مومن کے لئے بھی نہیں کیونکہ ان تمام امور کی تصدیق کرچکا ہے، اب وہ کسی مزید تاکید یا قسم کا منتظر نہیں ہے

(۳) آدمی جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے ان کی عظمت و تقدیس کی وجہ سے قسم کھاتا ہے۔ پھر خدا نے کیوں قسمیں کھائیں۔ آسمان و زمین کی کوئی چیز اس سے بڑھکر تو نہیں ہوسکتی؟ علاوہ ازیں قرآن مجید

میں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ عموماً نہایت ادنیٰ درجہ کی چیزیں ہیں مثلاً انجیر و زیتون وغیرہ۔

مفسرین نے ان شبہات کے مختلف جوابات دئے ہیں جنکا ماحصل یہ ہے۔

(۱) قسم کھانے کا عرب میں عام رواج تھا اور قسم کے ساتھ مدعا کو پیش کرنا معاملت کا ایک طریقہ تھا چونکہ قرآن مجید عرب کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے ان کی تمام خصوصیات اس

(۲) جب آنحضور صلعم توحید، معاد، نبوت وغیرہ کے اثبات پر قرآن مجید کی آیتیں پیش کرتے ومشرکین کہتے کہ "یہ باتیں بالکل غلط ہیں، محمد (صلعم) صرف زور بیان اور قوت استدلال سے غلط ثابت کر لیتے ہیں" ان کے پاس شبہہ کے دفع کرنیکا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا کہ قسمیں کھا کر یقین دلایا جائے کہ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن کا دعویٰ بالکل واضح اور سچا ہے۔ خواہ مخواہ کی طلسم بندی نہیں ہے۔

(۳) جو چیزیں بظاہر ادنیٰ اور بے حقیقت نظر آتی ہیں وہ درحقیقت نہایت قیمتی اور عظیم الشان ہیں انجیر و زیتون بظاہر نہایت حقیر ہیں لیکن اپنے فوائد و اثرات کے لحاظ سے نہایت بیش قیمت

یہ توجیہات جو اوپر بیان ہوئی ہیں درحقیقت امام رازی رحمہ اللہ کی ہیں۔ جو انھوں تفسیر میں جا بجا بیان کی ہیں۔ دوسرے مفسرین کا جواب بھی یہی ہے۔ البتہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ان شبہات کے جواب کے لئے بعض دوسرے پہلو اختیار کئے ہیں۔ ان کے جواب کی بنیاد دو واصد

۱۔ خداوند تعالیٰ نے جہاں کہیں قسم کھائی ہے اپنی ذات وصفات اور آیات کی قسم کھائی ہے۔ کی جو قسم کھائی وہ بھی دراصل اپنی ذات ہی کی قسم ہے۔ کیونکہ تمام مخلوقات اس کی نشانیوں کی حیثیت

۲۔ ان تمام قسموں میں مقصود دراصل ان کے مقسم علیہ ہیں۔ اور معلوم ہے کہ مقسم علیہ نہایت مطالب ہیں مثلاً توحید، نبوت، معاد وغیرہ

ان تمام قسموں پر جو شبہہ پیدا ہوتا تھا اور جو اوپر مذکور ہوا۔ ان جوابات سے علامہ ابن قیمؒ نے اسکا

کرنا چاہا ہے لیکن، جیسا کہ ظاہر ہے وہ شبہ علی حالہ قائم ہے۔ اگر قسم اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو اشرف و بزرگ ہو تو اشیاء کے مخلوق ہونے کی وجہ سے وہ اس شرف سے محروم نہیں ہو جائے گی جو مقسم بہ ہونے کی وجہ سے اس کو حاصل ہوگا اور کسی شئے کا اس درجہ بلند رتبہ ہونا کہ خالق سماوات و ارض اس کی قسم کھائے ایک ایسی بات ہے جس پر علامہ کے ان جوابات کے باوجود طبیعت کھٹکتی ہے۔

اقسام قرآن کی نسبت جو شبہات و اعتراضات پیدا ہوئے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ کلی طور پر نفس قسم سے مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جائے) کے لئے عزت و تکریم فرض کر لی گئی یعنی اگر کسی چیز کی قسم کھائی گئی تو محض اس کی قسم کھانا اس کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں۔

(۱) قسم میں مقسم بہ کی تعظیم و تکریم کا پہلو ضروری نہیں۔ بلاشبہ بعض قسموں میں مقسم بہ کی تعظیم مضمر ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا لیکن اس سے یہ کلیہ بنا لینا صحیح نہیں کہ ہر قسم میں مقسم بہ کی عظمت کا پہلو ضروری ہے۔

(۲) قرآن پاک میں خداوند تعالیٰ نے مخلوقات کی جو قسمیں کھائی ہیں وہ تمام تر توحید، معاد اور نبوت وغیرہ پر دلائل ہیں۔ تعظیمی قسمیں نہیں ہیں۔

(۳) قسم کی دو قسمیں ہیں محمود، غیر محمود مطلقاً ممانعت غیر محمود قسم کی بابت وارد ہے۔

ان اجمالات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے قسم کی ضرورت اس کی حقیقت اور اس کی تاریخ پر غور کرنا چاہیئے۔

قسم کی تاریخ اور اسکی ضرورت | یہ ایک عام طریقہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی اہم واقعہ بیان کرتا یا کوئی وعدہ کرتا ہے تو اس کی صحت و تصدیق کے لئے بسا اوقات کسی کی شہادت پیش کرتا ہے تاکہ مخاطب کو اس کی بات کا یقین ہو جائے اور اس کے وعدہ پر اعتماد کرے خصوصاً اہم معاملات میں تو اس کی ضرورت نہایت ناگزیر ہوتی ہے۔ جب دو قوموں کے درمیان کوئی معاہدہ طے پائے۔ یا بادشاہ اور رعایا میں عہد و پیمان

یا افراد و اشخاص کے مابین کوئی قول و اقرار ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ اس پیمان کو معتبر شہادتوں سے موثق کیا
جس طرح آج عہد و پیمان کے وقت توثیق کے لئے گواہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ا
ابتداءً بھی انہی تمدنی ضروریات کی وجہ سے شہادت کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ اور جب تمدنی ضر
بار بار پیش آئیں تو لازماً لوگوں کو کسی واقعہ کی توثیق و تاکید کیلئے خاص خاص الفاظ اور خاص خاص ط
کرنے پڑے۔ یہ طریقے عموماً دو قسم کے ہیں۔

۱۔ بعض خاص قسم کے الفاظ۔

۲۔ بعض خاص قسم کے طریقے۔

ہم پہلے بعض مخصوص طریقوں کو جو رومیوں، عبرانیوں، عربوں میں رائج تھے لکھتے ہیں
پر اُن پر بحث کرینگے۔

(۱) عرب میں دستور تھا کہ معاہدہ کے وقت جب باہمدگر دوسرے کا دایاں ہاتھ پکڑ —
معاہدہ کی کامل توثیق ہو جاتی گویا وہ اس امر کا اقرار کر لیتے کہ معاملہ کی پوری ذمہ داری ہم نے اٹھا لی
ے قسم کو یمین بھی کہتے ہیں اور ایک عرب شاعر حماس نے اسی حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے۔

ساودی حق جاری ویدی رھن فعالی

قسم میں یمین سے کفالت و ضمانت کا مفہوم پیدا ہوا، جو اب تک بیعت وغیرہ کی شکلوں میں نما
۲۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب زیادہ آدمی شریک معاہدہ ہوتے تو ایک طشت میں پانی بھرتے ا
میں تمام شرکاء پیمان اپنے اپنے دائیں ہاتھ ڈالتے اسطرح گویا ہر شخص ایک دوسرے کو اپنا دایاں ہاتھ دیکر
کی توثیق کرتا۔ کبھی یہ مشترک چیز پانی کی جگہ عطر ہوتی اس کو سب ملتے۔ اور شریک پیمان ہوتے کبھی کوئی
ذبح کرتے اور اس کا خون فریقین معاہدہ اپنے اوپر چھڑک لیتے۔ اس میں گویا اشارہ ہوتا تھا کہ اس ع
حفاظت کے لئے فریقین اپنے خون بہا دیں گے۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ متعاہدین باہمدگر اپنی رسیاں

ایک دوسرے کے حلیف بنتے تھے چنانچہ عربی میں حبل (رسّی) کا لفظ عہد و ذمہ کے معنی میں عام طور پر استعمال ہونے لگا، قرآن پاک میں ہے بِحَبْلٍ مِنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ

امرالقیس کہتا ہے۔

انی بحبلک واصل حبلی ۔۔۔ وبریش نبلک رائش نبلی

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ عربوں میں عہد و پیمان کی توثیق کے کیا کیا طریقے رائج تھے لیکن ان کا سب سے زیادہ وسیع اور عام طریقہ شہادت کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ اس درجہ وسیع تھا کہ اہل عرب خدا کی شہادت کے علاوہ دوسری اشیائے کائنات کی بھی شہادت پیش کرتے تھے۔ اس کی مثال ہماری زبان میں بھی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد ہے، در و دیوار گواہ ہیں، میدان کارزار شاہد ہے" عربوں میں یہ طریقہ بہت عام تھا۔ مثلاً راعی کا شعر ہے۔

ان السماء وان الریح شاهدة ۔۔۔ والارض تشهد والایام والبلد

آسمان، ہوا، زمین، زمانہ اور شہر گواہ ہیں۔

لقد جزیت بنی بدر ببغیتهم ۔۔۔ یوم الهباءة یوما ما له قود

میں نے بنی بدر کو ہباءہ کی لڑائی میں ان کی سرکشی کی پاداش میں، ایسی سزا دی جس کا انتقام نہیں ہو سکتا۔

نابغہ کا شعر ہے۔

والخیل تعلم انا فی تجالدنا ۔۔۔ عند الطعان اولو بوسی وانعم

گھوڑے گواہ ہیں کہ ہم لڑائی میں قہر بھی ہیں اور انعام بھی۔

عنترہ کہتا ہے۔

والخیل تعلم والفوارس اننی ۔۔۔ فرقت جمعهم بطعنة فیصل

گھوڑے اور شہسوار گواہ ہیں کہ میں نے ایک فیصلہ کن حملہ سے حریف کی جماعت پراگندہ کر دی۔

ان اشعار پر غور کرو۔ گھوڑوں، سواروں، زمین، آسمان، ہوا وغیرہ کو گواہی میں پیش کیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر تم ان سے پوچھ سکو اور یہ جواب دے سکیں تو یہ ہمارے دعوی کی تائید میں فوراً بول اٹھیں۔

فضل بن عیسیٰ بن ابان نے اپنی ایک تقریر میں بھی یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔

سل الارض فقل من شق انهارك وغرس اشجارك وجنى ثمارك فان لم تجبك حوارا اجابتك اعتبارا

زمین سے پوچھو نہریں کس نے جاری کیں درخت کس نے لگائے پھل کس نے چنے تو اگر وہ زبان قال سے نہیں تو زبان حال سے تمہیں ضرور جواب دیگی۔

انجیل صحیفہ ایوب ص ۱۲ عدد ۷ تا ۱۰ میں ہے۔

"حیوانوں سے پوچھ اور وہ تجھے سکھائیں گے اور ہوا کے پرندوں سے دریافت کر اور وہ تجھے بتائیں گے۔ یا زمین سے بات کر اور وہ تجھے سکھائے گی اور سمندر کی مچھلیاں تجھ سے بیان کریں گی"

چونکہ بیان کے اس طریقہ سے کسی واقعہ کی صحت و تصدیق اور مخاطب کو یقین دلانا پیش نظر تھا اس لئے آہستہ آہستہ یہ طریقہ قسم کے معنی میں مستعمل ہونے لگا یعنی شہادت پیش کرنا اور قسم کھانا بالکل مترادف ہوگیا۔

عمرو ابن معدی کرب کا ایک شعر ہے۔

الله يعلم ما تركت قتالهم حتى علوا فرسي باشقر مزبد

اللہ گواہ ہے کہ میں نے ان سے لڑنا نہیں چھوڑا تا آنکہ ان کے نیزوں نے میرے گھوڑے کو لہولہان کر دیا۔

اس شعر میں "خدا جانتا ہے" کا لفظ شاعر نے قسم کے معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی خدا کی قسم میں نے لڑنا نہیں چھوڑا۔ اردو میں بھی قسم کے مواقع پر کہا جاتا ہے۔ "اللہ جانتا ہے"، "خدا گواہ ہے"، "اللہ شاہد ہے" قرآن پاک نے بھی متعدد جگہوں میں شہادت کے الفاظ قسم کے معنی میں استعمال کئے ہیں۔

سورہ منافقون میں ہے۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ	جب تمھارے پاس منافقین آتے ہیں کہتے ہیں ہم گواہی
لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ	دیتے ہیں کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے اور خدا جانتا ہے کہ
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ	بیشک تو اس کا رسول ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ منافقین
اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ	جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسم کو ڈھال بنا رکھا ہے (اسکی
سَبِيلِ اللَّهِ - (۱-۲)	آڑ میں لوگوں کو) راہ خدا سے روکتے ہیں۔

جو لفظ اس آیت میں منافقین کی زبان سے نقل کیا وہ نشہد کا لفظ ہے۔ پھر آگے فرمایا منافقین اپنی قسم کو سپر بناتے ہیں۔ حالانکہ قسم کا کوئی لفظ منافقین نے استعمال نہیں کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی نشہد کے لفظ کو خدا نے قسم قرار دیا۔

سورہ نور میں ایک جگہ ہے

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ	عورت کے (سر پر) سے اس طرح پر سزا ٹل سکتی ہے کہ
أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ	وہ چار بار خدا کی قسم کھا کر بیان کرے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔

اس آیت میں بصراحت شہادت کا لفظ قسم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ	اور وہ اپنے دلی ارادات پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے حالانکہ وہ
أَلَدُّ الْخِصَامِ (بقرہ)	تمھارے) دشمنوں میں (سب سے زیادہ) جھگڑالو ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی قسم کھانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز شہادت اور گواہی میں پیش کی جاتی ہے۔

(باقی)

مقالات

سیرت شبلی

۲

جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے۔ ال۔ ال بی۔ علیگ

مولانا کی ولادت اور وطن

کہتے ہیں کہ ایک شبانہ روز میں یہ زمین اپنے محور پر ایک چکر لگا لیتی ہے اور ایک شمسی سال میں آفتاب کے گرد اپنا دورہ پورا کرتی ہے۔ لیکن اسی ۲۴ گھنٹے اور سال بھر کے دور میں ہر روز دو بار وقت اور ہر سال تین مرتبہ موسم بدلتا ہے۔ تاریخ عالم کے مبصرین کی رائے میں ٹھیک اسی طرح زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے اندر انسانی جماعت میں انقلاب کی ایک لہر اٹھتی ہے دنیا اپنی کینچلی بدلنے پر تیار ہو جاتی ہے اور جس طرح ۲۴ گھنٹوں میں صبح و شام کے وہ چند لمحے جبکہ دونوں وقت ملتے ہیں یا سال کے وہ چند دن جبکہ ایک موسم کا خاتمہ اور دوسرے کا آغاز ہوتا ہے۔ یا عمر انسانی کے وہ ایام تحویل جہاں طفلی و شباب کی سرحدیں ملتی ہیں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ عالم کا وہ ہنگامہ خیز دور جبکہ ایک تمدن اپنی عمر طبعی ختم کر چکتا ہے اور تنوع و تغیر کی خو گر دنیا پھر نئی بساط بچھانا چاہتی ہے۔ بہتم بالشان اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو ستاروں کی تاثیر کہو یا نظام فطرت کا طبعی قانون بہرحال سنت الٰہی یہی ہے کہ جو ہستیاں اس طرح کے دور انقلاب میں منصہ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں وہ اکثر اپنے اپنے رنگ میں نمایاں شخصیتوں کی مالک ہوتی ہیں ۱۷۵۷ء کی مشہور جنگ پلاسی کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے روز افزوں اقتدار کو پوری ایک صدی گذر گئی تو زمانہ نے اپنی قدیم عادت کے مطابق کروٹ بدلنی چاہی اور ملک کے بعض حصوں میں قدرتی طور پر تغیر حالات کی خواہش دلوں میں چٹکیاں لینے لگی۔

کچھ اور اسباب بھی پیدا ہوگئے اور غدر ۱۸۵۷ء کی وہ افسوسناک و غیر منظم شورش رونما ہوگئی جس نے انتہائی ناکامی کے باوجود ہندوستان کی عنانِ حکومت تاجروں کے ہاتھ سے نکال کر براہ راست تاج برطانیہ کے دست اختیار میں دیدی اور تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ مئی ۱۸۵۸ء میں یہ شورش ہمارے ضلع میں انتہائی جوش پر تھی اور یہی زمانہ تھا جبکہ اس ذات گرامی کو خلعت ظہور عطا کیا گیا، جس کے لئے فیض ازل نے تاریخ اسلامی کے احیا اور علوم قدیمہ کی تجدید کا شرف مخصوص کر رکھا تھا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن اس قدر یقینی ہے کہ "یہ ماہ مبارک میان دو عید" یعنی ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ میں مولانا کی ولادت ہوئی اور موضع بندول[1] خانقاہ کو جو مولانا کا آبائی وطن اور ضلع اعظم گڈھ پرگنہ سگڑی کا ایک ممتاز ترین موضع ہے یہ فخر نصیب ہوا۔ مولانا کو اپنے وطن سے بڑا شغف تھا اور اس کی امتیازی حیثیت کی بنا پر غالباً ایام شباب میں یہ فخریہ شعر کہا تھا۔

فضل بندول اگر تو نشناسی
آدمی نیستی تو نسناسی

ممکن ہے مولانا کی ولادت سے پہلے اس گوشۂ گمنام کیلئے یہ شعر صحیح نہ ہو لیکن مولانا کا مولد ہونے کی حیثیت سے اب اسکی فضیلت میں کس کو انکار ہوسکتا ہے۔

<u>مولانا کا سلسلۂ نسب</u> | مولانا نسباً راجپوت تھے۔ شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

---

[1] یہ موضع اعظم گڈھ سے تخمیناً ۸ میل کے فاصلہ پر جانب شمال واقع ہے اور تقریباً ۴۰۰ برس سے مولانا کا خاندان اس موضع میں بحیثیت زمیندار آباد چلا آتا ہے

شیوراج سنگھ = سراج الدین

شہباز

شیخ سہراب

شیخ احمد چودھری

شیخ لعل محمد

شیخ مہدی چودھری

شیخ محمد اسمٰعیل

شیخ امان اللہ

شیخ محمد فخر جہاں

شیخ محمد قاسم — شیخ محمد تاج — شیخ محمد رضا

شیخ کریم الدین

شیخ عباد اللہ

منشی شیخ حسن علی صاحب

شیخ حبیب اللہ — شیخ مجیب اللہ — شیخ عجیب اللہ — شیخ نجیب اللہ

علامہ شبلی — محمد مہدی — شیخ محمد اسحاق — محمد جنید — شیخ علی احمد

شیخ محمد حامد — محمد فاروق — انور — شیخ اقبال احمد — سلطان احمد

اعظم گڈھ کا دیار قدیم زمانہ میں اجودھیا کے سورج بنسی راجپوتوں کے حدود حکومت میں شامل تھا۔ علاوہ بریں اسلامی حملہ کے بعد اکثر راجپوت مغربی ہندوستان سے بھاگ کر زیادہ تر فیض آباد اعظم گڈھ اور بلیا میں آرہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نواح کے باشندے اکثر راجپوت تھے اور آج

شاہان مشرقی کے زمانہ میں کچھ پٹھان بھی یہاں بس گئے بعدازاں رفتہ رفتہ علماء، قضاۃ عمال سلطنت
شائخ کی حیثیت سے کچھ شیوخ وسادات بھی آباد ہوتے گئے مغلیہ سلطنت کے عہد میں خال خال مغلوں
ادی ہوگئی اور دو ایک مقامات پر اہل حرفہ آباد کرائے گئے۔ مگر پھر بھی اکثریت راجپوتوں ہی کی رہی۔
ین اکبری کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے عہد میں اس اطراف کی گورنری گوتم راجپوتوں کے ایک خاندان میں تھی جنکے مورث نے
ری میں قبول اسلام کا شرف اور نادر دولتِ نادری چوگاں کا خطاب حاصل کیا اسی خاندان کے ایک نامور بزرگ راجہ
اہ نے شہر اعظم گڈھ اپنے نام پر آباد کیا۔ سگڑی کا پرگنہ جسمیں موضع بندول واقع ہے زمانہ قدیم میں کلیۃً راجپوت قبل
(آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۷۴) ازانجملہ ایک ممتاز ترین خاندان مولانا کے اسلاف کا تھا جسکے ایک رکن غالباً شاہان شرقی
ں مشرف باسلام ہوئے۔ ان بزرگ کے قبول اسلام کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز شدید گرمی کے
سبح کو نہار منہ علاقہ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا۔ اتفاقاً دیر ہوگئی ٹھیک دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر
ھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے۔ گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے یہ خیال نہ رہا کہ جوتیاں
ر دیں۔ ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے
بے اب و دانہ تھیں۔ بھلا کب یہ بدتمیزی برداشت کرنے والی تھیں۔ بگڑ کر بولیں "کیا نرے ترک ہی ہوگئے
ے پہنے ہوئے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھرشٹ کر ڈالا" یہ بھی ٹھیرے آخر راجپوت، ان کو بات کی
ت کہاں وہ بھی ایسا شدید طعنہ اور عورت کے منہ سے کہنے کو ذراسی بات تھی مگر قدرت کو انھیں دو لفظوں
ہ کام لینا تھا جو سیکڑوں علماء کے بحث و مذاکرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا۔ ایک ہی فقرے نے وہ اثر
یقیناً ایک باجبروت شہنشاہ کی تلوار نہ کرسکتی۔ ادھر شیو راج سنگھ کی بھاوج یہ آوازے کس رہی تھیں، ادھر
بس رہی تھی کہ یہ طنز نہیں حقیقت ہے اور حکمت الٰہی کو اسی راجپوت کی نسل سے الفاروق اور سیرت نبوی کا
ت پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ وہی ہوا۔ شیو راج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنتے ہی یہ کہا کہ ہم کو ترک ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے

تو لو ہی تج ترک ہوتے جاتے ہیں، جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے۔ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی تشنگی بجھائی بلکہ دین حق کے آب حیات سے بھی سیراب ہوئے اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا۔ خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو رہی اور اب تک یہ لوگ بندول کے قریب دھرسن نامی ایک موضع میں آباد ہیں۔

سراج الدین صاحب نے قبول اسلام کے بعد اپنا حصہ زمینداری تقسیم کرا لیا۔ بعد کو اس خاندان نے مزید رسوخ حاصل کیا اور مواضع ملحقہ کی چودھرائی کا منصب جو بلحاظ اقتدار اور اخراج کل کی تحصیلداری سے زائد تھا مدتوں تک اس خاندان میں قائم رہا۔ مذہبی توغل اور اسلامی خدمات کی بنا پر سراج الدین کے پوتے سہراب کو ان کے مرشد نے بیعت کی اجازت دی اور شیخ کے معزز لقب سے سرفراز کیا۔ اس وقت سے اس خاندان کے لوگ خطابی طور پر شیخ کہلائے جانے لگے۔ مگر (خواتین) اب تک اپنے نام کے ساتھ خانم لکھتی ہیں، کیونکہ ہمارے اطراف میں جو راجپوت مشرف بہ اسلام ہوئے وہ حکمران قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر عموماً (خان) یا "خان زادہ" اور بعض اصحاب "پٹھان"، بھی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ بجا طور پر اپنے آپ کو کسی عربی النسل سے نسباً فروتر نہیں سمجھتے بلکہ اکثر نومسلم راجپوت تو دوسری نسل کے مسلمانوں میں قرابت کرنا جائز بھی نہیں سمجھتے لیکن علامہ شبلی کے خاندان کو اس حیثیت سے بھی امتیاز حاصل ہے۔ صحیح مذہبیت کے جوش میں اس خاندان نے عرب، مغل اور افغانی نسل کے مسلمانوں سے قرابت کرنے سے کبھی احتراز روا نہیں رکھا۔ نا با وجود اس عام جذبۂ نسل پرستی کے جو ہندوستان کی آب وہوا نے بدقسمتی سے مسلمان شرفا میں بھی پیدا کر دیا ہے، ان غیر ہندی الاصل مسلمانوں نے بھی (باستثنائے بعض) اس خاندان میں تعلقات قائم کرنے سے گریز کیا۔ بلکہ جس کو شیخ طریقت نے شیخ کہدیا اسکو اپنا ہم درجہ سمجھکر نسلی امتیازات کو نظرانداز کرتے رہے۔ چنانچہ خود مولانا مرحوم کا ننہال انصاری شیوخ کے ایک معزز خاندان میں ہے۔ مولانا کے جد اعلیٰ شیخ کریم الدین گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانے میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے اور اپنی ذاتی آمدنی سے ایک تعلقہ موسومہ بڑھاوے حسام الدین پور جو بس بارہ گاؤں پر مشتمل ہے خرید کیا۔

یہ علاقہ ابتک اسی خاندان کے قبضہ میں ہے۔ مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی۔ عدالت کلکٹری اعظم گڈھ میں مختار تھے اور مولانا کے نانا شیخ قربان قنبر انصاری برطانوی تسلط کے ابتدائی دور میں اعظم گڈھ کے ایک مشہور وکیل تھے۔ مولانا کے والد بزرگوار مولوی شیخ حبیب اللہ مرحوم وکالت ہائی کورٹ کے سند یافتہ تھے مگر خود اعظم گڈھ میں آپ کی وکالت اتنی کامیاب تھی اور پورے ضلع میں اتنا رسوخ و اقتدار حاصل تھا کہ الہ آباد کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اس زمانہ میں بلدیہ "میونسپلٹی" کا صدر "چیرمین" عموماً کلکٹر یا کوئی دوسرا سرکاری عہدہ دار ہوتا تھا اور عملی اختیارات تمام تر اعزازی ناظم "آنریری سکریٹری" کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم اپنے پیشے کی مشغولیتوں کے باوجود بھی قومی اور ملکی خدمات کیلئے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے تھے اور علاوہ وجاہت ذاتی اور قابلیت انتظامی کے وسعت اخلاق، دیانت اور بے تعصبی کی بنا پر ہر طبقہ میں بلاتخصیص مذہب و قومیت نہایت ہر دلعزیز تھے۔ اس لئے جب تک ان کی صحت اجازت دیتی رہی میونسپل بورڈ کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے ارباب شہر کی خدمت کرتے رہے۔ مسلمانوں میں اسوقت تک سیاسیات کی جانب رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے حکام سرکاری سے بھی کوئی مخالفت کا سبب نہ تھا۔

فیض فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب مرحوم گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں یکساں محترم اور ممدوح تھے۔ قابلیت علمی، شرافت اخلاق، دنیاوی وجاہت و اقتدار، دولت و ثروت اور سعادتمند اولادیں، غرض خدا نے وہ سب کچھ دے رکھا تھا جس کی تمنا انسان کو ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش نصیبی کے لئے شیخ صاحب مرحوم کا نام ابتک ہمارے دیار میں بطور ایک منفرد مثال کے پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا کے چچازاد ماموں مولوی شیخ توجہ حسین اور حقیقی ماموں مولوی حاجی محمد سلیم مرحوم اعظم گڈھ میں چوٹی کے وکیل تھے۔ اس طرح یہ پورا خاندان زمانہ قدیم سے مخصوص طور پر ممتاز چلا آتا ہے۔

شیخ صاحب مرحوم کی محل اولیٰ سے (جو کہ حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحبزادی تھیں) چار بیٹے

پیدا ہوئے۔ سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت وطبّاعی اور خردانہ اطاعت و پاس ادب کا اعتراف مولانا کو ہمیشہ رہا۔ اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی۔ چنانچہ جب وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرعہ پر تھا۔ ع "بسلامت روی و باز آئی" اس نظم کے دو شعر اس وقت یاد آگئے۔

حسادر دیدۂ عدو شکنی حاسداں را جگر گداز آئی
ما بہ نادیدۂ ز رہت باشیم کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی۔ اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی۔ ہمارے نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے امنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی۔ اسلئے انکی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا اور اس تقریب مسرت میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا۔ افسوس کہ یہ ہنگامۂ سرور زمانے کی نظر بد سے نہ بچ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہوسکیں۔ ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہو چلی تھی جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی۔ مجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ان کو منصفی قبول کرنا پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد اعزا کو داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کی یادگار ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں۔ وہ بھی مکہ معظمہ میں لاولد فوت ہوئیں۔

مولانا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی پختہ مغزی اور وسعت خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے مگر انھوں نے بھی جوانی میں وفات پائی۔ مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہ اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں۔ بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے (جو مولانا کے چچا شیخ عجیب اللہ مرحوم کے پوتے ہیں) بیاہی ہیں چھوٹی

بزادی نے حال میں وفات پائی ہے۔

مولوی اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کیلئے ناقابل برداشت تھا اور آخر کار یہ کانٹا

نکلا۔

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحبزادے حاجی محمد حامد صاحب

سے کچھ دنوں اعظم گڈھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے اور تقریباً پچپن ۵۵ برس کی عمر میں جبکہ وہ

ن پورسب جج تھے وفات پائی۔

مولانا کے والد مولوی شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی، جن سے ایک صاحبزادے

تھے۔ یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے اور گریجویٹ ہو چکے تھے، مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری

کے انتخاب کی اطلاع آئی، اسی دن چند گھنٹے پہلے دو دن کی علالت میں وفات پا چکے تھے۔ بھدی

وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا۔ ایسے سعادت مند

ب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جانکاہ حادثہ تھا۔ لیکن صبر و تحمل

چارہ ہی کیا تھا۔ ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

مرحوم نے ایک بچہ "مظفر حسین" اپنی یادگار چھوڑا تھا۔ اس حادثہ کے بعد سے قدرتی طور پر شیخ حبیب صاحب

تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں

چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے۔

مپسند اینکہ بےکس و بے خانماں شود

ہاں ان قدر رباں کہ مظفر جواں شود

ادبیات

شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی

(از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی علیگ)

(حضرت سہیل نے یہ نظم ۲۰ نومبر کو جلسہ دستار الاصلاح میں پڑھی (اڈیٹر)

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبانِ زندگی　　ہے دمِ شمشیر خضر آستانِ زندگی
تو نفس کی آمد و شد کو سمجھتا ہے حیات　　میں یہ کہتا ہوں وداعِ جاں ہے جانِ زندگی
راحتِ کنجِ قفس سے زندگی کو کام کیا؟　　بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیانِ زندگی
تیری نادانی ہے گر تو ان کو سمجھے نغمہ سنج　　ہیں اسیرانِ قفس تو نوحہ خوانِ زندگی
وہ تو گورستاں سمجھتا ہے غلام آباد کو　　جس نے دیکھے ہیں زمین و آسمانِ زندگی
کر تلاشِ کنجِ مرقد اے طلبگارِ سکوں　　شورشِ پیہم کا طالب ہے جہانِ زندگی
رخصتِ پرواز کیا اذنِ فغاں تک بھی نہیں　　کفر ہے اس زندگانی پر گمانِ زندگی
ایک ٹھوکر مار دیتا ہے جہاں پائے طلب　　خود ابلتا ہے وہاں سیلِ روانِ زندگی
دستِ قدرت خود لپک کر ان کو لیتا ہے سنبھال　　لڑکھڑاتے ہیں جہاں شوریدگانِ زندگی
رو پڑے راہِ طلب میں جس جگہ دو دآبے　　لہلہا اٹھا وہیں اک گلستانِ زندگی
سعیِ آزادی میں پیشانی سے ٹپکے جو عرق　　اس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانِ زندگی
سرفروشِ عشق کا جس خاک پر ٹپکے لہو　　اس کے ہر ذرہ سے پیدا ہو جہانِ زندگی

کھاں تک مردار کی بکتی ہے سستے دام پر　　دیکھ افسردہ نہ ہو خونِ روانِ زندگی
ہیں نہاں ذوقِ طلب میں زندگی کی قوتیں　　مشہدِ توحید ہے سنگِ فسانِ زندگی
کربلائے عشق سے آتی ہے ابتک یہ صدا　　رفعتِ نوکِ سناں ہے نردبانِ زندگی
فدیۂ جاں پیش کرلے پیروِ دینِ حنیف　　ذوقِ قربانی ہے پہلا امتحانِ زندگی
استقامت کا سبق لے اسوۂ صدیق سے　　پھر زمانے کو سنا دے داستانِ زندگی
ہاں جنونِ شوق اُٹھ پھر لیکے فاروقی علم　　پھر دکھا دے دیدۂ عالم کو شانِ زندگی

خرمنِ باطل کو خاکستر بنا کر چھوڑ دے
ہر نفس تیرا ہو اک برقِ تپانِ زندگی

فاران کا دورِ جدید

فاران ایک علمی، مذہبی اور تاریخی رسالہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ سال سے دفتر مدینہ سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ فاران عام طور پر مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بہت پسند کیا گیا ہے ابتک فاران کی جو قیمت تھی گو وہ رسالہ کی خوبیاں دیکھتے ہوئے زیادہ نہ تھی لیکن اب اسکے حلقۂ اشاعت کو ترقی دینے اور عام مسلمانوں کی خاطر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ رسالہ کی عام افادی خوبیوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ ابتک سالانہ قیمت تین روپیہ اور بیرونی ممالک سے چار روپیہ تھی اب ماہ جون سے ایک روپیہ آٹھ آنہ اور دو روپیہ آٹھ آنہ سالانہ کر دیگئی ہے۔ امید ہے مسلمان اس کی اشاعت کو اشاعت علم دین تصور کر کے توسیع کی کوشش کریں گے۔ نمونہ مفت

پتہ: محمد مجید حسن مالک رسالہ فاران و غنچہ بجنور (یوپی)

تلخیصات

پیشہ

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام

مذکورہ بالا عنوان سے رسالہ "المقتطف" نے علامہ محمد کرد علی سابق وزیر تعلیمات شام اور صدر م
دمشق کا ایک مفید مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ موصوف ایک مخ
بعد فرماتے ہیں۔

ہماری قوم صدیوں سے اس خیال میں مگن ہے کہ خدا کی تمام نعمتیں ہمارے ہی لئے مخصوص ہ
فضل ہمارے سوا کسی پر ہوا ہے نہ ہوگا۔ تمام چیزوں کے مالک فقط ہم ہیں۔ چونکہ ہماری قوم اپنے متعلق غایت
رکھتی ہے اس لئے وہ اپنی حالت پر بالکل قانع ہے۔ اس کو کسی نئی چیز کے جاننے کی خواہش نہیں ہے۔
رہی ہے کہ آج دوسری قومیں اپنی عقل و فراست کی بدولت ترقی کے جس زینہ پر بھی پہونچ جائیں تاہم
امارت کے رتبہ کو نہیں پہونچ سکتیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ ہماری قوم بالکل ایک خیالی قوم بن کر رہ گ
صرف مردوں کے کارناموں پر فخر کرتی ہے۔ زندوں کی دنیا سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

اگرچہ یورپ کے موجودہ غلبہ نے ان لن ترانیوں کی بے حقیقتی بے نقاب کردی ہے۔ لیکن
ابھی صرف ذہنوں اور دماغوں تک ہے، اعضاء و جوارح پر ابھی کاہلی کی وہی نیند طاری ہے جو
اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نیند کب ٹوٹے گی۔

حالانکہ اسلام نے کاہلی کے انجام بد سے ڈرایا ہے۔ وہ سرتاسر دعوت عمل ہے اس نے کبھی

دین کو لے لو اور دنیا کو چھوڑ دو۔ جیسا کہ آجکل بے کار اور کاہل لوگوں کا شیوہ ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ "لوگو! دنیا و آخرت دونوں میں ترقی کرو"۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں اگر اصلاح تمدن کے لیے قوانین نہ وضع کردئے گئے ہوتے تو شاید مسلمانوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملتا جو زراعت کے کاموں میں مشغول ہوتا یا اپنی تجارت اور صنعت کو فروغ دینے کی فکر کرتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ آج جھاڑ پھونک، تعویذ اور گنڈے والوں نے توہمات اور خرافات کا جو جال بچھا رکھا ہے اس میں پھنس کر رہ جاتے۔ اس سے قطع نظر، تم یقین رکھو، اگر فطری ضروریات ہم کو مجبور نہ کرتیں تو ہم بعض مشرقی ممالک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہاں کے باشندوں کو کھانے کے لئے غلہ، پہننے کے لئے کپڑے اور رہنے کے لئے مکان تک کی فکر نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر فقہانے تمدنی قوانین پر دینی رنگ چڑھا دیا ہے۔ ان کے نزدیک زراعت پارچہ بافی اور تعمیر فرض کفایہ میں داخل ہیں۔ لیکن بعد میں لوگ پیشہ کو برا سمجھنے لگے کہ جب تک آدمی کو کسی طرح وہ وقت کی روٹی مل جائے، اس وقت تک محنت کرنیوالوں کی صف میں داخل ہونا ننگ کی بات ہے حالانکہ علمائے دین کا اجتماع کا اتفاق ہے کہ پیشہ، چاہے جسمانی ہو یا عقلی، کسی پیشہ والے کے لئے باعث ننگ نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ کام جس کو قانون جائز سمجھتا ہو اس کا کرنا نہ تو شرافت کے منافی ہے نہ حسب و نسب کے۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں کسی شخص کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے تو میں اس کی بابت لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ آیا یہ کوئی پیشہ رکھتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ملتا ہے تو وہ میری نظروں سے گر جاتا ہے۔

آج مصر و شام کے اکثر گھرانے جو مصیبت کے شکار ہیں اس کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد نے زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کو حقیر سمجھا اور اپنی اولاد کو صرف اپنی دولت پر تکیہ کرنے اور اسکی حفاظت کرنے کی تعلیم دی۔ تغیرات زمانہ کا ساتھ دینے کا سبق نہیں پڑھایا۔ بعضوں نے بقصد احتیاط اپنی جائدادیں وقف علی الاولاد کر دیں۔ لیکن ان کی یہ تدبیر بھی کچھ کارگر نہیں ہوئی۔ ان کی اولاد ان حصا بندیوں

کے باوجود بھی فضول خرچی کی وبا اور غربت کے نتائج سے محفوظ نہ رہ سکی۔

اگر دولت مند والدین کو معلوم ہو جائے کہ دولت چند سکوں اور چند بنگلے زمین کا نام نہیں اصل دولت عمل ہے۔ زمین کی تمام ثروت محنت اور عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ والدین کی طرف سے بہ وراثت جو اولاد کے لئے چھوڑی جا سکتی ہے یہ ہے کہ ان کے اندر محنت اور کفایت شعاری کا صحیح ملکہ پیدا کر تو یقیناً وہ اپنے بچوں کی تربیت ایسے اصول پر کرتے کہ مفلسی کی سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ان کی کسی فعل دنی کی مرتکب نہ ہوتی۔

آج ہمارے دولت مندوں کے خزانے روز بروز خالی ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ان کے وارثوں عمل کی قدر اور مال کی قیمت سمجھی ہوتی اور اس کے بڑھانے کے طریقے ان کو معلوم ہوتے تو ان کے خزا کبھی حوادث روزگار کے ہاتھوں برباد نہ ہوتے۔ اس راز کو کچھ اہل یورپ ہی نے سمجھا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ انگلستان، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں سیکڑوں ایسے گھرانے ہیں جن کی دولت پشتہا پشت محفوظ چلی آتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں کسی گھر کی دولت کی عمر تین پشتوں سے زیادہ نہیں۔

معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے باشندے صنعت کو حقیر سمجھنے اور اس میں اس حد تک غلو کر گئے کہ وہاں سے اسکا وجود ہی ختم ہو گیا؟ اب اسکے آثار محض اسقدر باقی ہیں کہ ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

معلوم نہیں اس کے زوال کا سبب کوئی خارجی شے ہوئی یا داخلی یعنی حکومت کا استبداد۔ قوانین کی سخ گیری، مذاہب کے اختلاف اور خرافات کے ہنیلا دنے اسکو تباہ کیا یا عام طبعی حالات ہی نے راحت بخش تھپکیاں دیکر اہل ملک کے قوائے عمل کو آرام کی نیند سلا دیا؟ علماء عمرانیات کہتے ہیں کہ گرم ملکوں کے باشندوں کے قوائے عقلی و جس کمزور ہوتے ہیں۔ ان میں جلد بازی اور چھچھورا پن ہوتا ہے چھوٹی سی چھوٹی چیزیں پاکر مسرت سے ناچنے لگتے ہ

اور بڑی بڑی تباہیوں کا ان کو احساس بھی نہیں ہوتا جب قدرت نے فیاضی کی اور انھیں دونوں وقت آرام سے روٹی ملنے لگی پھر وہ عاقبت اندیشی اور غم امروز و فکر فردا کے فضول افکار میں اپنی نیند خراب نہیں کرتے۔

جب صنعتوں کی بربادی اور جسموں کی راحت طلبی اور کاہلی کا سبب یہی ہے تو آخر ایشیا کے شمال مغرب بلکہ شمال مشرق کے باشندے پر وہی مصیبتیں کیوں نہ نازل ہوتیں جو صدیوں سے ہم پر مسلط ہیں ان ممالک کی آب و ہوا، ہمارے ملکوں سے کچھ کم گرم تو ہے نہیں؟ ایران کو دیکھو آج ہماری ہی طرح پستی کے عمیق غاروں میں پڑا ہوا ہے حالانکہ کسی زمانہ میں اس ملک کی صنعتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ اسکو اپنی ہمسایہ قوموں پر وہی تفوق حاصل تھا جو آج انگلستان کو دوسری مغربی اقوام پر حاصل ہے۔ ایران، بخارا اور افغانستان کے امرا کے متعلق سنا جاتا ہے کہ آج کل ان میں صنعت اور پیشہ کا مذاق پھر زندہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ روزانہ ایک آدھ گھنٹہ، نجاری، حدادی، پارچہ بافی، مصوری اور اسی قسم کے دوسرے مفید مشغلوں میں صرف کرتے ہیں اور اس سے مقصد محض تفریح ہوتا ہے۔ کسی مادی فائدے کے متوقع نہیں ہوتے۔ مغربی امرا کا بھی یہی دستور ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنے لئے ایک صنعت مخصوص کر لیتا ہے جو تنہائی میں اس کے جی بہلانے کا ایک مشغلہ اور تربیت جسم کا ایک عمدہ ذریعہ ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیکاری کی نحوست سے وہ بالکل محفوظ رہتے ہیں مثل مشہور ہے کہ "محنت کا غبار بیکاری کی زعفران سے بہتر ہے"۔ ممکن ہے اہل ایران میں صنعت و حرفت کا مذاق موروثی ہو کیونکہ علما انساب کے نزدیک یہ لوگ ایرین نسل سے ہیں اور ایرین اور سکسونی ایک ہی تخم کے برگ و بار ہیں۔

صنعت و حرفت کے متعلق کاہلوں اور راحت طلبوں نے حقارت کا جو خیال قائم کر رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے اس کو دنیا کے ان لوگوں نے اختیار کیا جو غیر معمولی عزت و شرف کے مالک تھے۔ مثلاً حضرت نوح بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ چرواہے تھے۔ آنحضرت صلعم نے تجارت کی۔ آپ کے صحابہ کی تجارت تمام بر و بحر میں پھیلی ہوئی تھی حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عثمان بن عفانؓ

بزاز تھے۔ عمرؓ ابن العاصؓ اونٹ ذبح کیا کرتے تھے۔ سعد بن ابی وقاصؓ تیر سازی کرتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ ریشم فروش تھے۔ ابو مسلم خراسانی، دعوت عباسیہ کا علمبردار، باوجود دولت مند ہونے کے تجارت کے جانور کوفہ لایا کرتا تھا۔ ثعالبی (صاحب یتیمہ) جبہ ساز تھے۔ ابن حوقل جغرافی اور یاقوت حموی جغرافی دونوں تاجر تھے۔ فقیہ ابوبکر قفال مروزی نے شباب کا زمانہ قفل سازی میں ختم کیا اور پیری میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابو منصور جوالیقی، جو اپنے عصر کا امام ادب تھا تھیلیاں بناتا اور بیچتا تھا۔ ابو اسحٰق زجاج نحوی شیشہ گر تھا۔ اسی طرح اگر تم اہل مشرق کے حالات کا پتہ لگاؤ تو ان کے علماء اور امراء کی صف میں، کسان، پارچہ باف، جبہ ساز، درزی، قلعی گر، دھوبی، معمار، سنگ، ساز عطار اور روغن فروش سب قسم کے اشخاص پاؤ گے۔

یورپ میں بھی اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ شمس الحکما طالیس اور ایتھنس کا مقنن ثانی، سولن دونوں صنعت پیشہ تھے۔ حکیم افلاطون، شہر شہر گھوم کر روغن زیتون بیچا کرتا تھا۔ اسپینوزا کی ساری زندگی آئینوں کی صفائی میں گذری لینوس نباتی طالب علمی کے زمانہ میں جوتہ سازی کرتا تھا۔ ملک الشعراء شکسپیر تھیٹر کا منیجر تھا۔ پولیٹیکل اکانمی کا بانی، داود ریکارڈو تاجر تھا ماہر فلکیات، بیلی دلال تھا۔ مشہور فلاسفر، جان اسٹوارٹ مل، ایسٹ انڈین کمپنی کا انسپکٹر تھا فرگسن نے بکریوں کی کھالیں پہنکر ہیئت کی تحصیل کی، ملر ایک طرف ایک پتھر کی کان میں کام کرتا تھا دوسری طرف علم طبقات الارض کی تکمیل میں مشغول تھا۔ یہ تو ان لوگوں کے حالات ہیں جو قید حیات سے آزاد ہو چکے آج زندوں میں بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو تجارت اور صنعت وحرفت کو اپنے لئے لازمہ حیات سمجھتی ہیں۔ مثلاً صدر جمہوریہ سوئٹزرلینڈ کپڑے کی تجارت کرتا ہے۔ وزیر انگلستان لارڈ روزبری دودھ کی۔ لارڈ لونڈنڈری کوئلے کی اور لارڈ ویمنگٹن میوہ جات کی اور ترکاریوں کی تجارت کرتے ہیں۔

مشرق اس وقت تک میدان ترقی میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ اس کے سر برآوردہ طبقے اس طرح کے کاموں کی طرف متوجہ نہ ہوں گے۔ جب تک قوم میں مصطفیٰ کمال اور ہدایت پاشا جیسے لوگ نہ پیدا ہوں گے اس وقت تک مشرق یورپ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

کمال پاشا، جو ٹرکی کی جدید بیداری کا علمبردار اور اس وقت اپنی قوم میں سب سے بڑا صاحب قلم ہے، وطن اور وطنیت کے مفہوم کو خوب سمجھا ہے۔ وہ جب جزیرہ روڈس میں نظر بند تھے اس وقت انھوں نے بعض حیرت انگیز کام کیے، وہاں پہنچنے کے ساتھ ہی مکتبوں کے استادوں سے ملے، ان کو طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی بابت مشورے دینے شروع کیے۔ طلبہ میں صحیح ملکہ اور مفید علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں غیرت وحمیت کی تخم ریزی شروع کی یہاں تک کہ چند سال بھی نہ گذرے تھے کہ تقریباً تین سو طالب علم ان مدرسوں سے ان کے رنگ میں رنگ کر نکلے جو ان کی دعوت کے ہراول تھے۔

ہدایت پاشا کا یہ حال تھا کہ جس وقت وہ گورنر ہو کر بصرہ جا رہے تھے، راستے میں حلب میں اترے اور شہبا کی گلیوں سے گذر رہے تھے کہ ایک کمہار پر نظر پڑ گئی۔ دیکھا کہ وہ بالکل دقیانوسی طریقہ پر مٹی گوندھ رہا ہے اور پسینہ سے شرابور ہے فوراً کھڑے ہو گئے اور چاہا کہ اس کو اس کام کا ایک سہل طریقہ بتائیں لیکن کمہار اشاروں سے ان کی بات نہ سمجھ سکا، ہدایت پاشا فوراً کوٹ پتلون اتار مٹی میں گھس گئے اور کر کے اس کو اپنا جدید طریقہ بتایا۔ اس وقت سے لیکر آج تک حلب کے تمام کمہاروں میں یہی طریقہ رائج ہے۔

(ع ۔ ر ۔ ناصر)

حقیقی آزادی کیا ہے؟

"آزادی دو قسم کی ہوتی ہے۔ صحیح اور غیر صحیح۔ غیر صحیح آزادی یہ ہے کہ انسان جو جی چاہے کرے۔ صحیح آزادی یہ ہے کہ انسان پر جو فرائض و واجبات ہیں انھیں بجالانے میں کوئی چیز روک نہ ہو۔" (کنجزلی)

"آزادی کی نسبت عجیب غلط فہمی ہے لوگ سمجھتے ہیں، جو جی میں آئے کریں یہ آزادی ہے۔ حالانکہ یہ سرے سے غلط ہے صحیح اور حقیقی آزادی یہ ہے کہ انسان کی راہ عمل سے وہ ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں جو اس کے فرائض کے انصرام میں روک ہیں۔" (رابرٹسن)

"اجتماعی آزادی یہ ہے کہ قوم و جماعت اپنے بنائے ہوئے اصول و قوانین کی پابند ہو۔ شخصی آزادی یہ ہے کہ انسان دین و ملت کے اصولوں کا پابند ہو۔" (کولی)

"آزادی کے بغیر قوم کی زندگی نہیں بقاء آزادی فضیلت اخلاق پر مبنی ہے۔" (روسو)

"آزادی قوم و جماعت کے حق میں ویسی ہی ہے جیسی افراد و اشخاص کے لئے صحت و تندرستی۔ جب افراد کی تندرستی ضائع ہو جاتی ہے تو ان سے گویا سعادت چھن جاتی ہے، اسی طرح جب قوم کی آزادی کھو جاتی ہے تو اس سے خیر و سعادت رخصت ہو جاتی ہے۔" (بولنبروک)

"میں غلامی پر قانع نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ فردوس بریں میں ہو" (ڈرایڈن)

"آزادی ملتی نہیں حاصل کی جاتی ہے۔" (کولنٹن)

"آزادی کی محبت دل کے ہر گوشہ میں جوش پیدا کر دیتی ہے۔" (واشنگٹن)

"اے آزادی! تیرے نام پر کتنے جرائم کئے جاتے ہیں۔" (میڈم رولان)

"آزادی ہر انسان کا جائز پیدائشی حق ہے۔" (بنکارڈ)

جلد ۱ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۲-۴
باب التفسیر		
تفسیر سورۃ العصر	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۵-۳۲
معارف قرآن		
اقسام قرآن (۲)	جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی	۳۳-۳۶
تاریخ اور قرآن حکیم	جناب مولوی محمد عمر صاحب نعمانی شملہ	۳۷-۴۳
تیسیر قرآن (۹)	امین احسن اصلاحی	۴۴-۴۷
مقالات		
سیرت شبلی (۳)	جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ال ال بی علیگ	۴۸-۵۷
ادبیات		
غزل	استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ	۵۸
تلخیصات		
آزاد ملکوں کی آزاد تعلیم	ا-ن	۵۹-۶۲
انسان کو غنی ترند محتاج ترند	″	۶۲-۶۴
افریقہ کے صحراؤں میں ایک نئی دنیا کی تعمیر	″	۶۴

۷۸۶

شذرات

بعض تبدیلیاں

یہ سال کا آخری پرچہ ہے۔ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ سال بھر کی منزل بخیر و خوبی تمام ہوئی۔ ایک سال کے تجربہ کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ کے ابواب و مباحث میں بعض تبدیلیاں کر دی جائیں۔ رسالہ کے مضامین زیادہ تر قرآن سے متعلق ہوتے ہیں اور انداز بحث و نظر عموماً طالب العلمانہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے عام پڑھنے والوں کی طبیعت پر، جو خشک علمی مباحث کے پڑھنے اور سمجھنے کے عادی نہیں ہیں، بڑا بوجھ پڑ رہا ہے۔ جنوری سے مخصوص قسم کے علمی مباحث کے صفحات ایک حد تک کم کر دیے جائیں گے اور ہر اشاعت میں کچھ ایسے مضامین بھی ہوں گے جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی کے احوال و مسائل سے ہوگا۔

ابتک اصلاحی مضامین کا سلسلہ مستقل نہیں تھا حالانکہ یہ چیز رسالہ کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے۔ اس کے لیے صفحات کے اضافہ کا انتظار تھا۔ لیکن صفحات بڑھائے نہ جا سکے۔ اب مجبوراً انہی صفحات کے اندر اس سلسلہ کو بالالتزام قائم رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور انشاء اللہ یہ مضامین ہر استعداد کے لوگوں کے لیے مفید اور دلچسپ ہوں گے۔

ایک سلسلہ تاریخی مضامین کا بھی ہوگا اور تلخیصات کے باب میں انتخابات دلچسپ اور آسان ہوں گے۔ بعض ظاہری تبدیلیاں بھی پیش نظر ہیں۔ دعا فرمائیے کہ یہ ارادے پورے ہو سکیں۔

معاونین اور خریداروں سے

جن لوگوں کی مدت خریداری دسمبر میں ختم ہو رہی ہو ان کی خدمت میں جنوری ۱۹۳۷ء کا پرچہ

وی، پی روانہ ہوگا۔ امید ہے وہ رسالہ کی سرپرستی قائم رکھیں گے۔ اگر کسی وجہ سے کسی صاحب کو آئندہ خریداری کا باقی رکھنا منظور نہ ہو تو ان سے بادب التجا ہے کہ ایک کاڈ لکھکر دفتر کو مطلع کر دیں کہ دفتر ونقصان نہ اٹھانا پڑے۔

معاونین سے نہایت شرمندہ ہیں کہ مختلف وجوہ سے، جن کی تفصیل خوشگوار نہیں ہے، کوئی نئی کتاب ان کی خدمت میں نہ بھیج سکے۔ اس راہ کی اصلی مشکل پریس نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ اب الحمد للہ یہ مشکل دور ہو چکی ہے اسلئے توقع ہے کہ انشاءاللہ آیندہ سال میں متعدد کتابیں چھپ سکیں گی۔ اس کوتاہی کی تلافی کے لئے معاونین کے نام آیندہ سال کا الاصلاح وی۔ پی نہ بھیجا جائے گا۔ بلکہ سال بھر تک، الاصلاح ان کی خدمت میں ہدیۃً حاضر ہوگا۔ البتہ جن معاونین نے ازراہ نوازش رقمیں بھیجدی ہیں مثلاً ہمارے محترم مولوی محمد عمر صاحب نعمانی تو ان کے عطیے قبول کرئے گئے ہیں اور جو لوگ آیندہ بھیجیں گے ان کے عطیے بھی شکریہ کے ساتھ قبول کرئے جائیں گے۔

دائرہ کی بعض مطبوعات

استاذ امام کی تصنیفات میں سے اس وقت تین کتابیں زیر طبع ہیں۔ ترجمہ تفسیر سورہ لہب ترجمہ تفسیر سورہ کوثر اور اسباق النحو حصہ اول۔ ترجمہ تفسیر سورہ لہب طیار ہے۔ اس کے مطالب کی نسبت کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ مولانا کی تمام تصنیفی خصوصیات اس میں جمع ہیں۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی چھوٹی سے چھوٹی سورہ بھی اپنے اندر حکیمانہ معارف و حقایق کے کیا کیا خزانے پوشیدہ رکھتی ہے۔ اس تفسیر کی ایک خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس کے مباحث ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مخصوص علمی مباحث بھی نہایت مفصل اور شگفتہ ہیں۔ طباعت و کتابت عمدہ اور کاغذ نفیس ہے۔ قیمت ۶ر مولانا کے قرآنی معارف کے قدردانوں سے امید ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے تاکہ تفسیر کے دوسرے اجزاء اور مولانا کی دوسری

تالیفات کی طبع و اشاعت کا سلسلہ قائم رہ سکے۔

اسباق النحو حصہ اول عربی مدارس اور طلبہ کے لئے چھاپی گئی ہے۔ یہ کتاب بارہا چھپ چکی ہے اور بعض مدارس کے نصابوں میں داخل ہے۔ لیکن مولانا نے تجربہ کے بعد اس میں بہت کچھ ترمیم فرمایا تھا۔ یہ اڈیشن اس ترمیم و اضافہ کے ساتھ چھاپا گیا ہے جس کے بعد کتاب بالکل دوسری ہوگئی ہے۔ انشاءاللہ جنوری کے وسط تک چھپ کر شائع ہوجائے گی۔

دو اہم موتیں

صفی الدولہ حسام الملک نواب محسن خاں صاحب اور ہمارے مشہور شاعر اصغر گونڈوی انتقال کرگئے۔ نواب صاحب مرحوم کی ذات اپنی گوناگوں قومی و مذہبی خصوصیات کی وجہ سے پورے ملک کی محسن تھی اور اصغر صاحب اپنی بعض شاعرانہ خصوصیات کی وجہ سے ان شاعروں میں ہوگئے ہیں جنکا کلام صدیوں زندہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور قوم میں ان کے صحیح قائم مقام پیدا ہوں۔

یہ افسوسناک اطلاع سنکر نہایت رنج ہوا کہ ہمارے مخدوم مولوی عبدالغنی صاحب انصاری نائب صدر دائرہ حمید یہ کی صاحبزادی ریحانہ جو ایک عرصہ سے علیل اور دہلی میں زیرِ علاج تھیں انتقال کرگئیں۔ مرحومہ مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کی بہو اور دائرہ حمیدیہ کے معاونین میں تھیں۔ ہم انصاری صاحب اور سہیل صاحب کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے آغوشِ رحمت میں جگہ دے۔

باب التفسیر

تفسیر سورۃ العصر

(۲)

تصنیف

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ

امین احسن اصلاحی

"حق" و "صبر" کی شرح اور اُن کا باہمی تعلق

۱- حق کے دو معنی ہیں - ایک معنی عام دوسرے معنی خاص۔ معنی عام کی تشریح ہم اس وقت کریں گے جب
۔ کی تفسیر کا عمومی پہلو بے نقاب کریں گے معنی خاص کی تشریح بیان کرتے ہیں -

حق کے خاص معنی مواسات و ہمدردی کے ہیں۔ اس کے لئے دوسرا معروف لفظ "مرحمۃ" ہے۔ اس سے
دم ہوتا ہے کہ جو چیز دوسروں کے نزدیک محض ایک اخلاقی فضیلت کی حیثیت رکھتی ہے، عرب اپنے اوپر اس کو
ـ حق واجب خیال کرتے تھے ۔ شعرا نے اکثر اس کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے - ربیعہ بن مقروم کا شعر ہے:

یھینون فی الحق اموالھم　　　اذا اللزبات التحین المسیما

یعنی زمانہ قحط میں اونٹ ذبح کرکے بھوکوں کو کھلاتے ہیں ۔

سوید بن ابی کاہل الیشکری کہتا ہے ۔

من اناس لیس من خلاقھم　　　عاجل الفحش ولا سوء الجزع

ایسی قوم میں سے ہیں کہ جن کے اندر نہ بدگوئی اور گھبراہٹ نہیں ہے۔

عرف الحق ما لغي به عند م الام مافينا خرع

حقوق کو خوب پہچانتے ہیں، ان کی ادائگی سے عاجز نہیں آتے اور کٹھن وقتوں میں ہم کمزور نہیں ہوتے۔

لبید نے کہا ہے:-

فان تقبلوا المعروف نصبر لحقکم ولن یعدم المعروف خفا ومنسما

کلام عرب میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ پس گویا "وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" بالکل "وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ" کے ہم معنی ہے اور دوسری آیت پہلی آیت کی تفسیر ہے۔ اب دیکھو تمام بھلائیوں اور نیکیوں میں سے قرآن نے اس نیکی کو کس طرح چھانٹ لیا ہے جو درحقیقت سب کی اصل اور سب کا خلاصہ ہے۔ صرف مرحمت ہی کا ثمرہ محبت ہے جو پراگندہ اور بکھرے ہوئے دلوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کرتا ہے۔ اور سب کو جود و کرم اور فیاضی و ہمدردی کے جوش سے معمور کر کے زندہ و حساس بنا دیتا ہے۔ پہلی سورہ میں عشق دنیا کی منافسات کا ذکر تھا جو تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس میں وصیت مرحمت کا ذکر فرمایا جس نے یہ جڑ یکقلم کاٹ دی۔ اس کے بعد وصیت صبر کی تعلیم فرمائی کیونکہ جب تک آدمی لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیتیں جھیلنے اور ان کی غلطیوں سے چشم پوشی اور درگذر کا عادی نہ ہو جائے اس وقت تک صحیح مرحمت وجود میں نہیں آسکتی۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ولمن صبر وغفر ان ذلک لمن عزم الامور (شوریٰ)

اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو یہ کام ہمت کے ہیں۔

اس آیت میں دیکھو، مرحمت صبر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اسی مقام کی خصوصیت نہیں، ان دونوں کے تلازم اور اجتماع کی مثالیں قرآن مجید میں عام ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ بالکل دو توام چیزوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔ آل عمران کے خاتمہ کی آیت ہے۔ یٰاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا۔ اس آیت

میں امت کی شیرازہ بندی کی گئی ہے لیکن غور سے دیکھو روابط اتحاد میں گرہ صبر ہی نے لگائی ہے۔ اسی کے مشابہ یہ آیت بھی ہے

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — مگر وہ جنہوں نے صبر کیا اور بھلائیاں کیں۔

پس سورہ والعصر میں حق و صبر کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دو بنیادی نیکیوں کی راہ کھول دی۔ تفسیر سورہ ماعون اور تفسیر سورہ کوثر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اللہ اور مخلوق کی محبت ایمان کا پہلا رکن ہے۔ اور اسی چیز کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کے دو لفظوں سے بیان کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی اسی اہمیت کی وجہ سے صبر کا ذکر ان کے ساتھ بھی آتا ہے۔ نماز کے ساتھ قرآن مجید میں کئی جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ) — اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا — اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو۔

لیکن عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو عاجزوں اور درماندوں کا شیوہ ہے۔ بلکہ یہ قوت اور عزم کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے۔

وغمرۃ موت لیس فیھا ھوادۃ — یکون صدور المشرفی جسورھا

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں۔ جن پر تلواروں کے پل ہیں

صبرنا له فی نھکھا ومصابھا — باسیافنا حتی یبوخ سعیرھا

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابلہ میں اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے ہوگئے۔

ابن صمغ کا شعر ہے:

یا ابن الجاحجۃ المدارۃ — والصابرین علی مکارہ

اے شریف سرداروں اور شدائد پر ثابت قدم رہنے والوں کی اولاد۔

زہیر بن ابی سلمی نے کہا ہے:

قود الجیاد و اصہار الملوک وصبر فی مواطن لو کانوا بہا سئمو

اصیل گھوڑوں کی سواری اور بادشاہوں کی دامادی اور ایسے موقعوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھتے۔

صبر کے معنی قرآن مجید نے خود کھول دئے ہیں۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ اور صبر کرنے والے سختی میں، تکلیف میں اور

وَحِيْنَ الْبَاْسِ (بقرہ) لڑائی کے وقت

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کئے ہیں۔غربت، بیماری اور جنگ اور درحقیقت تمام مصائب و شدائد کے یہی تین سرچشمے ہیں۔لوگوں کی ایذا دہی پر صبر کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ولمن صبر و غفر الایہ۔

اخلاق انسانی کی سب سے زیادہ حسین شکل یہ ہے کہ وہ شجاعت اور نرم خوئی کا ایک دل آویز پیکر ہو غور کرو مرحمت اور صبر کی یکجائی نے کس طرح یہ خوبصورت پیکر آپ سے آپ تراش دیا ہے۔اس کی تفصیلات بارہویں فصل میں آئیں گی۔پھر دیکھو، غیر معمولی ایجاز کے باوجود، کلام کی وسعت اور جامعیت کا کیا حال ہے! مکارم اخلاق کے تمام ابواب دو لفظوں میں سمٹ آئے ہیں۔دو لفظوں میں تمام برکتوں کا خزانہ ہے۔طالبوں کے لئے رہبری ہے۔ دل کے تمام روگوں کا علاج ہے نفس کے تمام وسوسوں اور نزغات سے نجات کا نسخہ ہے۔

اب ہم سورہ کی اس عام اور وسیع تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی طرف اس کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

سورہ کی وسیع تاویل و جوامع الکلم میں سے ہونے کی وجہ

۷۔قصار (چھوٹی سورتیں) کی تاویل و تفسیر میں، ہم جو اس قدر پھیلتے ہیں اس سے کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض ذہنی تکلف ہے۔بلکہ ہم ایسا ان کے معانی کی وسعت کی وجہ سے کرتے ہیں۔قصار کے وسیع معانی پر مشتمل ہونے کے دلائل اور وجوہ بہت سے ہیں، ہم ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ اگر قصار وسیع معانی پر مشتمل نہ ہوتیں، ان کو مستقل سورتوں کی حیثیت نہ دی جاتی۔

۲۔ ان کا نزول زیادہ تر ابتدا میں ہوا ہے۔ اور بیشتر اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ ابتدا میں اصولی ہی باتیں تعلیم کی جاتی ہیں۔ اس کو بالاجمال ہم تاریخ قرآن میں لکھ چکے ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا اصول کی طرف خود قرآن مجید نے رہبری فرمائی ہے۔ کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ۔

۴۔ قصار کے جوامع الکلم میں سے ہونے کے اشارات خود ان کی عبارات کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

۵۔ اس باب میں سلف سے بھی ایسے اقوال منقول ہیں جن سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے مثلاً حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے سورۂ العصر کی بابت فرمایا "اگر لوگ تنہا اسی سورہ پر غور کریں تو ان کے لئے کفایت کرے"

اب ہم سورہ پر، اس کے عمومی پہلو کو پیش نظر رکھکر غور کریں گے اور ایمان، عمل صالح، تواصی، حق و صبر کے معانی اور ان کے باہمی تعلق کی توضیح کریں گے۔

ایمان کا حقیقی مفہوم

۶۔ ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان، لغت میں مختلف معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

آمنہ اے اعطاہ امنا۔ اس کو امن دیا۔ قرآن میں ہے۔ وَاٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔

آمن لہ۔ صدقہ و اعتمد علیہ۔ اس کی تصدیق کی۔ اس پر اعتماد کیا۔

آمن بہ۔ ایقن بہ۔ اس کا یقین کیا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام طریقوں سے مستعمل ہے۔ اس کے مشتقات میں مؤمن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں بھاگنے والے بندوں کو پناہ دیتا ہے۔

یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔ عبرانی میں (אמן) (امن) کا مادہ موجود ہے جس کے معنی صدق و اعتماد کے ہیں۔ اسی سے (אמן) آمین ہے جو ایک تصدیق و اعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیۃ، توکل اور اذعان کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے۔ ایمان ہے۔ اور جو شخص، اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے ایمان عقل کے لئے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لئے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لئے یہ عقل و ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور عقائد و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پس قرآن کی اصطلاح میں مومن وہ شخص ہوا جو خدا کا خالص و مخلص بندہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام و آیات پر یقین و اطاعت کی اس کیفیت کے ساتھ جازم ہے جس کی بنیاد رضا، و محبت پر ہے۔

اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اب ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے۔ کہ وہ بندوں کو ان کی سعی کے لحاظ سے درجے اور مناصب عطا فرماتا ہے۔ جو روح پاکیزگی اور طہارت کی راہ میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے، تقرب الٰہی کے مقامات و منازل سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے اور چونکہ روح کی ترقی کی دو راہیں ہیں ایک علم و عمل کے اندر سے ہو کر نکلی ہے، دوسری قلب و ارادہ کے اندر سے۔ اس لئے علم و عمل کی راہ میں اس کا ہر قدم اس کو ہدایت و تقویٰ سے قریب تر کرتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ　　　اور جنھوں نے ہدایت کی راہ پکڑی (یعنی اپنے علم کے مطابق عمل کیا) ان کی ہدایت زیادہ کی (یعنی علم) اور انکو بخشا انکا تقویٰ (یعنی صحت ارادہ کیونکہ تقویٰ ہی تمام اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے)

پس ہر علم نافع اور عمل صالح ہدایت و تقویٰ کا دروازہ کھولتا ہے اور علم و عمل کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ　　　اور اب تک ایمان تمہارے دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔

یعنی تمھارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس نے علم سے ارادہ اور قول سے عمل کی شکل ابھی نہیں اختیار کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ	وہی لوگ ہیں کہ انکے دلوں میں ایمان لکھدیا اور انکی
وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ	اپنی طرف سے، روح سے تائید کی۔

یہ ان لوگوں کی موت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان قلب سے تعلق رکھنے والی اور محبت کو جوش میں لانے والی چیز ہے۔

ایک اور مقام میں فرمایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ	اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں سخت تر ہیں

ایک جگہ فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ	پس نہیں، تیرے رب کی قسم، انکا ایمان معتبر نہیں ہیاتک
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ	وہ اپنے تمام نزاعی امور میں تم کو حکم بنائیں، پھر تمھارے فیصلوں
حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔	سے اپنے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔ اور کلی طور پر اطاعت کریں

یعنی جس نے اپنے نفس اور اپنے تمام عزائم و اعمال کو پوری طرح اللہ کے حوالہ نہ کردیا وہ پکا مومن نہ ہوا۔ ایمان جن اعمال و عقائد کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اس نے صرف چند پورے کئے۔ تمام نہیں پورے کئے۔

اسی مفہوم کی یہ آیت بھی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ	مومن تو وہی ہیں جنکا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے
وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ	اللہ کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب انکو
آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا، وَعَلٰى رَبِّهِمْ	اس کی آیتیں سنائی جاتی ہیں، ان کے ایمان کو زیادہ

يَتَوَكَّلُوْنَ ‎ۚ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا — کرتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو نماز قائم
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ‎ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ — کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے روزی بخشی ہے اس میں سے اللہ کی
الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا — راہ میں خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچ مچ کے مومن ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے مندرجہ ذیل اوصاف گنائے ہیں۔

(۱) اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں پر خشیت طاری ہوتی ہے۔

(۲) آیات الٰہی کے سننے سے ان کا ایمان بڑھتا ہے۔

(۳) اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۴) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۵) راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ بس یہی لوگ سچے اور راستباز مومن ہیں۔

اسی کے مشابہ ایک اور آیت ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ — مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لائے
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ — اور پھر اس میں کسی طرح کا تردد نہ کیا اور جان و مال
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ‎ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ — سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔
الصّٰدِقُوْنَ ۔ ....

آیت ذیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ‎ؕ لَا — کیا جو مومن ہے وہ فاسق کی طرح ہو جائیگا؟ (ہرگز
يَسْتَوٗنَ — نہیں) دونوں برابر نہ ہوں گے۔

دیکھو اس آیت میں، اللہ تعالیٰ نے مومن کو فاسق کا ضد قرار دیا اور تصریح کے ساتھ فرمایا کہ دونوں نہ ہوں گے۔

اس تفصیل کے بعد، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن مجید میں، ایمان کے بعد جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے اور اس کی نوعیت بعینہ وہی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا ہوگا کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کُل کے بعد جز، اور عام کے بعد خاص کا ذکر کرکے تفصیل کی جاتی ہے۔ کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں، ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل ظاہر ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے اور عقل و دل کے معاملات میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے، حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس لئے ایمان کے دو شاہد قرار دئے گئے۔ ایک قول، دوسرے عمل۔ اور چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے۔ اس لئے صرف زبان سے اقرار کرنیوالا مومن نہیں قرار دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی اصلی کسوٹی ہے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا	اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

یعنی اے وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے ہو، عمل سے ایمان لاؤ۔

اسی کے مثل دوسری جگہ ہے۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا	کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ کہنے پر چھوڑ دئے جائیں گے
آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا	کہ ہم ایمان لائے۔ اور وہ آزمائشوں میں نہ ڈالے جائینگے
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ الَّذِينَ	البتہ اللہ معلوم کریگا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور
صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ	معلوم کریگا ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

پس آمنوا کے بعد عملوا الصلحت کا جو ٹکڑا آتا ہے وہ درحقیقت آمنوا کی تفصیل ہوتا ہے، البتہ عملوا الصلحت کو آمنوا کا مقابل نہیں قرار دے سکتے کیونکہ ایمان کے معنی، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ایقان کے بھی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سچا مومن وہ ہے جو ایمان اور عمل صالح دونوں کا جامع ہو۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ایمان ایک نفسانی و روحانی حالت کا نام ہے جو انسان کے تمام عقائد و اعمال پر حاوی ہے۔ وہ جس طرح علوم سے بڑھتی ہے اسی طرح اعمال سے بھی اس میں زیادتی ہوتی ہے۔ اس کے دو رکن ہیں۔ ایک علم دوسرا عمل۔ ان میں سے اگر ایک کو بھی ڈھا دوگے، ایمان کی پوری عمارت ڈھہ جائے گی۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور دین کے تمام اصول و فروع سے خوب واقف ہے لیکن نافرمانی اور گناہ پر برابر مصر ہے تو اس کے لئے اس ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے۔ جہانتک نفس علم و یقین کا تعلق ہے ابلیس کچھ کم نہ تھا لیکن وہ مومن نہ تھا۔ ایسا یقین معتبر نہیں۔ اس قسم کا یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب اور بڑھتا ہے۔ فرعون اور اس کے ساتھی بھی یقین رکھتے تھے لیکن ان کا یقین ایمان نہ تھا۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا — پس جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں آئیں

هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ، وَجَحَدُوا بِهَا — انھوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور ان کا انکار

وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۚ (نمل ۔ ۱۴) — کیا حالانکہ ان کے دلوں نے انکا یقین کیا ظلم اور گھمنڈ

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ علم اور ارادہ بالکل دو چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں تلازم نہیں ہے۔ بحث علم کی پوری تفصیل سورہ سابقہ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

ایمان کے خاص معنی اور اسکا سیاسی مفہوم

۸۔ لیکن ایمان کے ایک خاص معنی، ایقان بھی ہیں۔ قرآن مجید اس معنی میں اس لفظ کو ہمیشہ صیغۂ فعل کی صورت میں لاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے متعلق کو بھی ذکر کرتا ہے مثلاً

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ — ایمان لایا (یقین کیا) رسول اس چیز پر جو اس پر اتاری گئی

وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

اس کے رب کی جانب سے اور مومنین۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ پر، اسکے فرشتوں پر، اور اسکے رسولوں پر اور کہا ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور

قرآن مجید کے اس استعمال سے بعضوں کو خیال ہوا کہ ایمان معتبر و حقیقی یہی ایقان ہے اور یہ ایک یقین محض کی حالت ہے اس لئے عمل سے اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی۔ یقین اور عمل دو بالکل متباین چیزیں ہیں پس عمل یقین کا جزء کیسے ہوسکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہی رائے ہے جو ایمان و عمل کے باب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بھی اختیار فرمائی ہے اس سے ان لوگوں کے خیال کو مزید تقویت ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک واضح مسئلہ میں تاویل و توجیہ کے نہایت دور از کار پہلو اختیار کرلئے گئے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا ہے جس نگاہ سے ایک قاضی و فقیہ دیکھتا ہے یا امیر اسلام وراثت و نکاح اور خراج و جزیہ وغیرہ معاملات و مسائل سیاسیہ کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ قانون و سیاست کی نگاہ ہے جو حکمت و فلسفہ کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے یا مسلمانوں کے شعار اور ان کے ظاہر حالات میں بالکل ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے شخص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہے۔ اس میں صادق و کاذب اور متقی و فاجر کی تفریق نہ کی جائے گی۔ اس ایمان میں سب برابر ہونگے۔ اس میں کمی و بیشی نہیں واقع ہوتی۔ کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندہ کے درمیان کے باطنی امور و معاملات کی جستجو نہیں کرتی۔ یہ معاملات صرف قیامت کے دن بے نقاب ہوں گے۔ سورہ حدید کی ایک آیت سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ بُشْرٰکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا

جس دن تم دیکھو گے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو، دوڑتی ہوئی چلے گی ان کے آگے اور ان کے دہنے ان کی روشنی (اور ہم کہیں گے)

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ
وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا
نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا
وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا فَضُرِبَ
بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ
فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ
الْعَذَابُ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ
قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ
حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ
فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ
وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ
النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ

خوش خبری ہے تم کو آج کے دن۔ باغ ہیں جنکے نیچے نہریں
جاری ہیں، ان میں ہمیشہ رہوگے۔ یہی ہے سب سے بڑی
کامیابی جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں
ایمان والوں سے، ذرا مہلت دو ہم کو، ہم بھی تمہارے
نور سے روشنی لے لیں۔ ان سے کہا جائے گا، لوٹ جاؤ
پیچھے اور ڈھونڈھو روشنی۔ پھر کھڑی کر دیجائیگی
ان کے درمیان ایک دیوار اس میں ہوگا ایک دروازہ
اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب یہ لوگ
ان کو پکارینگے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے کہینگے کیوں نہیں
لیکن تم نے فتنہ میں ڈالا اپنے آپ کو، اور راہ دیکھتے رہے
اور شک میں پڑے رہے اور تم کو دہوکے میں رکھا آرزؤں نے۔
یہانتک کہ پہنچا اللہ کا حکم اور اللہ کے بارے میں تم کو دہوکے
میں رکھا شیطان نے۔ پس آج نہیں لیا جائیگا تم سے فدیہ
اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دنیا کی زندگی میں تو مومنین کے ساتھ ہے لیکن آخرت میں ان سے علٰحدہ کر دی جائے گی اور اس کا حشر کفار کے ساتھ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا اسی حالت میں ممکن ہے جب امیر اسلام مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو اگرچہ مسلمان نہیں ہیں لیکن زبان سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، معاملات میں بالکل یکساں درجہ دے۔ پس امام ابو حنیفہؒ نے اس بحث میں ایمان سے اس کے خاص مفہوم یعنی ایقان کو نہیں مراد لیا ہے بلکہ مجرد اقرار و اظہار مراد لیا ہے یعنی انکے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض

قول کا؟ یہ سوال نہ تھا کہ علم و عمل دونوں کا نام ہے یا محض علم کا۔ اگر سوال موخرالذکر صورت میں ہوتا تو اس کا جواب محض ایک ہی ہوتا۔ کیونکہ اس بارہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ایمان علم و عمل دونوں کا مجموعہ ہے۔

اب غور کرو اس بارہ میں ایک قاضی کا مسلک کیا ہوگا؟ وہ ایمان کو صرف قول کے معنی میں لیتا ہے۔ ایسا کرنے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ لیکن یہ ایمان کی اور مبنی کا محل کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر میں ایمان سے صرف وہ چیز مراد ہوتی ہے جو احکام قضا کے اجرا و نفاذ کی بنیاد رہے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات سے بحث نہیں ہوتی۔ اب اگر قرآن مجید ایمان کی کمی اور زیادتی کی تصریح کرتا ہے تو اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ایک بالکل ہی دوسری چیز ہے اور قرآن اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے۔ بلاشبہ قرآن کا صاف فیصلہ یہی ہے کہ ایقان و عمل دونوں ہر حالت میں یکساں نہیں رہتے۔ ان میں مختلف حالات کے ماتحت تفاوت ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کم ہوتے ہیں کبھی زیادہ۔ عقل سلیم اس صداقت کی تائید کرتی ہے۔ پچھلی فصل میں ہم اس کی تفصیل کر چکے ہیں۔

عمل صالح کی حقیقت

"عملو الصّٰلحٰت" ایک جامع کلمہ ہے جس میں تمام اعمال حسنہ سمٹ آئے ہیں۔ اور یہ مسئلہ کا ایک ظاہر پہلو ہے، جو محتاج تشریح نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک دقیق نکتہ بھی ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ کو "صالحات" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس سے ایک عظیم الشان حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ درحقیقت انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیاوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہیں۔ یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا، جو انسان کی زندگی اور نشو و نما کا سبب ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کے مطابق وہ عروج ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جائے۔

اس چیز انسان کے غایت وجود کو پورا کرتی ہے اور اسی سے وہ درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ فطرت انسان سے یہی چیز مراد ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا

اور آیت ذیل میں عبادت سے یہی چیز مقصود ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ — اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر تاکہ میری عبادت کریں

عبادت، یعنی طاعت الٰہی جس پر تمام شخصی و اجتماعی صلاح و فلاح کا دارمدار ہے۔

اس نکتہ کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کائنات کی اس مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس لئے اس کے اعمال میں سے صالح اعمال صرف وہی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت و تدبیر کے موافق ہوں جو اس نے اس کلی نظام کے لئے پسند فرمائی ہو۔ کیونکہ خدا نے اس دنیا کو عبث نہیں بنایا ہے۔ ایک خاص نظام و حکمت ہے جو اس پوری کارخانہ میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر جو کچھ ہو اس نظام و حکمت کے ماتحت ہو۔ اس سے الگ ہو کر نہ ہو۔

اور یہ جو تم اس کائنات کے ہر گوشہ میں ایک کشمکش اور تصادم دیکھ رہے ہو تو یہ بھی درحقیقت اس کائنات کی ترقی اور نشو و نما ہی کے لئے ہے۔ یہ تغیر و تحول کا ایک سلسلہ ہے جو ہر پرانی حالت کو ایک نئی حالت سے بدل رہا ہے تاکہ یہ نظام اپنی حالت پر قایم رہ سکے۔

قرآن مجید میں صاف تصریح ہے کہ انسان کا ارتقاء عمل صالح پر مبنی ہے اور تمام عالم، اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے ایک خاص حکمت کی طرف جا رہا ہے۔

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ — اسی کی طرف عروج پاتا ہے کلام طیب اور وہ عمل صالح

يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ

کو رفعت بخشتا ہے (انسان کا یہ عروج عمل صالح اور اس غایت حسن کا نتیجہ ہے جو اس کائنات کی خلقت سے اللہ تعالیٰ کا منشا ہے) اور جو لوگ برائی کی سازشیں کرتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان لوگوں کی تدبیر نامراد ہوگی (کیونکہ بری تدبیریں ان حق کے خلاف ہیں جو کائنات کی اصلی روح ہے اسلئے جو کوشش اسکے ابطال کیلئے ہوگی اللہ تعالیٰ اسکو فروغ نہ دیگا کیونکہ اس کائنات کی تخلیق کا منشا

درحقیقت ایک عظیم الشان غایت وحکمت ہے جس کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں حق ہے۔"

اس اصول کی ایک سے زیادہ آیات میں تشریح ملتی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ (الانبیاء)

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کرتے ہوئے۔ اگر ہم چاہتے کہ بنائیں کوئی کھلونا تو ہم اسکو بناتے اپنے پاس اگر ہم کو کرنا ہی ہوتا۔ بلکہ ہم ماریں گے حق کو باطل پر پس وہ اس کا سر توڑ ڈالیگا اور باطل دفعتہً برباد ہو جائیگا اور تمھارے لئے خرابی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی کہ زمین کی وراثت صالحین کے لئے کیوں مخصوص ہوئی مفسدین اس غایت کے خلاف چلتے ہیں جو اس عالم کی تخلیق کا منشا ہے اور صالحین اس روش پر چلتے ہیں جو صحیح منزل مقصود پر پہنچاتی ہے۔ اس لئے فرمایا۔ والذین آمنوا وعملوا الصلحت لندخلنهم فی الصالحین۔ جو لوگ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں البتہ ہم ان کو داخل کریں گے صالحین میں۔ یعنی صلحاء کے زمرہ میں جو درحقیقت انبیاء، صدیقین اور شہداء کا زمرہ ہے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں مفسدین کی ہلاکت اور صالحین کی برکت کا ذکر اکثر آیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث
اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ ہمارے صالح بندے ہوں گے۔ بے شک اس میں پیام
اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِيْنَ (یعنی پیام خوشخبری) ہے عبادت کرنیوالی قوم کے لئے۔

"عبادت کرنیوالی قوم" یعنی وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تابعدار ہو کیونکہ تمام صلاح و تقویٰ کی جڑ، جیسا کہ معلوم ہو چکا ہی ہے۔ نافرمان شخص صرف اپنا ہی دشمن نہیں ہوتا بلکہ تمام خلق کا دشمن ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر صرف اپنا نفس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ شرائع و حدود کو نہایت نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کی بہبود درحقیقت سب کی بہبود سے وابستہ ہے۔ باقی رہے صالحین تو وہ زمین کے نمک ہیں۔ تمام عالم کی اصلاح و ترقی انہی کے دم سے ہے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے ہیں تمام عالم کے لئے کرتے ہیں اور صرف اپنے ابنائے زمانہ ہی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ان نسلوں کے لئے بھی کرتے ہیں جو ان کے بعد آئیں گی اور یہی وجہ ہے کہ وہ وراثت عالم اور خلافت الٰہیہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

حق ہمارے عروج کی غایت ہو

۱۱۔ حق اصل میں موجود و قائم کو کہتے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے اس کے معانی مختلف ہو گئے ہیں۔

کم از کم تین معنوں میں تو اس کا استعمال عام ہے۔

(۱) وہ بات جس کا وقوع قطعی ہو۔

(۲) وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔

(۳) وہ بات جو اخلاقاً واجب ہو۔

قرآن مجید نے اس لفظ کو ان تمام معانی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ۔ بے شک اہل دوزخ کا یہ جھگڑا ضرور واقع ہوگا۔ ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ۔ پس وہ اپنے حقیقی مولیٰ کی طرف لوٹائے جائینگے

ا موالہم حق للسائل والمحروم اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کا حق ہے۔ یعنی ایک دینِ واجب کی حیثیت سے
باقی رہے وہ خاص معنی یعنی ضعفار کی ہمدردی جس کا ذکر ہم نے پانچویں فصل میں کیا ہے تو وہ اسی عام معنی
متفرع ہے گویا اہل عرب کے نزدیک سب سے بڑا حق یہی ہے جو ہر مستطیع پر لازم اور ہر مستحق کو حاصل ہے جو عقل کے
یک مسلم اور تمام لوگوں کے نزدیک متعین و معروف ہے اسی لئے احسان کو معروف کہتے ہیں یعنی ایک ایسی
ن جو ہر شخص کے نزدیک جانی پہچانی ہوئی ہے اور ایک قانون مسلم کی حیثیت رکھتی ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ حق بمعنی مواسات کے اندر ان تمام معانی کی جھلک ہے جو اوپر بیان ہوئے
۔ پس اگر حق کو اس کے عام اور وسیع معنی میں لو تو اس چیز کو کہینگے جو عقل و دل دونوں کو ایک ساتھ محبوب ہو
لم و عمل دونوں پر حاوی ہو جائے اور جور و فساد کی ضد ہو۔
اس کے بعد ہم حق و صبر کی حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان دونوں کے درمیان جو باہمی تعلق
، وہ واضح ہو سکے اور اس سورہ کا نظم اس کے معنی کی وسعت کے لحاظ سے سامنے آجائے۔

حق و صبر کی توضیح اور انکا باہمی تعلق

۱۲۔ نجات کا دار مدار عقلی اور اخلاقی قوی کی اصلاح پر ہے اور عقل و دل دونوں کے شدت و لینت
اعتبار سے دو پہلو ہیں۔ عقل کی لینت اور نرم خوئی کا پہلو یہ ہے کہ وہ فوراً حق کے سامنے جھک جانے کیلئے
تعد رہے۔ وہ جہاں بھی اور جس وقت بھی ظاہر ہو۔ اور قلب کی لینت یہ ہے کہ وہ خالق کی محبت اور مخلوق
ہمدردی میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ پس عقل حق پر ایمان لاتی ہے۔ حق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کی صفات
کی آیات۔ اور قلب اپنی بندگی کا احساس کرتا ہے اور پھر بے تابانہ اپنے مولائے حقیقی کی طرف بڑھتا ہے اور
ت کی ہمدردی کا جو فرض اس پر عائد ہوتا ہے اس کے جوش و احساس سے معمور ہو جاتا ہے
عقل کی شدت کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس حق پر، جو آنکھوں سے اوجھل ہے، ثابت قدم رہے اور

اور اس باطل کو جو نگاہوں کے سامنے موجود ہے چھوڑے اور اس پہلو سے قلب کا فرض یہ ہے کہ وہ مصائب و شدائد کے مقابل میں اپنے قدم جادۂ مستقیم سے نہ ڈگنے دے اور قدرت کے وقت عفو و درگذر سے کام لے۔

یہ حق کا تعلق قلب و عقل سے ہوا۔ بالکل یہی حال صبر کا ہے۔ وہ بھی عقل اور دل دونوں سے لگاؤ رکھتا ہے اجمال ان تفصیلات کا یہ ہے کہ حق تمام بھلائیوں کے دروازے کھولتا ہے اور صبر تمام برائیوں کے دروازے بند کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حق اصل مطلوب و محبوب ہے اور صبر اس کے لئے جوش طلب اور سرگرمی ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ — بیشک جن لوگوں نے کہا (یعنی سچائی کے ساتھ) ہمارا رب اللہ ہے

ثُمَّ اسْتَقَامُوْا — (یہ قول یقین و طاعت دونوں کا مجموعہ ہے کیونکہ جو ربوبیت کا اقرار کریگا وہ یقین و اطاعت دونوں سے معمور ہوگا) پھر اس پر ....

یعنی حق کو قبول کیا پھر اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہے۔

اہل بصیرت سے یہ راز مخفی نہیں ہے کہ حصول سعادت کے بعد اصلی چیز اس پر استقامت اور دوام ہے۔ اب غور کرو، دو لفظوں۔ حق و صبر۔ کے اندر تمام سعادتیں اور بھلائیاں کس خوبی اور اختصار کے ساتھ جمع ہوگئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کس قدر گہرا اور وسیع تعلق ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ صبر صرف اسی وقت مطلوب نہیں ہے جب انسان تمام بھلائیوں کو حاصل کر چکے بلکہ ہر نعمت خیر کے بعد تمسک اور استقامت کی ضرورت ہے تاکہ انسان مزید نعمت کا مستحق ہو سکے۔ صبر درحقیقت تمام بھلائیوں کا معاون ہے۔ اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ اس کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالٰی نے انبیاء علیہم السلام کو سب سے پہلے صبر کی تعلیم فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کا جو واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے سب سے پہلے حضرت موسیٰ سے صبر ہی کا مطالبہ کیا اور اسی چیز میں ان کا امتحان لیا۔ اس کی مزید تفصیل پندرہویں فصل میں آئے گی۔ یہاں محض اس بات کی طرف اشارہ

کرنا مقصود تھا کہ حق و صبر درحقیقت ہماری سیر باطن کے دو قدم ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہاں درحقیقت تفصیل و تفریع کا ایک سلسلہ ہے۔ ایمان ایک اصل اور مرکزی حیثیت سے تھا اس کے بعد عمل صالح کا ذکر اس کی تفصیل کی حیثیت سے آیا۔ اسی طرح حق چونکہ دل اور دماغ دونوں کو محبوب ہے اور اسی پران دونوں کے عروج و کمال کا انحصار ہے اس لئے اس محبت کے نتیجہ کے طور پر صبر کا بیان ہوا۔ کیونکہ محبت کا اقتضا یہ ہے کہ شئے محبوب کے لئے ثابت قدمی اور استقامت پیدا ہو اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ثابت قدمی اور استقامت محبوب کی حیثیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جو شئے جس قدر محبوب ہوگی اس کے لئے اسی قدر پامردی اور استقلال کا جوش ابلیگا۔ مدافعت، غضب اور غیرت کے جذبات کا ظہور ہر شے کے لئے یکساں نہیں ہوتا۔ متفاوت ہوتا ہے۔ جو شئے دل کو جسقدر عزیز ہوتی ہے اس کے لئے اسی درجہ کا جذبہ غضب و غیرت بھڑکتا ہے۔

اللہ تعالے کے غضب و انتقام کی بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کو حق عزیز و محبوب ہے۔ اس لئے جو لوگ حق کو پامال کرتے ہیں ان پر اس کا قہر و غضب بھڑکتا ہے۔ جو شئے تم کو عزیز و محبوب ہے کیا تم اس کی تحقیر و اہانت چپ چاپ برداشت کر لوگے؟ اس کی حمایت کے لئے تمہاری غیرت ضرور جوش میں آئے گی! ماں اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ یہ محبت تنہا نہیں ہوتی بلکہ اپنے ساتھ ایک مجنونانہ غیرت بھی رکھتی ہے اور جب وقت آتا ہے ماں کو بچہ کی حمایت میں قربان کر دیتی ہے۔ یہی جوش حمایت و غیرت قوموں میں اپنے قومی و وطنی حقوق و مقاصد کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مسکین کبوتری بھی۔ اپنے انڈوں اور بچوں کے لئے اپنے اندر محبت کا جذبہ اور غیرت کا جوش رکھتی ہے۔ اگر تم اس کے انڈوں اور بچوں کو اس سے چھیننا چاہو گے۔ اپنے کمزور پروں سے ضرور تم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر درحقیقت محبت حق سے پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ بریں ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ وہ یہ کہ "حق" جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، سرتاسر

غیبت اس وجہ سے اس کے لئے صبر کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ — پس ثابت قدم رہو بیشک اللہ کا وعدہ ضرور واقع ہوگا۔

حق و صبر کے باہمی تعلق کے ان پہلوؤں کو برابر پیش نظر رکھو۔

عمل اور تواصی کا باہمی تعلق

۱۳۔ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل حق و صبر ہیں اور ان چیزوں پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو ان کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تفصیل آیت کے اندر موجود ہے لیکن اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے کیونکہ اولاً تو آمنوا و عملوا الصلحت اس پر مشتمل ہے۔ ثانیاً وعظ بے عمل کی برائی اسقدر واضح ہے کہ اس موقع پر جو مدح کا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان سے عمل صالح پیدا ہوا اسی طرح عمل صالح سے تواصی وجود میں آیا کیونکہ جس شخص کی نگاہوں میں حق محبوب ہوجائے گا اور اس کیلئے صبر و استقامت کی تمام کڑیاں جھیل لیگا۔ اس کے بارہ میں اس کا علم، اس کی محبت، اس کی غیرت ہر چیز بڑھ جائے گی۔ اور اب وہ صرف اسی قدر نہیں چاہے گا کہ خود اس سے محبت کرے بلکہ یہ بھی چاہے گا کہ تمام دنیا اس سے عشق کرے اور جہاں کہیں بھی حق کو مظلوم و مقہور اور باطل کو غالب و فتحمند دیکھے گا تڑپ جائے گا۔ اور ایک غیور اور شریف نوجوان کی طرح دوسروں کو ابھارے گا کہ حق کی حمایت کے لئے آمادہ ہوں اور اس کا یہ ابھارنا بھی درحقیقت خود اسی کی حمایت حق کا ایک جزو ہوگا۔ پس یہاں تواصی عمل صالح کے ایک جزو کی حیثیت سے ہے اور اللہ تعالی نے اس کا ذکر تفصیل و توضیح کے طریقہ پر فرمایا ہے۔

پھر اوپر ہم بیان کرچکے ہیں کہ عمل صالح ہی امن اور تمدن کی بنیاد ہے۔ پس اس اعتبار سے عمل صالح کا سب سے اہم جزو توصیہ حق و صبر کو ہونا چاہئے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کے اجتماع کی ایک اور لطیف

ں بھی ہے۔ فرمایا ہے

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی نیکی اور تقوی پر تعاون کرو

اس آیت میں 'بر' درحقیقت حق کے قائم مقام ہے اور تقویٰ صبر کی ایک دوسری تعبیر ہے اس لئے

قوی کے معنی ہیں نفس کو لغزش کے مواقع پر حمایت حق میں ثابت قدم رکھنا۔

فرض دعوت اور آزادی قول

۱۴۔ گذشتہ صفحات میں عمل صالح، حق، صبر اور تواصی وغیرہ کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اس سے اچھی طرح

ح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک سورہ کے چند الفاظ کے اندر سیاست، تعاون اور اتحاد معیشت کے کیا

صول و فرائض بیان فرمائے ہیں۔ اور اجتماع کے عام معاملات و احوال سے الگ تھلگ رہنے کے خیال

ں طرح ابطال کیا ہے۔ اور چونکہ یہ سورہ صرف امور مہمہ کے بیان کے لئے مخصوص تھی اس لئے اس میں

ں کا ذکر کرنا ہمارے دعوی پر صاف حجت ہے۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم پر تواصی کا فرض عاید کیا ہے

ا ہم کو اظہار حق کے لئے آزادی قول بھی بخشی ہے۔ چنانچہ ہم اسلام کے اصول میں یہ بات پاتے ہیں کہ ایک طرف

ت پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ وہ امیر کی کامل اطاعت کرے اور دوسری طرف اس پر یہ ذمہ داری بھی عائد

ی ہے کہ وہ حق کا اعلان کرے اور نصیحت کا کلمہ کہنے میں ہر خوف سے بیباک ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس

ں کو اللہ تعالیٰ نے شہدا کے لقب سے ممتاز فرمایا اور خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ بڑھیا عورتیں ان کو

بر ٹوک دیتی تھیں اور وہ ان نصیحتوں کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ

لم کو مشورہ کا حکم دیا تا کہ لوگوں کو کلمۂ حق کہنے کی جرأت ہو۔ چنانچہ صحابہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی رائیں پوری بیخوفی

ا ہر کر دیتے تھے اگرچہ ان میں سے کسی کی رائے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف ہو۔

لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ آزادی رائے فتنہ و فساد کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارا اصلی فرض بر و تقوی کے لئے تعاون ہے۔ اس اصل عظیم کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ اس لئے اگر ایسا ہو کہ ہم کسی معاملہ میں کوئی رائے دیں اور ہماری وہ رائے نہ مانی جائے تو ہم کو فتنہ و فساد کا حق حاصل نہ ہوگا۔ عصیان و انکار کا حربہ آخری حربہ ہے جب تمام اسلحہ بیکار ہو جاتے ہیں اس وقت یہ ہتھیار اٹھایا جاتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب تمام جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو۔ آیت ولا تفسدوا فی الارض الخ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم نے مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اس لئے یہاں سرسری اشارہ کافی ہے۔

حق و صبر کی مزید توضیح

۱۵- اگر پچھلی فصلوں کو تم نے بغور پڑھا ہے تو یہ بات بالکل صاف نظر آ گئی ہوگی کہ حق و صبر کی حیثیت درحقیقت دو عظیم الشان پہاڑوں کی ہے جن پر شریعت غرائے اسلامیہ کے ستون اور اس ملکوت اللہ کے ارکان قایم ہیں۔

اوپر گذر چکا ہے کہ اللہ تعالی نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ حق یعنی عدل و حکمت۔ چنانچہ فرمایا

لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ — اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین دونوں درہم برہم ہو جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا اس زمین کی خلافت اور نبوت و شریعت کی نعمت کسی قوم کو بخشتا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حق کی اطاعت کرنیوالی اور قسط کو قائم کرنے والی ہو۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ — اے ایمان والو عدل کے قائم کرنے والے بنو۔ اللہ کے لئے گواہی دیتے ہوئے (یعنی قسط کی گواہی) اگرچہ خود تمہارے خلاف ہو۔

قسط سے مراد حق ہے اور علم اور عمل دونوں سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

"وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ"۔ دوسری جگہ فرمایا "وَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ"۔ ایک جگہ ہے "قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ"۔ "الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ"۔ پھر فرمایا "يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ"۔ اسی طرح "وَقَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ"۔ "ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ"۔ "فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ"۔ "وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ"۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ حق کا قیام اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لازمی فرمایا ہے۔ کیونکہ اس نے آسمانی بادشاہت کی بنیادیں اسی بنا پر قائم کی ہیں۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى	اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں
الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ	کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو (یعنی قسط کے ساتھ)
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ	اور خواہش کے پیچھے نہ چلو (کیونکہ یہ حق کے راستہ سے انحراف ہے)
اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ	کہ تمہیں اللہ کے راستہ سے ہٹا دے (اس آسمانی بادشاہت
اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا	کے راستہ سے جس کے تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلیفہ مقرر کئے
يَوْمَ الْحِسَابِ ۞ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ	گئے ہو) بیشک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹک جائینگے
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ	ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے
ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	حساب کے دن کو فراموش کر دیا۔ (حساب کا دن یعنی "
. . . .	ظالموں کے بدلہ پانے کا دن) اور ہم نے نہیں پیدا کیا
. . . .	آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل
. . . .	(پھر اپنی مخلوق کے لئے کیسے پسند کر سکتا ہوں کہ وہ حق
. . . .	کے راستہ سے منحرف ہو جائے) یہ (یعنی آسمان و زمین
. . . .	کا بے مقصد اور باطل پیدا ہونا ان لوگوں کا گمان ہے

[illegible]

اب صبر پہ غور کرو، وہ تمام قومیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب بخشی، پہلے ان کے صبر کا امتحان لیا اور جب اس امتحان میں پوری اتریں، اپنی عزت و نعمت کے تاج سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی عظیم الشان پل یا بلند عمارت تعمیر کرنی ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ایک ایسی سخت زمین کی تلاش کی ضرورت ہے جس پر ایک ٹھوس بنیاد قائم کی جا سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قوموں کے انتخاب کے معاملہ میں ایسا ہی کرتا ہے پہلے ان کو مصائب و شدائد میں آزماتا ہے جب اس میں وہ بالکل پکی ثابت ہوتی ہیں، اپنی امانت ان کے حوالہ کرتا ہے اور ان کو ایک نئی امت کی صورت میں نئی طاقتوں سے مسلح کر کے میدان میں کھڑا کرتا ہے اور ان کے تمام دشمنوں کو پامال کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانون ابتلا کا بار بار ذکر فرمایا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ

اور ہم تم کو آزمائیں گے یہاں تک کہ جان لیں تم میں سے مجاہدین کو اور ثابت قدموں کو اور جانچ لیں تمہارے احوال کو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ - أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ

اگر تم کو زخم پہنچا تو غم کی بات نہیں تمہاری مخالفوں کو بھی زخم پہنچا اور یہ ایام لوگوں کے درمیان ہم پھیر بدل کرتے رہتے ہیں، اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو تم میں سے ایمان لائے (سچ مچ)، اور بنائے تم میں سے شہداء (یعنی امم عدل)، اور اللہ نہیں دوست رکھتا ظالموں کو، اور تاکہ پاک صاف کرے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک نہیں معلوم کیا اللہ نے ان لوگوں کو جو تم میں سے مجاہد ہیں اور نہیں معلوم کیا ان لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

اور بنی اسرائیل کے قصہ میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ ان کی عزت و ذلت کا مدار تمام تر صبر پر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو جو کچھ بخشتا ہے، ان کے اعمال کے اعتبار سے بخشتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے وَلَیَنصُرَنَّ اللّٰہُ مَن یَّنصُرُہ۔ جو اللہ کی مدد کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ اللہ ثابت قدموں کو دوست رکھتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ اور ہم نے ان میں ائمہ بنائے جو ہدایت کرتے تھے ہمارے امر سے جبکہ وہ ثابت قدم رہے۔ انبیاء کرام کے حالات پڑھو۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے ایک مدت تک آزمائشیں جھیلیں اور مصائب برداشت کئے یہانتک کہ ان کی استقامت کی پوری آزمائش ہوگئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ چنانچہ فرمایا۔

فاصبر کما صبر اولوا العزم من	پس ثابت قدم رہو جس طرح ثابت قدم رہے
الرسل ولا تستعجل لھم	انبیائے اولوالعزم اور ان کیلئے (کفار کیلئے) جلدی نہ کرو۔

یعنی ان پر عذاب یا غلبہ کے لئے جلدی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ اس پورے کارخانہ کائنات کے اندر نافذ ہے۔ اس نے ہر چیز کے لئے ایک ٹھہرائی ہوئی مدت اور ایک اندازہ کی ہوئی مہلت بخشی ہے تاکہ ہر چیز اپنے مقدرہ عروج و کمال کو پہنچے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قوی ودیعت فرمائے ہیں وہ تمام ظہور میں آئیں۔ اس لئے وہ ظالموں پر عذاب کرنے میں عجلت نہیں فرماتا بلکہ ان کی مقررہ مدت تک ان کو مہلت بخشتا ہے۔

ولو یواخذ اللہ الناس بظلمھم	اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے ظلم پر (فوراً) مواخذہ کرتا
ماترک علی ظھرھا من دابۃ ولکن	تو زمین کی پشت پر ایک جاندار بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ لوگوں کو
یوخرھم الی اجل مسمی فاذا جا	ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے پس جب آجائیگی
اجلھم فان اللہ کان بعبادہ بصیرا	انکی اجل تو بیشک اللہ اپنے بندوں کا نگران حال ہے

یعنی جب یہ مقررہ اجل آجائے گی تو اللہ تعالیٰ قانون حق کے مطابق ان کا فیصلہ فرمادے گا۔ صبر ہے جو تدبیر و انتظام کائنات کے عالم میں حلم سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر مقامات پر صبر کا حکم فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

سَالَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ	مانگا مانگنے والے نے واقع ہونے والا عذاب کافروں
لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ	کے لئے اسکو کوئی دفع کرنیوالا نہیں ہے اسکا درجوں
تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ	والے اللہ کی جانب۔ چڑھتے ہیں اسکی جانب فرشتے
كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ	اور روح ایک ایسے دن میں جسکی مقدار پچاس ہزار برس
فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ	پس صبر کرو، خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ اس کو دور
بَعِيْدًا ۔ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۔	خیال کرتے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھتے ہیں۔

اگر تم قوموں کی تاریخ پر غور کروگے، دو باتیں نہایت صاف نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ خدا کا قا ہر گوشہ میں جاری و نافذ ہے۔ اور ہر معاملہ کی آخری کروٹ حق کی طرف ہوتی ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَ فَيَدْمَغُهٗ۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا قانون بندوں کے معاملہ میں نہایت حلیم ہے وہ ان کو آخری حد تا دیتا ہے تاکہ جو کچھ ان کو بخشا ہے اس میں پوری طرح آزمالے کہ وہ کونسی راہ اختیار کرتے ہیں ان لوگو جنھوں نے کفران نعمت کیا اور تباہ ہوئے یا ان لوگوں کی جنھوں نے شکر کیا اور اطاعت کی راہ پر چل کر مقصود کو پہنچے۔ فرمایا۔

ولقد اهلكنا القرون من قبلكم	اور ہم نے بہت سی قوموں کو تم سے پہلے ہلاک کیا جب
لما ظلموا وجاءتهم رسلهم بالبينات	انھوں نے ظلم کیا اور آچکے ان کے پاس ان کے رسول
وما كانوا ليؤمنوا كذلك نجزي القوم	کھلی کھلی نشانیاں لیکر اور نہیں تھے ایمان لانیوالے
المجرمين ۔ ثم جعلناكم خلائف	اور ایسی ہی ہم بدلہ دیتے ہیں مجرم قوم کو۔ پھر ہم نے بنایا

فی الارض لننظر کیف تعملون — تم کو جانشین ان کا زمین میں تاکہ دیکھیں تم کیسا عمل کرتے ہو۔

اور حلم اور صبر دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر، حق کی بنیاد ہے پس اگر اللہ تعالیٰ عذاب میں جلدی فرمائے تو وہ حکمت باطل ہو جائے گی جس کو وہ ظاہر فرمانا چاہتا ہے اور وہ حق ظہور میں نہ آسکے گا جو اس تمام کائنات کا خلاصہ ہے چنانچہ فرمایا ہے۔ وہو الذی یخرج الخبٔ فی السموات والارض۔ یعنی زمین اور آسمان کی فطرت کے اندر جو مصالح و حکم دویعت ہیں انکو ظاہر فرماتا ہے اس پر ایک حد تک چھٹی اور بارہویں فصل میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں اسلئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

حق اور حلم دونوں کے مزاج میں کسی قدر نمایاں تفاوت ہے! ایک سرتاپا سخت گیری اور احتساب کا مظاہرہ ہے دوسرا یکسر عفو و درگذر کی خاموشی۔ لیکن اس کے باوجود تم نے دیکھ لیا کہ یہ دونوں اسطرح ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں گویا دونوں بالکل توام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان دونوں کا علم ایک ساتھ فرمایا تاکہ ایک ہی وقت میں ہمارے لئے ہماری باطنی و ظاہری اخلاق کی اصلاح کے دروازے بھی کھول دے اور زمین کی وراثت اور آسمان کی تمام نعمتیں اور برکتیں بھی بخشدے اور ہم اس راہ پر گامزن ہو جائیں جو بندگی اور خلافت الہیہ کی تکمیل کی راہ ہے اور جو ہمارے اس پروردگار نے کھولی ہے جو عدل اور عفو کو پسند کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اس کائنات کا انتظام فرماتا ہے۔ اس بحث کی پوری تفصیل ہماری کتاب ملکوت اللہ میں ملے گی۔

سورہ کا تعلق ماقبل و مابعد سے

۱۷۔ سورہ کے موقع اور نظام کی توضیح کے لئے کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سابقہ سورہ، جیسا کہ جان چکے ہو، ان ارباب نعمت کے خسران کے بیان میں ہے جو زخارف دنیا کی طلب میں منہمک ہیں۔ اور بعد والی سورہ میں اس عذاب کی تصویر کھینچی گئی ہے جس میں یہ ارباب نعمت مبتلا ہوں گے۔

پستہ یہ سورہ ان دونوں سورتوں کے درمیان رکھی گئی تاکہ ان کی آرزوؤں کی نامرادی اور کوششوں کی بربادی پر تنبیہ فرمائی جائے۔ اسی ضمن میں مومنین کے فضائل بتائے اور کامیابی کے راستہ کی طرف اشارہ فرمایا اور یہ وہی مقابلہ والا اصول ہے جو قرآن مجید میں بہت عام ہے۔ مثلاً اچھوں کے ذکر کے ساتھ بروں کا ذکر آتا ہے اور جنت کے ساتھ دوزخ کا بیان ہوتا ہے

اور اس سورہ کا تعلق ماقبل سورہ سے بالکل ویسا ہی ہے جیسا اس آیت کے اندر ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ	اے ایمان والو، نہ تم کو غفلت میں ڈالیں تمھارے
أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ	مال و اولاد اللہ کی یاد سے اور جو ایسا کرے گا
اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ	تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے اور اللہ کی
هُمُ الْخَاسِرُونَ. وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ	راہ میں خرچ کرو۔ اس روزی میں سے جو ہم نے
مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ	تم کو بخشی ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت اس
فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ	کے سر پر آ جائے۔ پس وہ کہے اے میرے رب کیوں
قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ	نہ دی تو نے مجھکو کچھ مہلت کہ میں صدقہ کرتا اور
الصَّالِحِينَ ○	بنتا نیکوکاروں میں سے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کرو اس سے سورہ تکاثر اور سورہ والعصر کا باہمی تعلق بالکل واضح ہو جائیگا۔

هذا و لا يحيط بعلمه وكلماته الا هو۔

معارف قرآن

اقسام قرآن

۲

از جناب مولوی حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی

پچھلی تصریحات سے یہ ثابت ہوگیا کہ قسم کا وہی مفہوم صحیح ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یعنی استشہاد و استدلال۔ مگر یہ بات محتاج تشریح ہے کہ اس غرض کے لئے استدلال کا عام طریقہ نظر انداز کرکے قسم کا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دلائل طلب امور دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے اندر نفرت و رغبت کا پہلو رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جنکے اندر نفرت و رغبت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ مؤخر الذکر علوم طبیعیہ و ریاضیہ وغیرہ ہیں۔ ان میں محض ایک دعوی کا اثبات ہوتا ہے، نفرت و رغبت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس لئے ان کے استدلال کا اسلوب ہمیشہ یکساں رہتا ہے اور اول الذکر نفسیاتی امور ہیں۔ ان کے اندر رغبت و نفرت کا پہلو ہوتا ہے اس میں متکلم کبھی مخاطب کو کسی بات پر ابھارتا ہے کبھی نفرت دلاتا ہے۔ کبھی کسی کی تعریف کرتا ہے، کبھی سرزنش کرتا ہے۔ اس لئے ان مختلف حالات میں لازماً استدلال کے پہلو مختلف ہوتے ہیں۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں تصریح کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تصریح کی جاتی ہے۔ بعض جگہ اشارہ کافی ہوتا ہے ایسے مواقع پر صرف اشارہ سے کام لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں مخاطب کے لحاظ سے بحث و استدلال کی عام روش بالکل ہی ترک کردینی پڑتی ہے اور ایک ایسا ڈھنگ اختیار کیا جاتا ہے جو دوسرے مواقع کے لئے بالکل ناموزوں ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مجادلہ کرنے والے بادشاہ کے مکالمہ میں موجود ہے جو قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر قسم کے اسلوب استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعۂ بلاغت ہے۔ ان
پر کھا کر کوئی اسلوب پراثر، بلیغ اور جامع دلائل نہیں ہو سکتا۔ اسکی تفصیل ذیل میں آتی ہے۔

(۱) اہل عرب کا عقیدہ ہے کہ کوئی شریف آدمی کسی بات پر قسم کھاتا ہے تو وہ بالکل یقینی ہوتی ہے۔ شخص جھوٹی قسم کھانے کی ذلت گوارا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انھوں نے کسی بات کی قطعیت ثابت کرنے کے قسم کا اسلوب اختیار کر لیا ہے۔

(۲) قسم چونکہ انشا ہے اس لئے اس میں مخالف کے لئے رد و انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی برعکس اس کے اگر خبر ہو تو انکار و اقرار دونوں کا موقع ہوتا ہے۔ مثلاً

قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ	قرآن مجید کی قسم۔
وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ	یوم موعود کی قسم۔

یہ آیتیں خبر کے معنی پر مشتمل ہیں کیونکہ اگر ان کی تشریح کی جائے تو انکی صورت یہ ہوگی۔ ان ھٰذا المجید۔ بلاشبہ قرآن بزرگ ہے۔ ان لھم یوما موعودا تحقیق ان کے لئے ایک دن وعدہ کا ہے لیکن قسم نے ان کے خبری مفہوم کو اسقدر مخفی کر دیا ہے کہ مخاطب کا ذہن ان کی طرف رد و انکار کے لئے متوجہ نہیں ہوتا۔ قسم کا طریقہ استدلال کیلئے نہایت مناسب ہے اس لئے کہ اس میں الفاظ کم ہوتے ہیں اور الفاظ جتنے ہی کم اور مختصر ہوں گے اتنا ہی ان کے معانی جلد ذہن نشین ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ارباب عرب بسا اوقات استعارہ کو تشبیہ سے زیادہ بلیغ کہتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ کے اہل ادب کا کہنا تو یہ ہے کہ ایجاز ہی کا دوسرا نام بلاغت ہے۔ پھر عربوں کو ایجاز خصوصیت کے ساتھ بہت مرغوب تھا۔ وہ نہایت ذہین اور سخن سنج تھے اس لئے دوسری قوموں کی بہ نسبت ایجاز و اختصار کو نہایت پسند کرتے تھے۔ قرآن پاک میں دیکھئے الفاظ نہایت مختصر اور سادہ ہیں لیکن معانی کی فراوانی اور مفہوم کی وسعت کا کیا عالم ہے! جہاں کہیں قرآن کریم میں اطناب ہے تو وہ اطناب بھی بعض دوسرے پہلوؤں سے ایجاز ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

انسانی عقل وفہم نے عجائب قرآن کے متعلق اعتراف کیا ہے کہ وہ غیر متناہی ہیں۔

۴۔ قسم کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دلیل تلاش کرنے کے لیے مخاطب کو ایک حد تک کاوش کرنی پڑتی ہے۔ اور انسانی فطرت کی خصوصیت ہے کہ جو چیز اس کو کاوش سے ہاتھ آتی ہے اس کو وہ نہایت عزیز رکھتا ہے اور اس کے خلاف اس کے دل میں کوئی رد وانکار کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔

۵۔ اس میں دلیل بصورت دلیل نہیں بیان ہوتی جس سے مخاطب کو مناظرہ و مجادلہ کا شوق پیدا ہو بلکہ کنین شکر میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ فرمایا۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ — زمانہ شاہد ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔

یہ انشائیہ جملہ اگر خبر کی صورت میں ہو تو یوں ہوگا۔

انّ الانسان لفی خسر لان مر الزمان ینقص العمر — بیشک انسان گھاٹے میں ہے کیونکہ زمانہ کے گذرنے سے اسکی عمر کم ہوتی جاتی ہے۔

یہ استدلال واضح اور صاف ہے لیکن مخالف کے لئے اس سے انکار کی گنجائش موجود ہے کم از کم اس کے نتائج مابعد یعنی ایمان اور عمل صالح سے تو وہ انکار کر سکتا ہے۔ مخالف کہہ سکتا ہے کہ ہر گز انسان گھاٹے میں نہیں ہے وہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہوتا ہے اور اسی عمر میں اس کی آرزوئیں بر آتی ہیں، یا یہ کہہ سکتا ہے کہ بالآخر ایک دن مرنا ہے۔ پھر کیوں نہ دل کے تمام ارمان پورے کر لیں چنانچہ امرء القیس نے کہا ہے

تمتع من الدنیا فانک فان — من النشوات والنساء الحسان

۶۔ قسمیں عموماً سورتوں کے اوائل میں مذکور ہیں جس کی وجہ سے وہ بالکل انگشتری کے نگینہ کا کام دیتی ہیں معلوم ہوتا ہے گویا معانی مجسم کر کے سورتوں کی ابتدا میں نگاہوں کے سامنے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک قسم کی صورت گری ہے۔ بلکہ بسا اوقات قسم میں تصویر سے زیادہ کمال فن معلوم ہوتا ہے۔ تصویر میں جب تک ہر جز کی پوری تصویر نہ کھینچی جائے نقص

رہجاتا ہے لیکن قسم میں الفاظ نہایت تھوڑے اور معانی بہت زیادہ ہوتے ہیں باوجود اسکے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقسم بہ کو تم نے مجسم کرکے ایک شاہد کے مانند مخاطب کے روبرو کھڑا کر دیا ہے پھر ایک تصویر میں صرف ایک ہی چیز کے خد وخال نظر آتے ہیں لیکن قسم میں عموماً بیک وقت متعدد معانی کی تصویریں پیش نظر آجاتی ہیں مثلاً تین، زیتون اور شمس، قمر کی قسمیں بیک وقت مختلف دعاوی پر حجت ہیں۔

۷۔ اس اسلوب میں پہلے دلیل بیان کی جاتی ہے یعنی بادل وہلہ مخالف کے سامنے کلام کا وہ پہلو نہیں آتا جس سے اسے انکار ہے۔ ایک منکر جب اسے دعوی پہلے سے معلوم ہو گیا تو صحیح راہ سے پھر کر انکار کی راہ اختیار کر سکتا ہے اور دعوی مذکور نہیں ہے تو ممکن ہے صحیح دلائل کی روشنی اسے صحیح راہ کی طرف مائل کر دے۔

۸۔ قسم میں ایک جامعیت ہوتی ہے اس لئے کہ مقسم بہ کے ساتھ استدلال کا کوئی خاص پہلو نہیں ہوتا اگر کوئی خاص پہلو متعین کر دیا جائے تو صرف ایک ہی دلیل واضح ہو گی مگر قرآن مجید میں عموماً ایسا نہیں ہے۔ ایک ہی چیز بے شمار معانی اور مختلف وجوہ کی جامع ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں ایک ہی چیز کو مختلف دلائل کے استنباط کا سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔ ایک جگہ ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

(اے مخاطب) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے کہ اپنی بعض نشانیاں دکھائے بلاشبہ کشتی کے چلنے میں۔ ایک صبر کرنیوالے اور شکر گذار کے لیے

ایک اور جگہ ہے۔

وفی الارض ایٰت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون

اور یقین لانیوالوں کیلئے زمین میں (قدرت خدا کی) بہتری نشانیاں ہیں اور خود تم میں بھی تو کیا تم کو سوجھ نہیں پڑتا۔

ان آیات میں خداوند قدوس کی قدرت، عظمت، رحمت پھر توحید، رسالت، معاد وغیرہ کے جو دلائل ہیں انکا استقصاء کون کر سکتا ہے؟

تاریخ قرآن حکیم

(از جناب مولوی محمد عمر صاحب نعمانی شملہ)

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اس نے مختلف سورتوں میں پچھلی قوموں
،حالات و واقعات اکثر بیان کئے ہیں لیکن ان واقعات کا طرز بیان ہماری تاریخوں کے عام طرز بیان
، بالکل مختلف ہے۔ قرآن تاریخ کے جزئی واقعات سے کوئی اعتناء نہیں کرتا، وہ جب کسی قوم کی تاریخ
ن کرتا ہے تو تاریخ کی حیثیت محض تمثیل کی ہوتی ہے۔ اور اس تمثیل کے اندر غور کرنے والے کیلئے خدا کی
ت سے کوئی خاص پیام یا کوئی ٹھوس دعوت مضمر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تفصیلی حالات سے قطع نظر
کے صرف اسباب و نتائج سے بحث کرتا ہے۔ جس کو ہم دوسرے لفظوں میں فلسفۂ تاریخ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے تاریخ کو بحیثیت تاریخ نہیں اختیار کیا ہے بلکہ جس طرح خشک اور نظری تعلیمات
افعات عالم کے ذریعہ ممثل کیا جاتا ہے اسی طرح اس نے اپنی تعلیمات کو تاریخ کے مشہور واقعات کے
یعہ نمایاں اور مشہود کر دیا ہے۔

اس خاص مقصد کی وجہ سے قدرتی طور پر واقعات کے بیان میں قرآن حکیم کا طریقہ ہماری
یخوں سے بالکل مختلف ہو گیا۔ مثلاً جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو اس کے تمام جزئیات کو
ں سمیٹتا، صرف اتنے حصہ کو لیتا ہے جتنا حصہ اس کے پیش نظر مقصد کے لئے ضروری ہوتا ہے۔
نعات کی ترتیب میں تاریخی ترتیب کا پابند نہیں ہوتا کیونکہ یہ ترتیب بسا اوقات اس کے مقاصد
ئج کی ترتیب سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ہر واقعہ کے اسباب و نتائج کو خاص اہتمام کے ساتھ بیان
ہے جو تاریخ کے دائرہ بحث سے خارج ہیں لیکن قرآن مجید ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جو لوگ قرآن مجید کے اس اصول سے ناواقف ہیں وہ اس کی وجہ سے قرآن مجید پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں حالانکہ قرآن مجید نے اس اصول کو مختلف مواقع پر خود بیان کر دیا ہے جس کے بعد قرآن پر کسی کو نکتہ چینی کا حق نہیں ہے مثلاً سورہ مائدہ میں فرمایا ہے۔

اُتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَأَ ابْنَیْ آدَمَ بِالْحَقِّ — ان کو آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ سناؤ۔

سورہ کہف میں ہے

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ — ہم تم کو ان کا قصہ حق کے ساتھ سناتے ہیں۔

سورہ قصص میں فرمایا ہے

نَتْلُوا عَلَیْكَ مِنْ نَبَإِ مُوسَىٰ وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ۔ — ہم تم کو سناتے ہیں موسیٰ اور فرعون کا قصہ حق کے ساتھ۔

ان تینوں آیتوں میں بیان واقعات کو "حق" کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اب غور کرنا چاہئے کہ حق کے ساتھ بیان کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید واقعات کو بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کرتا ہے، اس میں کسی طرح کی تحریف یا آمیزش نہیں کرتا۔ دوسرا یہ کہ قرآن مجید میں بیان واقعات بے مقصد و بے غایت محض تفریح و دلچسپی کے لئے نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر دستور ہے بلکہ اس نے تمام واقعات ایک خاص مقصد و غایت اور نتیجہ و انجام کو پیش نظر رکھکر بیان کئے ہیں اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ ان قصص و واقعات کو بحیثیت قصہ یا واقعہ کے نہ پڑھیں بلکہ ان کے نتائج و عواقب پر نگاہ رکھیں جو اصلی مقصود ہیں۔

جو لوگ قرآن مجید میں، لفظ حق کے استعمالات سے واقف ہیں وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ لفظ مذکورہ دونوں معنوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ پہلے معنی میں تو اسکا استعمال بالکل معروف ہے۔ البتہ دوسرے معنی کے لئے ان آیات کو پڑھنا چاہئے جو آسمان و زمین کی خلقت کے متعلق وارد ہیں مثلاً فرمایا ہے خلق السموات والارض بالحق (زمین و آسمان اور زمین کو پیدا کیا غایت کے ساتھ۔ الم تر ان اللہ خلق

سموات والارض (ابراہیم) کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ۔
لق السموات والارض بالحق (عنکبوت) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ۔ وھو
ن ی خلق السموات والارض بالحق (انعام) وغیرہ

ان تمام آیات میں "بالحق" سے مراد غایت اور مقصد ہے۔ چنانچہ جہاں اسی بات کو اس کے منفی پہلو
ے بیان فرمایا ہے وہاں اس کا مقابل لفظ 'عبث' اور 'باطل' یا 'سدیٰ' استعمال فرمایا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بیان واقعات اور قصص کے سلسلہ میں لفظ "حق" سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کیا ہے؟
کہ وہ واقعات کو بغیر کسی تحریف یا آمیزش کے بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کرتا ہے۔ یہ یہ کہ وہ ان کو تفریح
دلچسپی کے لئے نہیں بیان کرتا بلکہ ایک غایت و مقصد حسن کے ساتھ بیان فرماتا ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے
یہ دونوں ہیں۔ قرآن مجید واقعات کو صحت کے ساتھ بھی بیان کرتا ہے اور مقصد و نتیجہ کو بھی ہمیشہ پیش
ظر رکھتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں توریت سے اس کو ممیز کرتی ہیں۔ توریت میں تاریخی واقعات اس
ستقصاء جزئیات کے ساتھ بیان ہوتے ہیں کہ اس نے ایک مذہبی صحیفہ کے بجائے ایک تاریخی کتاب کی
صورت اختیار کر لی ہے لیکن بیان واقعات میں نہ تو صحت ملحوظ ہے، جیسا کہ اہل تحقیق کے بیانات سے
ثابت ہو چکا ہے، نہ نتائج و لوازم کا اظہار۔ حالانکہ تاریخ میں یہی چیز مقصود ہونی چاہیئے۔ توریت کے اسی نقص
کی وجہ سے تاریخی واقعات کے متعلق اہل کتاب کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف ہو گیا۔ ان کی توجہ کا مرکز واقعات
کے نتائج و لوازم نہیں رہے بلکہ ان کی تمام دلچسپی زیادہ تر واقعات کی جزئیات سے ہو گئی جس کا اظہار
اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے واقعہ کے بیان کے سلسلہ میں فرمایا ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

قرآن ہم کو سب سے پہلے جو تاریخی درس دیتا ہے وہ یہ ہے اھدنا الصراط المستقیم صراط
الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہ (۱: ۵-۷) اس آیت کے حیات
افروز اور حکمت آموز مفہوم پر جسے ہر مسلمان پنجوقتہ نمازوں میں دہراتا ہے۔ غور کیجئے۔ رب العزت ہمیں دعا

کی یوں تلقین کرتا ہے کہ "تو ہمیں سیدھا راستہ دکھلا ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تونے اپنا فضل وکرم کیا، نہ ایسے لوگوں کا راستہ جن پر غضب آیا"۔ اس آیت میں صراط مستقیم کی توضیح صراط الذین انعمت علیہم سے کیگئی ہے اس مختصر تشریح میں خداوند تعالیٰ نے دنیا کی دو اہم 'باجبروت اور متمدن قوموں کے عروج وزوال اور ان کی ضلالت وگمراہی کی مکمل تاریخ بیان کی ہے اور مسلمانوں کے سامنے ان کے دو دور پیش کئے ہیں۔ دور ارتقاء اور دور انحطاط یا دورِ عروج اور رجعت۔ یعنی ایک دور ان کا وہ ہے جب وہ راہ راست پر تھے اور حق کے پرستار تھے تو انھوں نے اس دنیا کی سرفرازی حاصل کی اور خدا نے ان پر اپنے فضل ورحمت کی بارش فرمائی۔ دوسرا دور وہ جب وہ راہ صواب سے ہٹ گئے تو خدا نے بھی اپنی نظر عنایت ان سے پھیرلی۔ ان پر غضب اترا اور ہمیشہ کے لئے ذلت ونکبت میں ڈالدیئے گئے۔

اسی تاریخی اشارہ میں صرف ترقی وتنزل کے سبب کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے اور دوسرے واقعات کا کوئی ذکر نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ مسلمان صرف وہی راہ اختیار کریں جن پر چلکر وہ ترقی کرسکتے ہیں اور خدا کے انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں اور اس راہ پر گامزن نہ ہوں جن پر چلکر اگلی قومیں ہلاک و برباد ہوئیں اور "مغضوب علیہم" قرار دیگئیں۔

قرآن مجید میں جن مقامات پر ذرا تفصیل کے ساتھ تاریخی حالات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اسی طرح کی تعلیم حکمت مضمر ہے۔ وہ اثنائے ذکر میں بار بار واقعات کے اسباب اور نتائج کی طرف اشارہ کرتا جاتا ہے اور آخر میں عموماً تمام واقعہ کا لب لباب نگاہوں کے سامنے کر دیتا ہے اس کی نہایت عمدہ مثال سورہ یوسف میں ہے۔

مذکورہ بالا نقطۂ نظر سے جب ہم قرآن کریم کے تمام واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہم پر یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کے کیا اسباب ہوتے ہیں اور کن حالات کے ماتحت کوئی قوم منازل ارتقاء کو طے کرتی ہے اور کن شقاوتوں سے دوچار ہو کر پستی میں جا گرتی ہے مثلاً کوئی قوم

پنے غرور و نخوت اور استکبار کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئی۔ کسی نے فسق و فجور بد اعمالی و بد اخلاقی کی پاداش ں سزا پائی۔ کسی پر ظلم و عدوان اور فتنہ و فساد کی وجہ سے عذاب آیا اور کسی پر خدا کے بارے میں اس کی یب کاریوں اور حیلہ تراشیوں کے باعث دنیا تنگ کر دی گئی۔ کسی پر ناپ تول کی کمی بیشی کی وجہ سے اب الٰہی نازل ہوا اور کوئی استبداد اور غلام بنانے کے جرم میں غرق کی گئی۔ مثال کے طور پر ہم چند تاریخی قعات نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ قرآن مجید بیان واقعات میں کس اصل پر نگاہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے قوم عاد کو لیجئے۔ یہ قوم اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ اور متمدن قوم تھی اور اس کو ہر قسم کے ان تعیش کی فراوانی حاصل تھی لیکن جب اس نے غرور کیا۔ اپنے سامنے ہر ایک کو ہیٹا سمجھنے لگی تو خدا نے س کا سر کچل دیا۔

فاما عاد فاستکبروا فی الارض بغیر الحق	لیکن عاد نے بلا استحقاق زمین میں غرور کیا اور کہا کون
وقالوا من اشد منا قوۃ۔ اولم یروا ان اللّٰہ	ہم سے طاقت میں بڑا ہے۔ کیا وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ جس خدا نے
الذی خلقھم اشد منھم قوۃ۔ وکانوا	ان کو بنایا وہ طاقت میں ان سے بڑا ہے وہ ہماری
بایٰتنا یجحدون (حم السجدہ)	نشانیوں کے منکر تھے۔
کذبت عاد المرسلین اذ قال لھم	عاد نے پیغمبروں کو جھوٹا کہا، جب ان سے ان کے بھائی ہود نے
اخوھم ھود الا تتقون انی لکم رسول	کہا، تم پرہیزگار بنو، میں تمہارا پیغمبر امین ہوں، پس
امین فاتقوا اللّٰہ واطیعون، وما اسئلکم	خدا سے ڈرو اور میری بات مانو، میں اس کیلئے تم سے
علیہ من اجر ان اجری الا علیٰ رب العالمین	کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ پروردگار عالم
اتبنون بکل ریع اٰیۃ تعبثون وتتخذون	کو دینا ہے۔ کیا تم ہر بلند مقام پر بے فائدہ یادگار نشانی
مصانع لعلکم تخلدون، واذا بطشتم	اور کاریگری کی عمارتیں بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ رہو گے۔
بطشتم جبارین فاتقوا اللّٰہ واطیعون	جب کسی کو پکڑتے ہو تو جابر بن کر، خدا سے ڈرو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ
بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ اِنِّيْ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ قَالُوْا
سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ
الْوٰعِظِيْنَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ
وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ (الشعراء)

اور میری بات مانو، اور اس خدا سے ڈرو جس نے تمھاری ان نعمتوں سے مدد کی جنکو تم خود اچھی طرح جانتے ہو، چوپائے اولادیں، باغ اور چشمے مجھکو ڈر ہے کہ تم پر کوئی بڑا عذاب آئے۔ انھوں نے جواب میں کہا، خواہ تم وعظ و نصیحت کرو یا نہ کرو ہم ماننے والے نہیں، یہ اگلے زمانے والوں کی عادت ہے اور نہ ہم پر عذاب آئے گا۔ ان لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو برباد کیا۔ اس واقعہ میں عبرت کی نشانی ہے، یہ لوگ اکثر ایمان لانے والے نہ تھے

مذکورہ آیات پر غور کرو کس طرح قرآن مجید نے بیان واقعہ کے سلسلہ میں قوم کی تباہی کے اسباب اس کے نتائج اور اس کی عبرتوں کی طرف اشارہ کر دیئے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ
الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ الَّذِيْنَ طَغَوْا
فِي الْبِلَادِ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ
عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے اس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا، جو بڑی بڑی عمارتوں والا تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی۔ اور ثمود جو وادی میں (بغرض تعمیر) پتھر تراشا کرتے تھے۔ اور فرعون میخوں والے کیساتھ جنھوں نے سرکشی کی ملکوں میں اور ان میں فساد کو بڑھایا پس ان پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا مارا۔

قوم شعیب کے متعلق ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

اور (ہم ہی نے) مدین (والوں) کیطرف انکے بھائی شعیب کو پیغمبر بنا کر بھیجا، انھوں نے (لوگوں کو جا کر) سمجھایا کہ بھائیو!

قَدْ جَاءَتْكُمْ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

. . . .

(سورہ اعراف)

اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس دلیل واضح تو آ ہی چکی ہے۔ تو ناپ اور تول پوری کیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں (خریدنے میں) کم نہ دیا کرو اور ملک میں اس کا (انتظام) درست ہوئے پیچھے فساد نہ کرو اگر تم ایماندار ہو یہ (طریق حسن معاملت جو میں تم کو تعلیم کرتا ہوں) تمھارے حق میں بہتر ہے۔

۳۔ لوط کی نسبت ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ

اور اے پیغمبر (ان لوگوں کو) لوط کا حال سنادو کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم ایسی بےحیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا جہان کے لوگوں میں سے

قرآن مجید میں ان واقعات کے علاوہ جن کا ذکر کیا گیا ہے دوسری قوموں اور انبیاء کے قصے بھی ہیں جنھیں ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ان تمام تاریخی حالات کے بیان کرنے کا یہی منشا ہے کہ ہم ان سے عبرت حاصل کریں چنانچہ قرآن مجید نے ہر جگہ بیان واقعات کے سلسلے میں ان کے اسباب و نتائج پر خاص طور سے نگاہ رکھی ہے اور کسی مقام پر بھی واقعہ کو محض واقعہ کی حیثیت سے نہیں بیان کیا ہے۔

تدبرِ قرآن

(۹)

امین احسن اصلاحی

خلاصۂ مباحث | پچھلی قسطوں میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اب مختصر لفظوں میں ان کا ضروری خلاصہ لکھدیتے ہیں تاکہ اصل مدعا نگاہ کے سامنے آجائے۔

(۱) قرآن مجید کلام کی اس صنف میں داخل ہے جو بعض اعتبارات سے نہایت آسان و سہل ہوتی ہے اور بعض اعتبارات سے نہایت دقیق اور مشکل۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ یہ ایک سپاٹ کتاب ہے، جس کو سمجھنے کے لئے کسی کاوش اور عمیق مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید جہانتک عام تعلیم کا تعلق ہے بالکل واضح ہے۔ پہلے ہی مطالعہ میں حرام و حلال کے تمام حدود متعین کر دیتا ہے۔ نیکی اور بدی کے پہچاننے کے تمام آثار و علائم نمایاں کر دیتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی ہے جس کو پانے کے لئے سرسری طور سے گذر جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر ٹھہر کر تدبر کرنا چاہیئے۔

(۲) قرآن مجید کی نسبت یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام و قوانین کا مجموعہ اور حرام و حلال کے معلوم کرنے کا ایک خشک اور سیدھا سادا ضابطہ ہے۔ قرآن مجید کی ترکیب، خود اس کی تشریحات کے مطابق، تین اجزاء سے ہے۔ آیات اللہ یعنی دلائل و حجج، کتاب یعنی قوانین و شرائع، حکمت یعنی روح شریعت اور قوام و مخ دیانت اسلامیہ۔ پہلا حصہ دین کی منطق ہے، دوسرا حصہ دین کا نظام ہے۔ تیسرا حصہ دین کا فلسفہ ہے۔ اس لئے قرآن مجید مزاولت اور تدبر کی چیز ہے چنانچہ حضرات صحابہ کرامؓ اسکی

ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے۔ حلقے قائم کرکے اس کی مشکلات پر غور فرماتے تھے۔ آنحضرت صلعم سے اس کی دشواریوں میں مدد چاہتے تھے۔ عقل کی طمانیت، روح و دل کی پاکی اور دنیا کی معیشت کے لئے اس کو بالکل کافی سمجھتے تھے۔ اور یہ جو بعض اجلہ صحابہ نے فرمایا ہے کہ کتاب اللہ ہمارے لئے کافی ہے، تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ہماری دین و دنیا اور عقل و روح کو جو کچھ مطلوب ہے، قرآن مجید سب کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے جسم کے لئے تو سب کچھ دیا ہو لیکن روح کے لئے اسکے پاس کوئی تشفی نہ ہو۔ یا حلال و حرام کا ضابطہ تو اس نے ہمارے سامنے رکھدیا ہو، جو معیشت دنیا میں ہمارے کام آسکے لیکن ہماری عقل کی بے چینیوں اور دماغ کی الجھنوں کو یونہی چھوڑدیا ہو اور ان کے سلجھانے کے لئے ہمیں یونانیوں کی خزعبلات، متکلمین اور فلاسفہ کی موشگافیوں اور محققین عصر کی تحقیقات کا ممنون ہونا پڑے۔ اس قول کو حدیث و فقہ کے خلاف حجت قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ حدیث و فقہ قرآن مجید سے علحدہ نہیں ہیں۔ یہ شاخیں تو اسی اصل سے پھوٹی ہیں۔ پھر اس سے علحدہ کیسے ہوسکتی ہیں!

(۳) قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ وہ ایک سپاٹ کتاب ہے۔ اس کے برعکس اس میں بے شمار آیات اس مضمون کی ہیں کہ اس پر تدبر کرنا چاہئے اور بغیر تدبر کے اسکی تعلیمات سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ قرآن مجید کو عمیق کتاب نہیں سمجھتے اور آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ سے اپنے خیال کی صحت پر دلیل لاتے ہیں ان کا استدلال بالکل کمزور بلکہ غلط ہے۔ آیت مذکورہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو عموماً سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حصول علم و تعلیم کے لئے بالکل مکمل اور صالح بنایا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ تمام پہلوؤں سے بالکل تیار اور لیس ہے۔ کوئی کور کسر نہیں ہے۔ یسّر کا لفظ صرف اس کے آسان ہونے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اصلاً اس کے کمال، جامعیت، استقصاء اور رموز و نیت کو ظاہر کرتا ہے اور اسی سے اس کا آسان ہونا بھی نکلتا ہے کیونکہ جو چیز ایک مقصد کے لئے پوری طرح ہموار اور تیار کر لی گئی وہ اس مقصد

کے لئے یقیناً سہل اور آسان بھی ہوگی۔

(۴) جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں صرف روایات پر اعتماد کرتے ہیں یقیناً وہ غلو کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مذہب اور طریقہ سے بالکل الگ ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ، اس کی تصریحات اور رعایت سیاق و سباق و نظم تفسیر میں اصل الاصول ہیں اور ضروری ہے کہ ہر آیت کی تاویل میں ان کو مقدم رکھا جائے ان سے کسی حال میں اغماض نہ کیا جائے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بغیر روایات واحادیث کی رہنمائی کے تفسیر قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ قرآن مجید جس عہد کا کلام ہے اور اول اول جن لوگوں کو اس نے مخاطب کیا ہے قدرتی طور پر اس عہد کی بے شمار خصوصیات اور اس قوم کے بے شمار احوال وعقائد اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے جن کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لئے ہم ان لوگوں کی اعانت سے مستغنی نہیں ہوسکتے جو اس کے اولین مخاطب تھے۔ اور یقیناً ہم ان لوگوں کی مدد سے فائدہ اٹھاکر قرآن مجید کے الفاظ کی حکومت باطل نہیں کرتے اور نہ ذرہ برابر اس کی قطعیت کو مشتبہ بناتے بلکہ اس کی قطعیت کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم روایات و آثار کی رہنمائی سے وہیں فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ دعویٰ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی تفسیر میں روایات و آثار کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا قرآن کے محتاج ہونے کا ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ ہماری احتیاج ہے اور ہمارے محتاج ہونے اور قرآن کے محتاج ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ہم قرآن کے سمجھنے کے لئے زبان اور نحو سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لئے ان چیزوں کا محتاج ہے۔ بس اس سے قرآن کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا۔

(۵) شان نزول سے بھی قرآن مجید کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شان نزول کی حیثیت دانیح

جو لوگوں نے عام طور پر سمجھ رکھی ہے۔ محققین کے نزدیک وہ استنباط کے قسم کی چیز ہے۔ یعنی صحابہؓ جو یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ پر اتری یا فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس آیت کے نزول کا سبب بعینہ وہی واقعہ ہے بلکہ اس کا مطلب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت فلاں حکم پر مشتمل ہے۔ معاملہ کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اس راہ کے تمام اشکالات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان سے بھی قرآن کی تفسیر میں وہیں فائدہ اٹھانا چاہیئے جہاں قرآن کے الفاظ داعی ہوں اور ان کی مدد سے کوئی گتھی سلجھ جائے۔ اور ایسے مواقع جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، قرآن مجید میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔

اس مضمون کی بعض اہم اقساط ابھی باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن سلسلہ بحث بہت دراز ہو گیا اور ناظرین شاید گھبرا گئے ہوں۔ اس لئے اب اس کے بقیہ مباحث مستقل عنوانات سے کسی دوسری فرصت میں آئیں گے۔ اور چونکہ ان میں سے اکثر کا تعلق وقت کے خاص حالات و رجحانات سے ہوگا اس لئے امید ہے کہ وہ دلچسپ بھی ہوں گے۔ اسوقت یہ سلسلہ ختم کیا جاتا ہے۔

مقالات

سیرت شبلی

(۳)

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم، اے، ایل، ایل، بی علیگ

مولانا کی تعلیم و تربیت قدرتی طور پر آغوش مادر ہر بچہ کا گہوارۂ تربیت ہوتا ہے اور وہ بنیادی خصائل جو آگے چل کر انسانی کامیابی و ناکامی کے اسباب بنتے ہیں، ان کی ابتدائی نشو و نما یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے مولانا کی والدہ مرحومہ بہت ہی متورع تھیں جنھوں نے حتی الامکان تمام عمر تہجد کبھی ناغہ نہیں کی۔ سحر خیزی کی عادت جو [illegible] مرحوم کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی در اصل مادری تربیت کا نتیجہ تھی۔

مکتب جیسا کہ شرفائے اہل اسلام میں عام دستور ہے مولانا کی تعلیم چار برس چار ماہ کی عمر میں شروع ہوئی۔ شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم نے رواج قدیم کے مطابق بڑے دھوم دھام سے ان کا مکتب کیا۔ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مکان پر پڑھیں۔ اسی زمانہ میں مولوی حکیم عبداللہ صاحب مرحوم جو بندول کے ہم سرحد موضع جیراجپور کے رہنے والے تھے مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی مرحوم سے سند فراغ لے کر آئے تھے۔ شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور انھوں نے بھی قرب وطن کے خیال سے ملازمت قبول کر لی۔ چنانچہ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں انہیں بزرگ سے حاصل کی بعد ازاں کچھ دنوں تک مولوی شکر اللہ صاحب سے استفادہ کیا۔

اس کے بعد شیخ صاحب مرحوم نے اعظم گڑھ میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا جس میں اولاً تھوڑے عرصہ تک مولانا سخاوت علی مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم ساکن قصبہ مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ مدرس اعلیٰ تھے

مولانا نے قریب قریب درجہ فراغ تک اسی میں تعلیم پائی۔ یہ مدرسہ اعظم گڈھ کی موجودہ آبادی سے جانب مغرب قدیم تحصیل کی عمارت سے متصل واقع تھا۔ اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہ گئی ہے اور یہ کل حصہ مزروعہ ہوگیا ہے مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڈھ آتے اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے۔ اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر ہوتی تھی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ زبان قلم اس کی صحیح مصوری سے عاجز ہے۔ ایک مرتبہ مرتب اوراق بھی ساتھ تھا۔ شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ۔ سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے۔ بہار کا ولولہ انگیز موسم شام کا سہانا وقت، کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول، ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لئے باغ باغ ہوجاتا مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعتہً ایک کھیت کی مینڈ پر رک گئے آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے۔ اور اپنے دلگداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے۔

جائیکہ بود آں دلستان در بوستاں با دوستاں شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ماہی را وطن

از فر یار خرگہی ایوان ہمی بیسنم تہی در قد آں سرو سہی خالی ہمی بیسنم چمن

بر جائے رطل و جام مے گوراں نہادستند پے بر جائے چنگ و نائے و نے آواز زاغ ست و زغن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا میری نگاہوں میں وہ سماں پھر رہا ہے جب اسی مقام پر مولانا فاروق مرحوم شرح مطالع کا درس دیا کرتے تھے۔ یا آج یہ عالم ہے کہ در و دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہے۔

قفانبک من ذکری حبیب و منزل

ضلع اعظم گڈھ کے شرقی حصہ میں ضلع غازیپور کی سرحد پر چریاکوٹ ایک قدیم آبادی ہے جو عہد شاہی میں پرگنہ کا صدر مقام تھا۔ اکبر کے عہد تک یہ راجپوتوں کی بستی تھی مگر بعد میں کچھ عالی نسب شیوخ بحیثیت قضاۃ و عمال سرکاری یہاں آباد ہوگئے جنکی نسل سے بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے۔ اور تقریباً کئی صدیوں تک یہ خطہ اہل علم کا مرکز رہا۔ ازاں جملہ مولانا علی عباس۔ مولانا عنایت رسول اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد فاروق دور آخر میں بڑے پائے کے علما رہے۔ سرسید مرحوم نے بنارس کے زمانہ قیام میں مولانا عنایت رسول صاحب

سے بہت کچھ علمی فیض حاصل کیا۔ مولانا محمد فاروق مرحوم ریاضی معقولات اور ادب میں اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ مولانائے ممدوح ابتداءً مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور میں مدرس اول تھے۔ ان کے حلقۂ درس کی شہرت سنکر دور دراز مقامات سے تشنہ کامان کمال غازیپور آتے اور چشمۂ رحمت سے سیراب ہوکر جاتے۔ مولانا شبلی کے لئے تو مختلف وجوہ سے غازیپور بمنزلہ وطن تھا۔ قرب مقامی کی بنا پر شیخ صاحب نے بھی اجازت دیدی اور مولانا کچھ دنوں کے لئے غازیپور گئے۔ یہاں دریائے گنگا کے کنارہ پر شرفائے قدیم کا ایک محلہ ہے۔ جو اسی نسبت سے میاں پورہ کہلاتا ہے۔ اس محلہ کے غربی حصہ میں نہایت دلکش منظر پر عین لب دریا مولانا شاہ محمد جنید مرحوم کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔ اس سے ملحق ایک مکان تھا جس کے ایک کمرہ میں مولانا شبلی مرحوم زمانہ طالب علمی میں قیام کرتے تھے۔

کمالات علمی کے علاوہ فارسی عربی اور شاعری کا ذوق مولانا فاروق کا خاندانی جوہر تھا۔ اور علامہ مرحوم بھی فطری شاعر تھے۔ اس اتحاد مذاق نے متعلم و معلم کے ربط معنوی کو اور قوی کر دیا۔ اور بالآخر شاگرد کی کشش خود استاد کو اعظم گڈھ کھینچ لائی۔

اے ذوق تشنگی میں ترے جذب کے نثار

آتے ہیں خود وہ ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ اور مولانا فاروق کا سا متبحر استاذ فیض تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ چند ہی دنوں میں یہ جوہر قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئیں اور یہ ہونہار شاگرد استاذ کے لئے مایۂ ناز بن گیا۔ چنانچہ مولانا فاروق اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے۔ انا اسد وانت شبلی

علامہ مرحوم نے سیاست کی تکمیل اگرچہ مولانا فاروق ہی سے کرلی تھی اور باعتبار استعداد علمی اپنا حریف نہ رکھتے تھے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ علم کی پیاس بجھتی نہیں۔ یہ بادۂ کہن تو جتنا پئے جائیے اتنی ہی پیاس بڑھتی ہے اور خود اس تشنگی میں وہ مزا آتا ہے کہ ہزار سیرابیاں اس پر نثار۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ

حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا، مولانا
والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ علاوہ بریں وہ بلا ضرورت شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا
پسند نہ کرتے تھے مگر مولانا کی والدہ جو بہت روشن خیال بزرگ تھیں مولانا کی بیتابیِ شوق کو ناکام دیکھنا کب
ند کرتیں۔ انھیں کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولانا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کی دلچسپیوں
خیر باد کہا۔

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا زیادہ تر مشاہیر علما اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت
ے رہتے تھے۔ یہی آستانے اس عہد کی یونیورسٹیاں تھیں۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے دم سے بہارِ علم
زہ تھی۔ سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث اور دیوبند میں مولانا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز
وم کا سلسلہ فیض جاری تھا۔ بھوپال میں رئیس العلما، نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم اور رامپور میں خلد آشیان
ب کلب علی خاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دیے تھے۔ راقم نے خود استاذ مرحوم کی
نی سنا ہے کہ اول اول ان کو مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی۔ مگر علامہ مرحوم کچھ تو
ی جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی
ہر کی تلاش کرتی۔ اس لیے زانوئے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے اور رامپور کا رخ کیا۔
ں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ معقولات میں مولانا عبدالحیٔ خیرآبادی
فقہ میں مولانا ارشاد حسین۔ ابتداءً مولانا کی خواہش ہوئی کہ دونوں سے استفادہ کریں مگر ان بزرگواروں میں
اصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا۔ مجبوراً
لانا کو انتخاب کرنا پڑا۔

معقولات میں مولانا فاروق کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی
یا اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی۔ اس لیے یک در گیر و محکم گیر کے اصول پر صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف

تلمذ پراکتفا کی۔ علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا۔ اور اکثر بسبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔ مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے۔ اور علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا۔ غالب یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو۔ کیونکہ یہی مذہبی عصبیت تھی جو نعمانی تخلص اختیار کرنے کا باعث ہوئی تھی فارسی شاعری سے مولانا کو طبعی ذوق تھا۔ شعرائے فارس کے تخلص میں بالعموم یائے نسبتی گویا ایک ضروری جزو ہے۔ مثلاً رودکی حضری، فردوسی، نظامی، فرخی، سعدی، عرفی، نظیری، فیضی وغیرہ۔ مشکل سے چند مستثنیات مثلاً ہمکر، خاجو، سلمان، خسرو، یائے نسبتی سے خالی ملیں گے۔ متاخرین شعرائے ہند نے تو اس رواج کا عام تتبع اس حد تک کیا کہ اردو کا تخلص ہوتے ہوئے بھی فارسی شاعری کے لئے علیحدہ تخلص اختیار کیا مثلاً نواب مصطفٰے خان مرحوم شیفتہ فارسی شاعری میں حسرتی نظر آتے ہیں اور حضرت بیان میرٹھی یزدانی تخلص فرماتے ہیں۔ مولانا بھی اسی انداز کا ایک تخلص اختیار کرنا چاہتے تھے اور شرط یہ تھی کہ خاقانی و قاآنی کی طرح مترنم و پرشکوہ ہو۔ اچھوتا ہو۔ اور بلحاظ واقعہ بھی صحیح ہو۔ خوش قسمتی سے "نعمانی" ان تمام شرائط کا جامع تھا۔ سب سے بڑی خوبی اس تخلص میں یہ تھی کہ مولانا کے جذبات مذہبی کا آئینہ دار تھا۔ اور اپنے مترادف لفظ حنفی سے زیادہ صحیح اور زیادہ پرشوکت تھا۔ بعض حضرات کو اس لفظ سے دھوکا ہوتا ہے کہ شاید مولانا نے باعتبار نسب یہ تخلص اختیار کیا ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ نعمان کسی مقام کا نام ہے، جس کی طرف یہ نسبت ہے۔ لیکن مولانائے مرحوم کو قدرت نے نسل و وطن کے ادنیٰ جذبات سے بہت بلند فطرت عطا کی تھی۔

آرے نہ بود وصف اضافی ہنر ذات
ایں فتوئے ہمت بود ارباب ہمم را

قصہ کوتاہ کچھ دنوں تک مولانا ارشاد حسین کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کے بعد مولانا مرحوم وطن آئے۔

مگر حصول کمال کی بیتابانہ تمنا نے اب بھی چین لینے نہ دیا۔ اس زمانہ میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے کئی صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو۔ تشنگی طلب نے اس چشمہ فیض سے بھی شادکام ہونا چاہا۔ اور سفر پنجاب کیلئے کمربستہ ہوگئے۔ اولاً مولانا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے مگر آخرکار مولانا کے عزم و استقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی۔ اور صرف پچیس روپیہ زاد راہ کے لئے لیکر عازم لاہور ہوگئے۔ عربی کے طالب علم سہی۔ مگر مولانا نے بچپن سے دولت و فراغ بالی کے آغوش میں تربیت پائی تھی۔ فطری خودداری کے سمند ناز پر تنعم کا سایہ دامن تازیانے سے کم نہ تھا۔ جاگیر کی روٹیوں کو من و سلویٰ سمجھنا، یا خانہ خدا میں ناخواندہ مہمان بنکر مقیم ہونا ان کی غیور طبیعت کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سرسید علیہ الرحمۃ نے تعلیم جدید کا صور پھونک کر اسلامی ہند میں ایک حشر انقلاب برپا کردیا تھا۔ سرسید علیہ الرحمۃ عرصہ تک بنارس میں بہ حیثیت سب جج مقیم تھے۔ اور قرب مقامی کیوجہ سے اعظم گڈھ دغازیپور میں بھی کئی لکچر دئے تھے۔ شیخ محمد کریم صاحب، جو شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے معاصر منشی محمد اکرام صاحب وکیل مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے، علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر اور سرسید کے رفقائے کار میں تھے۔ ان حالات میں نہ صرف شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم بلکہ اعظم گڈھ کے تمام سربرآوردہ اشخاص جدید تحریک سے اتنا متاثر تھے کہ قدیم عربی تعلیم کو نہ صرف ضیاع وقت و مال بلکہ ایک حد تک مضرت رساں سمجھنے لگے تھے۔

پہلے تو اسی عربی تعلیم سے بڑی بڑی ملازمتیں ملتی تھیں۔ مثلاً ہمارے ہی ضلع میں مولوی صاحب علی خانصاحب مرحوم لفٹنٹ گورنر کے "میر منشی" یا پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ مولوی شاہ راحت علی قلندرپوری مرحوم سب جج، مولوی سخاوت علی دیالپوری مرحوم منصف اور خود مولانا فاروق مرحوم کے خسر اور شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے مرشد مولانا شاہ محمد کامل صاحب ولیدپوری بھی منصف تھے۔ مگر اب اعلیٰ سرکاری عہدوں کا دروازہ خالص عربی دانوں کے لئے تقریباً بند ہوچکا تھا۔ البتہ امتحان وکالت کے لئے ابھی تک انگریزی کی

شرط نہ تھی یہ حالات تھے جن کی بنا پر شیخ صاحب مرحوم مولانا کے شوق تحصیل کو اب زیادہ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے ان کی رائے میں اس بیکار دوا دوش سے بہتر تھا کہ وکالت کی طیاری کریں۔

مولانا کے لئے شیخ صاحب کے خیالات میں یہ جدید تغیر سخت سوہان روح کا باعث تھا۔ خیال فرمائیے وہی شیخ صاحب جو چند سال پیشتر اسی بیٹے کی تعلیم کے لئے ایک مستقل مدرسہ کے مصارف بخوشی برداشت کرتے ہیں اور جو آج بھی ایک محض مسٹر مہدی مرحوم کی تعلیم پر صدہا روپیہ سے لیکر ہزار روپیہ ماہوار تک صرف کرنے کے لئے طیار ہیں اپنے سب سے بڑے فرزند اور اس سعادتمند فرزند کو جو آگے چلکر نہ صرف اپنے اسلاف بلکہ کل ہندوستان کے لئے مایہ ناز ہونے والا ہے۔ لاہور کے دور دراز سفر کے لئے صرف پچیس روپئے دیتے ہیں اور پورے دو مہینہ تک پھر کوئی خبر نہیں لیتے۔ غیور بیٹا بمشکل انھیں چند سکہ ہائے سیم پر قناعت کرکے دو مہینے گذار دیتا ہے۔ اور انتہائی مجبوری پر بالآخر باپ کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ داستان خود مولانا کی زبان سے سنئے۔ مولانا اپنے ایک خط میں جو شیخ صاحب مرحوم کو بھیجا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مرا دو ماہ می گذرد کہ ترک وطن کردہ ام و بہ بیگانگاں بسر بردہ ام بست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود سہ روپیہ بکرایہ یکہ از اعظم گڈھ تا جونپور رفت۔ ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارنپور شدہ بود پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور۔ دہ روپیہ باقی می ماند۔ اول کہ دریں جا رسیدیم دو یک روپیہ بہ حوائج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد

مکانے بکرایہ یک روپیہ گرفتم۔ دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود۔ انچہ باقی می ماند بصرف طعام آمد۔ اگر انصاف رود بہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از و متصور نیست۔ چوں مزاج عالی اند کے برہمی داشت از تکلیف ارسال صرف باز ماندم اکنوں بکار مشکل افتادہ است دیگر چہ گویم۔

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دلدادگان کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ ہمارے اسلاف

شغف موجودہ دور کے لئے کس حد تک قابل رشک تھا۔

مولانا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے اس لئے زیادہ وقت وہیں صرف ہوجاتا، بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا
متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کررہے تھے جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور ہر ایک کے
ت مقرر تھے۔ اس ماحول میں اگر کوئی دوسرا استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس
سے یقیناً انکار کرتا اور مولانا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو بعض وقتوں
امنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ مگر ایک طرف تو مولانا
کا عزم راسخ بے نیل مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسری جانب مولٰینا فیض الحسن
وق افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالبعلم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج
کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے، اسی میں مولانا ادبیات کا درس دیا کریں اور
ب و ذہاب میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اٹھے وہ افادہ و استفادہ علم سے خالی نہ ہو۔

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو باز م نداشت
دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

ذوق طلب کی یہی وارفتگی ہے جو منزل کمال تک رہبری کرتی ہے اور ایسے ہی طلبہ ہوتے ہیں
ن کے راستے میں رحمت الٰہی کے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔

مولانا کے لئے لاہور کا یہ چند روزہ قیام بہت کچھ مثمر سعادت ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولانا
عربی علم ادب کا صحیح مذاق حد کمال کو پہنچایا۔ مولانا فاروق مرحوم معنی آفرینی کے دلدادہ تھے اور
متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبی ہے، شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا
ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا۔ مگر لاہور میں آئے تو دنیا بدل گئی۔ شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں
بی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور رفتہ رفتہ زبان دل میں اتر گئی۔ یہانتک کہ مولانا نے حماسہ

حفظ کرڈالا اور آخر عمر تک بلاناغہ ہمیشہ کی تلاوت کے بعد حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے کہ جب اور اق علی گڈھ میں حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہتا تھا۔ علی گڈھ کے محلہ بالائی قلعہ میں مولوی محمد عثمان صاحب اسرائیلی کا ایک مکان کرایہ پر لیا گیا تھا جس میں ہم لوگ قیام پذیر تھے۔ علامہ مرحوم لاہور، امرتسر اور پٹیالہ سے ہوتے ہوئے علی گڈھ تشریف لائے۔ مولانا حمید الدین چونکہ علامہ مرحوم کے ماموں زاد بھائی اور مایہ ناز شاگرد تھے۔ علاوہ بریں مولانا کی حقیقی بھانجی ان سے بیاہی تھیں، جو اس زمانہ میں علی گڈھ میں تھیں، اس لئے علامہ مرحوم کی میزبانی کا شرف قدرتی طور پر مولانا حمید الدین ہی کو حاصل ہوا۔ مکان میں زیادہ وسعت نہ تھی، مجبوراً اسی کمرے میں استراحت فرمائی جس میں یہ ہیچمیرز رہا کرتا تھا۔

یہ اسباب تھے کہ اس خاکسار کو مولانا مرحوم کے وظائف سحری بچشم خود دیکھنے کی غیر مترقبہ سعادت نصیب ہوئی۔ حسب عادت مستمرہ تقریباً تین بجے مولانا بیدار ہوگئے۔ خادم کو آواز دی اور خود لیٹے لیٹے حماسہ کے اشعار گنگناتے رہے۔ تھوڑی دیر میں خادم پانی اور آفتابہ لایا۔ وضو کیا۔ چائے پی اور تھوڑی دیر تک مختلف مقامات سے آیات قرآنی کو خالص عربی لہجہ میں تلاوت کیا یہانتک کہ صبح صادق نمودار ہوگئی اب مولانا نے بیٹھے بیٹھے نماز فجر ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو پھر حماسہ کے اشعار کا دور چلا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا فیض الحسن کے قلیل المدت درس کا نقش علامہ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ استاد مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولانا فیض الحسن کے ساتھ مخصوص شیفتگی تھی۔ مولانا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اس مرثیہ میں صاف طور پر نمایاں ہے۔ جو مولانا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالم تاثر میں لکھا ہے۔ اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

دریں آشوب غم ہمدم بیا گر نالہ زن گریم	جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند نفسے ہی مرا ناصح	دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم

علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد | ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
خود بہر ہم گشتن بزم ہنر نالم | گہے بے خویشتن بر روز سیاہ علم و فن گریم

آگے چلکر دوسرے بند میں فرماتے ہیں

تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید | عرب را زندہ کردن و آنکہ از ہندوستاں بودن
دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن | بہ آہنگ حجازی یادگار پاستان بودن

باقی

تفسیر سورۃ الفیل (عربی)

اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصلی حقیقت اس کتاب
عت سے پہلے بالکل مجہول تھی جس سے سورہ کی تفسیر میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی
مولانا نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب
۔ واقعہ طیر کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق
شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصلی حقیقت آشکارا کردی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمار
کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

و طباعت و کاغذ بہترین۔ قیمت :- ۸/

مینیجر

ادبیات

غزل

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ

باز خواہیم کہ روی دل و جاں تازہ کنیم — دشنہ گیریم و ہمہ زخم نہاں تازہ کنیم

زاں گردہیم کہ پژمردہ نباشند ازاں — چہرہ از دیدۂ خونابہ فشاں تازہ کنیم

بادہ پیمائی این بزم بسی شد بیکرہ — زہر آرید کہ ما نیز دہاں تازہ کنیم

آں پریچہرہ بیارید کہ از مہروے — برخش دیدہ کشائیم و رواں تازہ کنیم

باتو خواہیم کہ پنہاں بنشینیم امشب — مردماں را دگر آزارگماں تازہ کنیم

آنشیں روئے تو بینیم و نمازی ببریم — روش ہیربد و کیش مغاں تازہ کنیم

جامہائے دری از گفت فراہی خوانیم
تا بدیں زمزمہ آں کہنہ زباں تازہ کنیم

تلخیصات

آزاد ملکوں کی آزاد تعلیم

جرمن یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ کی خود مختاری

انگریزی معاصر انڈین ریویو نے جرمن یونیورسٹیوں کے متعلق ایک دلچسپ اور مفید مضمون شائع کیا ہے۔ اس کے بعض دلچسپ اقتباسات قابل مطالعہ ہیں۔

جو لوگ جرمن یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کو سمجھنا چاہیں، ان کو پہلے ان حالات و انقلابات کو معلوم کرنا ہوگا جن کے اندر سے ہو کر ان یونیورسٹیوں کو گزرنا پڑا ہے۔ گذشتہ زمانوں میں ان یونیورسٹیوں میں پیشوں کی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں یہ خیال غالب رہا کہ طلبہ میں شخصیت کا احساس پیدا کیا جائے اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ مذہبی تعلیم کی ایک لہر اٹھی اور وہ تمام خیالات و نظریات پر بالکل چھا گئی۔ اب موجودہ دور میں ایک خاص سیاسی تخیل "ہٹلرزم" کا غلبہ ہے اور جرمنی کا پورا نظام تعلیم اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی، جرمن میں کالج کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ مقولہ کہ "تعلیم اور تعلم کو آزاد ہونا چاہیئے" جرمن دماغ میں پوری طرح راسخ ہے۔ ایک جرمن یونیورسٹی اپنے حدود کے اندر پوری طرح خود مختار ہوتی ہے۔ اس آزاد نظام کا افسر اعلیٰ ریکٹر ہوتا ہے جو ہر سال پروفیسروں کے اندر سے چنا جاتا ہے۔ اس کی امداد اور رہنمائی کے لئے ایک "سینیٹ" یعنی پروفیسروں کی ایک مختصر مجلس ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے تمام شعبے اپنے اپنے حدود کے اندر تعلیم اور امتحان کے معاملات

یں پوری طرح ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہر شعبہ کا افسر اعلیٰ ڈین (Dean) کہلاتا ہے اور اس کا بھی سالانہ انتخاب ہوتا ہے۔ حکومت یونیورسٹیوں کے اندرونی معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتی۔ اس کی مداخلت صرف نظم اور ضابطہ کی حفاظت تک ہے۔ اس کے علاوہ معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

پروفیسروں کو ان کے کاموں میں پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضمون اور اپنے طریقہ تحقیقات کے انتخاب میں بالکل خودمختار ہوتے ہیں۔ کوئی طاقت اس معاملہ میں انکی آزادی میں مداخلت نہیں کرسکتی۔ وہ بے روک ٹوک اپنی تحقیقات کے نتائج اور خیالات زبانی اور تحریری لوگوں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ پروفیسروں کا انتخاب ہر شعبہ کے اراکین بہترین امیدواروں میں سے کرتے ہیں۔

جرمن یونیورسٹیوں کے اصلی مقصد کی بہترین ترجمانی مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

"یونیورسٹیوں کا اصلی کام تعلیم اور تحقیقات کے ذریعہ علم کو ترقی دینا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کو ملک کی تمام بنیادی طاقتوں سے نہایت قریبی تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ وہ طلبہ کو اعلیٰ پبلک خدمات کے مختلف شعبوں میں داخل کرنے کے لئے تیار کرتی ہیں استادوں اور طلبہ کی ایک ایسی جماعت کی حیثیت سے جن کو صداقت اور محبت کے رشتہ نے باہم گرجوڑ رکھا ہے، ان کا اصلی مقصد طلبہ کے اخلاق کی اصلاح اور ان کو نظم اور اجتماع کے اندر رہکر کام کرنے کی تعلیم دینا ہے تاکہ ملک کی قومی اور تمدنی خدمت انجام پاسکے۔ ہٹلر کے دور میں بھی یونیورسٹیوں کا مقصد طلبہ کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ ملک کا مہذب شہری بنانا ہے۔"

تعلیم اور تعلّم دونوں کی کامل آزادی جرمن یونیورسٹیوں کی اصلی خصوصیت ہے۔ ہر طالب علم بہت حد تک اپنے لئے مضامین تعلیم اور عنوانات نصاب کا خود ہی انتخاب کرتا ہے۔

ی حاضری کوئی لازمی چیز نہیں ہے اور جس طرح ہندوستان میں اس کے لئے اہتمام ہوتا ہے جرمنی میں ذ اہتمام
ہیں خیال کیا جاتا۔ طالب علم یونیورسٹی کی زندگی کے تمام شعبوں میں پابندیوں اور قیدوں سے بالکل آزاد
، اور اس کو ایک خودمختار محقق کی طرح کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے
، وہ اپنے اندر اپنے آپ کو ضابطہ کے اندر رکھنے کی پوری صلاحیت پیدا کرے اور آزادی و خودمختاری کے
سولوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جو اس کو زیادہ سے زیادہ خود اعتمادی کی زندگی بسر کرنے کے قابل
ں۔ یہ امر کہ طالب العلم کتنا وقت مطالعہ میں صرف کرے اور کتنا وقت اپنی پسند کے دوسرے مشاغل
ں کرے بالکل طالب العلم کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ہر ٹرم کے ختم ہونے پر طالب علم کو اختیار ہے کہ وہ ایک
سٹی کو چھوڑ کر دوسری یونیورسٹی میں اپنا داخلہ کرالے۔ یہ بات بیرونی طلبہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ نہایت
ہے۔ وہ تھوڑی مدت میں ہر یونیورسٹی کے طریق کار اور اپنے موضوع کے متعلق تحقیق و تفتیش کے مختلف
ب اور مختلف حلقوں کے مختلف نقطہائے نظر سے نہایت آسانی سے واقف ہو سکتے ہیں۔

طالب العلم اپنے زمانہ تعلیم میں اپنے چال چلن کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔ اقامتی نظام صرف بعض ہی
رسٹیوں میں ہے۔ عموماً طلبہ یونیورسٹیوں سے باہر رہتے ہیں۔ اس لئے طلبہ کے معاشرتی اخلاق پر
رسٹی براہ راست اثر انداز نہیں ہوتی۔ طلبہ کی بہت سی انجمنیں البتہ قائم ہیں اور عموماً وہ ادب اور
ت اور ورزش کے مختلف مذاہب کی ترجمانی کر رہی ہیں اور ہر طالب العلم کو اس امر کا پورا موقع
ل ہوتا ہے کہ ان مختلف انجمنوں میں سے جس انجمن کو اپنے مذاق و رجحان کے مطابق پائے اس کے
تھ شامل ہو جائے۔

علاوہ ازیں جرمنی میں طلبہ کی مختلف برادریاں بھی ہیں جو اپنے اپنے دائرہ کے اندر نہایت
بوط نظام اور یکجہتی و رفاقت کا نہایت قوی احساس قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان برادریوں کے اندر اجتماعی
گی ایک ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اور برادری کا ہر ممبر اس ضابطہ کا پابند ہوتا ہے۔ ان برادریوں سے

بعض کی عمر ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ ہے۔ جرمن طلبہ اور بیرونی طلبہ میں ارتباط کا ذریعہ زیادہ تر جرمن فارن اسٹوڈنٹ کلب تھا لیکن موجودہ حکومت نے اس کی آزادی کو بہت کچھ تدغن کر دیا ہے۔

آناں کہ غنی ترند محتاج ترند

شکسپیر نے کہا ہے کہ "جن سروں پر تاج ہے ان کو آرام کی نیند نصیب نہیں ہوتی"۔ یہ مقولہ ہر اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ اکثر بادشاہوں کی آمدنی ان کے مصارف اور ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ نے سابق بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کے لئے چار لاکھ پونڈ کی خطیر رقم اس غرض سے منظور کی تھی کہ ان کے اوپر جو قرض ہے اس کو ادا کر سکیں۔ بظاہر یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان بادشاہوں کے اخراجات کی تفصیل پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد یہ راز کھل جاتا ہے کہ درحقیقت آمدنیوں کی ان پھیلی ہوئی تفصیلات کے اندر خود ان کے جیب کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ بادشاہ جارج پنجم کے متعلق معلوم ہے کہ ان کے خاص جیب خرچ سے، تمام مصارف کے بعد، دو ہزار پاؤنڈ سے زیادہ کی رقم ان کو پس انداز نہیں ہوتی تھی۔

سابق بادشاہ اڈیورڈ ہشتم اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ ان کو خزانہ عامرہ سے خاص جیب خرچ کیلئے جو رقم ملتی تھی اس کے علاوہ ستر ہزار پونڈ کی مدنی ان کو کارنوال کی املاک سے ہوتی تھی۔ شاہی مصارف کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں ہے اسلئے ایک نظر اس پر ڈال لینی چاہیے۔

۱۲۵۰۰۰ پونڈ	قصر شاہی کے عہدہ داروں کی تنخواہ
۱۹۳۰۰۰ "	شاہی خاندان کے مخصوص مصارف
۲۰۰۰۰ "	شاہی محلوں کی حفاظت و مرمت کے لئے
۳۰۰۰ "	مخصوص بغرض حفاظت قصر بکنگھم

۱۳۰۰۰ پونڈ	شاہی عطایا کے لئے
۸۰۰۰ "	ناگہانی ضروریات کے لئے
۵۰۰۰ "	خدام کے لئے
۶۰۰۰ "	....
۵۰۰۰ "	شاہی موٹروں کے لئے

ان رقموں میں ایک لاکھ دس پونڈ کی وہ رقم شامل نہیں ہے جو بادشاہ کے لئے بالکل وص ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس کو صرف کرے۔ چنانچہ اس رقم میں سے وہ کھانے پینے سفروغیرہ کے مصارف میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک اچھی خاصی تعداد ان شاہی کے اعزار کی بھی ہے۔ یعنی تقریباً ڈیڑھ سو اشخاص ایسے ہیں جن کے تمام مصارف مہداری بادشاہ کے جیب خاص پر ہے۔

خاندان شاہی کی روایات میں یہ ہے کہ وہ اسپشل ٹرینوں میں سفر کریں اور اس کے تمام ارف اس رقم سے ادا کئے جائیں جو بادشاہ کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے سابق بادشاہ ورڈ ہشتم ہوائی جہاز کے سفر کو ترجیح دیتے تھے جس میں خاصی بچت تھی۔ وہ مصارف جن کا شاہی ب پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے اور جن سے کسی حال میں چھٹی نہیں۔ ڈاکٹروں کی فیسیں، ی دعوتیں، ارباب سیاست اور سلاطین کی ضیافتیں اور بعض دوسرے مصارف ہیں۔ ناہ جارج کا حال تو یہ تھا کہ وہ اکثر نہایت سخت مالی مشکلات میں پھنس جاتے تھے اور مالی دقتوں وجہ سے اپنے بہت سے ارادے ملتوی کر دیتے تھے۔ ان کی بیوی ہمیشہ مصارف کی کتر بیونت ، رہتی تھیں کہ کسی صورت سے قرض سے نجات رہے۔ تاہم ۱۹۲۱ء میں شاہی بجٹ میں ۵۳ ہزار ، کمی رہی ۱۹۲۸ء میں جب بادشاہ بیمار ہوئے تو اس بیماری کے مصارف نے ملکہ کو بالکل

پریشان کر دیا اور وہ مجبور ہوگئیں کہ بخالت کی حدتک کفایت شعاری اختیار کریں تاکہ ڈاکٹروں کی فیسیں اور دواؤں کی قیمت ادا کرسکیں۔

اگر ہم اس حال کا ماضی سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انگلستان کے موجودہ بادشاہ کو جیب خاص کے لئے جو رقم ملتی ہے وہ اس رقم کے مقابل میں بہت کم ہے جو اس ملک کے سابق سلاطین کو ملتی رہی ہے۔ آج بھی اٹلی کے بادشاہ کو آٹھ لاکھ پونڈ کی رقم جیب خاص کے لئے ملتی ہے اور بادشاہ ولیم کو بھی تقریباً اسی قدر ملتی تھی۔ اور سب سے زیادہ رقم روس کے بادشاہ کو ملتی تھی یعنی تقریباً ۴ میلین پونڈ سالانہ۔

افریقہ کے صحراؤں میں ایک نئی دنیا کی تعمیر

سائنس کی ہمت تسخیر ابھی صحراؤں کی طرف نہیں متوجہ ہوئی تھی لیکن اب جرمنی نے قدم آگے بڑھایا ہے کہ ان غیر مفتوح علاقوں کو بھی سائنس کے تصرف میں دیدے۔ اسوقت جرمنی کے سامنے دو اسکیمیں ہیں۔ ایک طرف تو وہ اپنی سابق نوآبادیات واپس لینا چاہتا ہے دوسری طرف افریقہ کے صحرائے اعظم کے اندر مصنوعی ندیاں جاری کرکے اس کو زرخیز و شاداب بنا دینا چاہتا ہے۔

اس اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ نہر کانگو پر ایک بند جو ڈہائی میل لمبا ہوگا، باندھکر اس کثیر بارش کا تمام پانی روک دیا جائے گا جو اس علاقہ میں ہوتی ہے۔ اور اسکا رخ نہر کانگو کے بہاؤ کی طرف پھیر دیا جائیگا۔ یہ نہر ایک زمانہ میں ایک وسیع اور گہرے بحیرہ کی شکل میں تھی۔ اب پھر کوشش کی جائیگی کہ اپنی قدیم حیثیت دوبارہ حاصل کرکے اور ۳۵۰۰۰۰ میل مربع تک پھیل جائے۔ لیکن بایں ہمہ اس علاقہ کی غیر منقطع بارش کے تمام پانی کے جمع کرنیکے لئے یہ وسعت بھی کافی نہ ہوگی اسلئے بقیہ پانی بحیرہ شاد کیطرف پھیر دیا جائیگا اور اسکو وسیع کرکے اول الذکر کے برابر کر دیا جائیگا پھر بحیرہ شاد کو نیل ثانی کے ذریعہ بحر ابیض متوسط سے ملا دیا جائے گا۔

تفسیر سورہ تحریم:۔ یہ کتاب بغایت اہم مباحث پر
مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے ازواج مطہرات نبوؐ
کے متعلق تمام الزامات کی بدلائل تردید کی ہے۔ شان
نزول کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں ہیں۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۃ المرسلات:۔ اسمیں سورہ کی ترجیحات
اور ضمناً قرآن کی تمام ترجیعات کے متعلق نہایت اہم نکتے
بیان کئے گئے ہیں۔ ہواؤں کے تصرفات سے معاد پر استشہاد
کے چند نئے پہلو نہایت دقیق ہیں۔ قیمت

تفسیر سورہ عبس:۔ اسمیں انبیاء کے خلق عظیم انکی عصمت
اور ان کے مواقع عتاب کے متعلق نہایت اہم مباحث ہیں۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورہ الشمس:۔ شمس و قمر وغیرہ سے قرآن کے عام اسلوب
استدلال کی توضیح کی گئی ہے۔ سورہ کے غیبی اشارات اور
انکے وقوع کی تفصیلات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ "لا یخاف
عقباہا" کی تفسیر خاص موہبت ربانی ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورہ والتین:۔ اسمیں تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین
سے وجوہ استشہاد اور انکی تحقیق کے متعلق مصنف نے جو کچھ لکھا
وہ تحقیق اور وسعت نظر کا اعجاز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۂ الکوثر:۔ کوثر کی حقیقت کے متعلق اس قدر مفصل لکھا ہے
کہ بحث کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ نماز اور قربانی کی
حقیقت معہ نکتہ ہائے نظم کی تفصیل طویل اور نہایت بصیرت
افروز ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۃ الکافرون:۔ اسمیں بعثت کی غایت اور ہجرت
کے نتائج کے متعلق ایسے نکتے بیان ہوئے ہیں جنکا سمجھنا
قرآن کے بعض نہایت اہم حصوں کے سمجھنے کے لئے نہایت
ضروری ہے۔ قیمت ۴ر

تفسیر سورۃ الفیل:۔ اسکا اردو ترجمہ الاصلاح میں شائع ہوا ہے
جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکیگا۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۃ اللہب:۔ اسمیں اس عام خیال کی مدلل تردید
کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اسکی بیوی کے دعوے
ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ قیمت ۴ر

الرای الصحیح فی من ہو الذبیح:۔ اسمیں اہل کتاب کے دعوی کے
خلاف قرآن اور تورات کے نہایت محکم دلائل سے حضرت اسمٰعیلؑ
کا ذبیح ہونا ثابت کیا ہے۔ قیمت ۱۰ر

امعان فی اقسام القرآن:۔ اسمیں ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کی قسمیں استدلال
و شہادت کیلئے ہیں۔ قیمت ۸ر

تفسیر سورۃ اخلاص:۔ سورۃ اخلاص کی تفسیر عربی زبان میں ہے۔ قیمت
اسباق النحو حصہ اول و دوم:۔ اردو زبان میں عربی صرف و نحو
کے بہترین رسالے۔ قیمت حصہ اول ۸ر حصہ دوم ۴ر
دیوان حمید ۴ر، خرد نامہ ۸ر، تحفۃ الاعراب ۲ر

ان کتابوں کے علاوہ دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں بھی مکتبہ حمیدیہ کے ذریعہ طلب کی جاسکتی ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر مکتبہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

ٹرڈنمبر ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت واعانت، کتاب اللہ کی خدمت واعانت ہے۔ اسکی اعانت کی تین صورتیں ہیں

۱۔ جو حضرات سو روپیہ یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائینگے وہ دائرہ کے معاون دائمی متصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپیہ سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائیگا۔ اور سال بھر کی تمام مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات وقواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی ۵ تاریخ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھکر منگوا لیجئے ورنہ بعد میں بقیمت بھیجا جائیگا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے، اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط وکتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط وکتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔

عبدالاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

عبدالاحد طابع وناشر نے اصلاح پریس، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ میں چھاپکر شائع کیا۔